وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

اور جو رسول تمہیں دے تو وہ لے لو اور جس سے تم کو منع کریں تو اس سے باز آجاؤ (الحشر: ۷)

دوامِ حدیث

حجیتِ حدیث پر منفرد انداز میں لکھی گئی ایک تحقیقی کتاب

تالیف:

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ

تحقیق وتعلیق:

حافظ شاہد محمود

فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد دوم

UMM UL QURA

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

اور جو رسول تمہیں دے تو وہ لے لو اور جس سے تم کو منع کریں تو اس سے باز آجاؤ (الحشر: ۷)

دوام حدیث

حجیت حدیث پر منفرد انداز میں لکھی گئی ایک تحقیقی کتاب

تالیف:
محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

تحقیق و تعلیق:
حافظ شاہد محمود
فاضل مدینہ یونیورسٹی



جلد دوم

UMM UL QURA

نام کتاب

دوامِ حدیث

تالیف
محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

تحقیق و تعلیق
حافظ شاہد محمود فاضل مدینہ یونیورسٹی

ملنے کا پتہ

Pakistan
Umm-ul-Qura Islamic University
Commissioner Road,
Fattomand, Gujranwala
Ph: 0333-8110896
0321-6417723

Madinah
Zulfiker Ibrahim Al-Memoni Al-Atharee
Islamic University
P.O Box 10133, Madinah
Kingdom of Saudi Arabia
Mob: (00966) (0)553462757
Tel: (00966) (04) 8283701
www.madeenah.com

Coventry
Maktabah Ahlul Hadeeth
P.O Box 3070
Coventry CV6 5WL
England U.K
maktabah_ahlulhadeeth@hotmail.com

Coventry
Islamic Bookshop Coventry
801 Foleshill Road
Foleshill
Coventry CV6 5WL
England U.K.
Mob: (0044) (0) 7970070578
Tel: (0044) (0) 2476-725881

کمپوزنگ .... عبدالقدوس
طبع اول .... مارچ 2008ء
تعداد 1100
قیمت ....

ناشر: ام القریٰ پبلی کیشنز

0333-8110896, 0321-6417723

فہرس

دوسرا باب:

تدوین حدیث

تیسرا باب

چند عجیب راوی وصحابہ

چوتھا باب

أئمہ حدیث اور راویوں کے متعلق

پانچواں باب

حدیث پر ایک مکالمہ

چھٹا باب:

تحریف احادیث کے اسباب

ساتواں باب

"موطأ پر ایک نظر"

آٹھواں باب:

صحیح بخاری پر ایک نظر

دسواں باب:

''حدیث میں نماز کی صورت''

گیارھواں باب

بہترین عمل

بارھواں باب

"اللہ کی عبادت"

تیرھواں باب

لفظ "مغفرت" کی تحقیق

چودھواں باب

شفاعت

پندرھواں باب

''قرآن سے متصادم احادیث''

سترھواں باب

تقدیر

اٹھارھواں باب

متضاد احادیث

انیسواں باب

چند دلچسپ احادیث

مُقدّمہ

حضرت حافظ صاحب محدث گوندلوی رحمہ اللہ نے جب ''مقام حدیث'' کا جواب مکمل کیا، تو اسی کے متصل ''دوام حدیث'' کے عنوان سے ہی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی انکار حدیث پر مبنی کتاب ''دو اسلام'' کا جواب بھی ''ایک اسلام'' کے ذیلی عنوان سے مکمل کر دیا اور برق صاحب کے ان تمام مغالطات اور اعتراضات کا مکمل جواب دیا، جن سے متاثر ہو کر برق صاحب نے انکار حدیث کی راہ اختیار کی تھی۔

برق صاحب کی مذکورہ کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد کئی علماء کرام نے اس کو ہدف تنقید بنایا اور متعدد جوابات لکھے، جن میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں:

1. خالص اسلام، مولانا داؤد راز دھلوی رحمہ اللہ
2. صحیح اسلام، مولانا عبدالعزیز رحمانی
3. صیانۃ الحدیث، مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری
4. تفہیم اسلام، مسعود احمد بی ایس سی
5. صرف ایک اسلام، سرفراز احمد خان صفدر دیو بندی

حضرت حافظ صاحب نے بھی برق صاحب کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اپنی خداداد مجتہدانہ بصیرت سے کتاب میں مذکور تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا، جہاں جہاں مؤلف نے جادۂ حق سے انحراف کرتے ہوئے ٹھوکریں کھائی تھیں، ایسے تمام مقامات کی نشاندہی کی اور صحیح موقف کو اجاگر کیا۔

بعد ازاں برق صاحب نے مذکورہ علماء کی جوابی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے

بعد اپنے سابقہ عقیدہ سے رجوع کر لیا اور حدیث وسنت کو بھی اسلامی شریعت کا بنیادی ماخذ و مصدر تسلیم کر لیا، چنانچہ اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنی سابق غلطی کی تلافی کرتے ہوئے ''تاریخ حدیث'' کے نام سے دفاع و خدمت حدیث میں ایک کتاب بھی لکھی، تاکہ یہ کتاب ان کے اعتراف حق پر شاہد عدل بن جائے، مذکور کتاب کے مقدمے میں برق صاحب اپنے سابق موقف کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جولوگ اس موضوع پر میری پہلی تحریروں سے آشنا ہیں، وہ یقیناً یہ اعتراض کریں گے کہ میرا موجودہ موقف پہلے موقف سے متصادم ہو رہا ہے، ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ انسانی فکر ایک متحرک چیز ہے، جو کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں کرتی اور سدا خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے، جس دن فکر انسان کا یہ ارتقاء رک جائے گا علم کی تمام راہیں مسدود ہو جائے گی، کمال صرف رب ذوالجلال کا وصف ہے، وہ جو بات کہتا ہے، ازابتدا تا انتہا ہر لحاظ سے کامل ہوتی ہے اور کسی تغیر کو قطعاً گوارہ نہیں کرتی، لیکن انسان صداقت تک پہنچتے پہنچتے سو بار گرتا ہے، میں بھی سو بار گرا اور ہر بار لطف ایزدی نے میری دستگیری کی کہ اٹھا کر پھر ان راہوں پر ڈال دیا، جو صحیح سمت کو جا رہی تھیں۔'' (تاریخ حدیث: ۱۳)

برق صاحب کے اعتراف حق اور رجوع الی الحدیث کے باوجود ان کی کتاب ''دو اسلام'' مارکیٹ میں موجود ہے اور ناعاقبت اندیش ناشر اور تاجر حضرات اس کتاب کے ذریعہ حدیث رسول کے خلاف مذموم پراپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ مزید برآں جن مغالطات اور فاسد آراء سے متاثر ہو کر برق صاحب نے ٹھوکر کھائی تھی، آج کل بھی عوام الناس کی صفوں میں ایسے ہی مغالطات کی نشر واشاعت ہو رہی ہے، جن کے مطالعہ سے بعض ناپختہ ذہنوں کے بھٹک جانے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی ضرورت کے پیش نظر حضرت حافظ صاحب کی زیر نظر تالیف کی افادیت

پہلے سے بڑھ گئی ہے، تاکہ جو لوگ بھی حدیث مصطفیٰ ﷺ کے خلاف مسموم فضا پیدا کرنے میں مصروف ہیں، ان کے لیے یہ کتاب تازیانہ عبرت بن سکے اور ایسے زہریلے اثرات سے متاثر قلوب واذہان کے لیے باعث ہدایت بن جائے۔

اسلوب تحقیق

کتاب کے اس حصہ میں بھی حصہ اول کی مانند تحقیقی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، یعنی:

1. آیات کی نشاندہی
2. احادیث کی تحقیق وتخریج
3. آثارِ صحابہ وتابعین وغیرہم کی تحقیق وتخریج
4. بعض مطالب کی حواشی میں مزید توضیح وتفصیل
5. حضرت حافظ صاحب نے کتاب میں جن مصادر ومراجع سے عبارات نقل کی تھیں یا ان کا حوالہ دیا تھا، اصل کتاب سے رجوع کر کے عبارات والفاظ کا تقابل کرنے کے حوالہ جات لکھ دیے گئے ہیں، مزید برآں بعض مقامات پر حضرت حافظ صاحب کے کلام کی تصویب وتائید میں متقدمین علماء کا کلام نقل کیا گیا ہے اور بسا اوقات حوالہ جات ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے
6. حضرت حافظ صاحب محدث گوندلوی رحمہ اللہ نے جن جن مقامات پر برق صاحب کی کتاب ''دو اسلام'' سے اقتباسات نقل کیے تھے، ایسے تمام مقامات پر برق صاحب کی مذکور کتاب مدنظر رکھتے ہوئے منقولہ عبارات کا تقابل واصلاح کی گئی ہے۔
7. بعض مقامات پر ایضاح مطالب کے لیے ذیلی عناوین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

شاهد محمود
١٦ صفر ١٤٢٩ھ
03338110896

دین میں حدیث نبوی کا مقام اور اس کی معجزانہ حفاظت

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر ﷾

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم، وبعد:

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ (الفتح: ٢٨)

''وہی عظیم ذات ہے، جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ ارسال فرمایا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، گواہی دینے والا اللہ ہی کافی ہے''۔

ابتداء عہد اسلام میں تو مسلمانوں کو پوری دنیا اور دنیا کے تمام اہل ادیان پر مادی وعسکری غلبہ بھی حاصل تھا، جہاں تک اسلام کے غلبہ کا تعلق ہے، تو تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی دنیا کی کوئی طاقت اسلام کی حقانیت وصداقت، اس کی براهین قاطعه اور بينات واضحه پر کبھی جزوی طور پر بھی غالب نہیں آسکی۔ اسلام کی دو اساسی دلیلیں ہیں:

الف: قرآن کریم، ب: صاحب قرآن، یعنی حضرت محمد ﷺ

دونوں معصوم عن الخطاء، مصئون عن التغير اور محفوظ بحفظ الله و رعايته ہیں، اس لئے مغلوبیت ان کی طبیعت اور مزاج میں شامل ہی نہیں ہے، ان سے ٹکرانے والا اپنا نقصان ہی کرے گا، وہ قطعاً نقصان پذیر یا زوال پذیر نہیں ہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿ وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الا حقاف:٣٢)

''اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہیں کرے گا، وہ زمین میں عاجز کرنے والا نہیں ہے اور نہ ہی اسکے (اللہ) کے سوا کوئی حمایتی ہوں گے، وہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

﴿وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ﴾ (سبأ: ٣٨)

''اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں میں یہ محنت کرتے ہیں کہ ہمیں ہرادیں، وہ عذاب میں گرفتار رہیں گے''۔

﴿وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾

(الحج: ٥١)

''اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں (بزعم خویش) ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی، وہ اہل جہنم ہیں''۔

دین کے دوسرے مرجع و دلیل رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا :

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾(المائدة : ٦٧)

''اے رسول ! جو وحی تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کی گئی ہے، وہ سب لوگوں کو پہنچا دو، اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا''۔

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾ (الحجر :٩٤، ٩٥)

”جو حکم تجھے دیا گیا ہے، اسے کھول کر بیان کر دو اور مشرکوں سے منہ موڑ لو، ہم مذاق کرنے والوں کے مقابلے میں تجھے کافی ہیں۔“

غلبہ اسلام کے حوالے سے مسلمانوں کو کبھی کسی قسم کی خفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، فرمایا:

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الأنعام:۱٤۹)

”کہہ دو! دلیل کامل اللہ ہی کے لئے ہے“۔

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

(الإسراء: ۸۱)

”اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا، یقیناً باطل نابود ہونے کے لئے ہی ہوتا ہے“۔

﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ﴾ (الأنبيآء:۱۸)

”بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر دے مارتے ہیں، تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے، تو وہ یکایک ناپید ہو جاتا ہے، اور جو باتیں تم بناتے ہو، اس میں تمہاری ہی بربادی ہے“۔

۱۔رسول اللہ پر ایمان حجیت حدیث وسنت پر ایمان کو مستلزم ہے.

جیسے اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی تقاضا اس کی نازل کردہ کتاب قرآن کریم پر ایمان ہے، کتاب اللہ پر ایمان کے بغیر اللہ پر ایمان کا کوئی مطلب نہیں، ویسے ہی حدیث رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے بغیر رسول اللہ ﷺ پر ایمان کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حدیث وسنت کی حجیت پر ایمان ایک اہم ترین دینی ضرورت ہے، اسکے بغیر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، یہ ایک ایسا واضح اور دوٹوک مسئلہ ہے، جس میں کسی بحث و جدل، تنازع اور توقف یا تردد کی گنجائش نہیں ہے، از اول تا آخر پوری امت مسلمہ کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ نے نبی

اور رسول ہونے کی حیثیت سے جو خبر دی ہے، اس میں آپ معصوم عن الخطاء ہیں، چونکہ اللہ نے آپ کو صادق قرار دیا ہے، تو اللہ کی اس تصدیق کا لازمی نتیجہ ہے کہ نبی ﷺ نے جو خبر بھی دی، وہ اس کے عین مطابق ہے، جو عند اللہ ہے، لہٰذا اسے قبول کرنا واجب ہے، فرمایا:

﴿وَ مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم: ۳۔۴)

''اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتے، وہ صرف وحی ہے، جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ﴾ (الحاقة: ٤٤، ٤٦)

''اور اگر وہ ہم پر اپنی طرف سے کوئی بات کہہ دیتے، تو ہم انہیں دائیں طرف سے پکڑ لیتے، پھر ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔''

رسول اکرم ﷺ امت کو تمسك بالسنة کا حکم دیتے تھے، اس کی مخالفت سے منع فرماتے اور ڈراتے تھے، صحابہ کرام آپ ﷺ کے جملہ احکام کی تعمیل کرتے، آپ ﷺ کے افعال، اقوال اور تقریرات کی متابعت کرتے تھے، نزول وحی کے زمانے میں فرمان نبوی اور عمل صحابہ کی اللہ کی طرف سے تائید و تقریر وحی منزّل کی حیثیت ہی رکھتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران: ۳۱)

''کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔''

خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔" (متفق علیه)

"جس شخص نے میری سنت سے بے رغبتی اختیار کی، سو وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

اللہ نے اپنے رسول پر ایمان کا واضح حکم دیا اور اس کی اطاعت تمام اہل جہاں پر فرض قرار دی، کیا اس کا لازمی تقاضا نہیں ہے کہ آپ ﷺ معصوم ہیں اور دین و شریعت کے باب میں جو کچھ بھی آپ ﷺ کرتے اور کہتے ہیں، وہ ہمیشہ کے لیے حجت اور دلیل ہے، جس کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے، فرمایا:

﴿فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَ رَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (التغابن: ۸)

"سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر بھی اور اس نور پر بھی جو ہم نے نازل کیا اور اللہ اس سے خوب خبردار ہے، جو عمل تم کرتے ہو۔"

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ أَنْتُمْ تَسْمَعُونَ﴾ (الأنفال: ۲۰)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو، جب کہ تم سن بھی رہے ہو۔"

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران: ۳۲)

"کہہ دیجیے! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں، تو یقیناً اللہ کافروں کو پسند نہیں فرماتے۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ." (متفق علیه)

''جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

یہ حدیث ایک طرف ایسی شخصیت کا فرمان ہے، جو معصوم عن الخطاء نبی اور رسول ہے، نبوت ورسالت کے باب میں جس کی ہر خبر علم الٰہی کے عین مطابق ہوتی ہے، دوسری طرف یہ کوئی نئی بات بھی نہیں، بلکہ قرآن کریم میں مذکور اللہ تعالی کے ارشادات کا خلاصہ اور ترجمہ ہی ہے، جن کا اوپر ذکر ہوا۔

یہ قرآن کریم کی واضح اور صریح نصوص ہیں، ایسی تصریحات قرآن کریم میں ان کے علاوہ بھی بے شمار ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واتباع کا تقاضا کرتی ہیں، اور آپ ﷺ کی ذات گرامی کو بحیثیت نبی اور رسول مطاع اور متبوع قرار دیتی ہیں، ان میں سے کسی ایک آیت میں بھی یہ شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کسی خاص زمانے تک محدود تھی، یا اس کا تعلق صرف عہد نبوی اور حیات طیبہ سے تھا، یا یہ اطاعت صرف احکام قرآن پر مقصود تھی، یا آپ ﷺ کے ارشادات کی کوئی خاص قسم واجب الطاعۃ تھی، کتاب وسنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی، جو آپ ﷺ کی اطاعت واتباع کے عموم کی تخصیص پر دلالت کرتی ہو، اس لئے آپ ﷺ حیّا ومیّتا ہر عہد اور ہر زمانے کے لوگوں کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں ہر طبقے کے لیے واجب الاطاعت والاتباع ہیں، حدیث وسنت کی حجیت پر ایمان لائے اور اس پر عمل کیے بغیر مذکورہ آیات اور ان میں وارد احکام الٰہی پر ایمان اور عمل کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ جیسے قرآنِ کریم کی یہ آیاتِ بیّنات اپنے نزول سے لیکر ہمیشہ تک واجب الایمان والعمل ہیں، ویسے ہی رسول اللہ ﷺ کی حدیث وسنت پر عمل کے حکم میں دوام واستمرار ہے، جس میں کسی ادنی سی تبدیلی، تنسیخ اور ترمیم کا کسی کو اختیار نہیں، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ﴾. (الأحزاب: ٣٦)

"اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں، تو اس میں انہیں کوئی اپنا بھی اختیار ہو۔"

جب قرآن کریم کے تمام اصول وضوابط، تعلیمات وہدایات، اور اوامر ونواہی میں بالاتفاق دوام وثبات ہے، تو اطاعتِ رسول اور اتباعِ سنت نبوی کے قرآنی احکام کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس کی کوئی معقول دلیل نہیں، جس کا علم و عقل اور منطق کے میزان میں کوئی وزن ہو، بلکہ یہ صرف ایمان کی کمزوری اور سینہ زوری ہے، جسے چند سرکش انسانوں کی ھواؤہوس نے جنم دیا ہے، اور انہوں نے اپنی بے عقلی، نااہلی اور پراگندہ ذہنیت کے باعث باطنی افکار اور مستشرقین کی اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں معاندانہ تحقیقات کے زیر اثر رسول اللہ ﷺ کی شخصیت، آپ ﷺ کے مقام ومرتبے اور آپ ﷺ کی حدیث وسنت کے بارے میں ایسا تنازع کھڑا کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، جس سے امت کی وحدت پر بدترین اثرات مرتب ہوسکیں اور امت اپنے مرکزِ حقیقی سے کٹ کر پارہ پارہ ہوسکے، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ "مرکز ملت" اور امت کے اجتماعی شعور کے نام پر کیا گیا، لیکن دشمنان دین کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی کبھی مدھم نہیں پڑسکتی. إن شاء الله، اللہ کے وعدے سچے اور فیصلے اٹل ہیں، اللہ کا فرمان ہے:

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُولَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴾ (الصف: ٨-٩)

''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے چراغ ہدایت کو پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، خواہ کافر اسے ناپسند ہی کریں، وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا، تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے، خواہ مشرک اسے ناپسند ہی کریں۔''

حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ ''اہل قرآن'' کہلاتے ہیں، قرآنی تعلیمات کے علم بردار ہیں، قرآنی ہدایت کی نشر واشاعت کو اپنا مشن قرار دیتے ہیں، اس کے باوجود قرآن کریم کی اتنی ساری واضح اور صریح آیات پر انکی نظر ہی نہیں پڑتی! مگر قرآن کریم کی درج ذیل تصریح سے یہ حیرت واستعجاب خود بخود ختم ہو جاتے ہیں:

﴿ سَأَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴾ (الأعراف:١٤٦)

''جولوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، میں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا، اگر یہ لوگ ہر آیت کو دیکھ لیں، تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگر یہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں، تو اسے نہ اپنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھ لیں، تو اس راہ کو اختیار کر لیں، ایسا اس لیے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل ہیں۔''

حق وباطل میں التباس نہیں ہے۔

الوہیت، ربوبیت اور ہر نوع کی عبادت میں اللہ تعالیٰ وحدہٗ لا شریک لہ ہے۔ پورے قرآن کریم میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ملتا، جہاں نبی ﷺ کی اللہ کے

ساتھ عبادت میں شرکت کا ادنیٰ سا شبہ بھی پڑتا ہو، تو اگر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع فرض اور واجب نہیں ہے اور آپ ﷺ کی حدیث وسنت ہمیشہ کے لیے حجت اور دلیل نہیں ہے، تو ان بے شمار واضح اور صریح آیات اور ان میں مذکور اطاعت رسول ﷺ کے بار بار اصرار و تکرار حکم سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیا راہنمائی فرمانا چاہتے ہیں؟

قرآن کریم تو اللہ نے نازل ہی اس مقصد کے لیے فرمایا ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو کفر وضلالت کے اندھیروں سے نکال کر نورِ ہدایت سے نوازنا چاہتا ہے اور اپنے رسول ﷺ کے ذریعے ان پر جادۂ حق واضح کرنا چاہتا ہے، جو اس نے کردیا ہے، اس میں حق و باطل کے التباس اور شکوک وشبہات پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور قرآن کریم کو رسول اللہ ﷺ سے الگ کر کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے:

﴿كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ (إبراهيم: ١)

”یہ ایک کتاب ہے، جسے ہم نے تیری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تو لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے، غالب و قابل تعریف ذات کے راستے کی طرف۔“

لہٰذا بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اطاعت رسول سے فرار قرآن سے فرار ہے، حدیث وسنت کی حجیت اور اسکے دوام وثبات اور استمرار سے انکار قرآن حکیم کے معجزہ خالدہ ہونے کے انکار کے مترادف ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ٢٤)

”کیا یہ لوگ قرآن پر غور وفکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔“

۲۔ نبی ﷺ کی شخصیت اور منصب رسالت پر ایمان لازم وملزوم ہیں.

صفات باری تعالیٰ پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کی معتزلہ، جھمیہ اور فلاسفر کے میزان منطق و فلسفہ میں تو کوئی حیثیت ہوسکتی ہے، مگر وحیٔ الٰہی کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے ہاں میزان عدل میں اس نوعیت کے خود ساختہ ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، زبانی دعویٰ ایمان کو اللہ کے ہاں قبولیت حاصل نہیں ہوتی، فرمایا:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَاهُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ﴾

(البقرۃ :۸)

''اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آئے ہیں، حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔''

بالکل ایسے ہی خاتم الأنبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ایمان آپ ﷺ کے منصب نبوت و رسالت اور اس کے تقاضوں پر ایمان کے بغیر دین و شریعت کے نقطۂ نظر سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس قسم کے دعویٰ ایمان سے منکرین حدیث و سنت کے شوقِ آوارگی، شریعت کی حدود و قیود سے آزادی اور آزاد خیال مغربی ثقافت کے دل دادہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں مقبولیت کے جذبہ کی تسکین تو ہوسکتی ہے، مگر اللہ رب العزت کے ہاں میزان عدل میں اس سے ایمان بالرسول کے تقاضے قطعاً پورے نہیں ہو سکتے، اسکے لیے تو آپ ﷺ کے مقام نبوت اور منصب رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اور آپ ﷺ کا یہ مقام و منصب تا قیام قیامت قائم ودائم ہے، ''دوام حدیث وسنت'' کا یہی معنیٰ ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ کا مقام و منصب اعلان نبوت سے آج تک امت مسلمہ میں متفق علیہ رہے ہیں، آپ ﷺ کی حدیث وسنت بھی بالا

تفاق حجت تسلیم کی جاتی رہی ہے،اس بارے میں مسلمانوں میں کبھی دورائے نہیں رہیں،اگر کہیں کوئی اختلاف نظر آئے گا،تو اس کی بنیاد درآمدی افکار پر ہوگی،البتہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو متنازعہ فیہ قرار دینے کے لیے یہودونصاری بعثتِ نبوی سے ہی مسلسل سعی لا حاصل میں مشغول ہیں،عہداول میں منافقین نے اور پھر منکرینِ حدیث اور ان کے ہم نوا نام نہاد اہل علم نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں اس یہودی فکر کو مسلمانوں میں رواج دینے کے لیے بڑی فدویانہ کوششیں کی ہیں،مگران کی ان ایمان سوز مساعی رذیلہ کی یہودونصاری کے ہاں ہی کوئی قدرو قیمت ہو تو ہو،مسلمانوں نے اسے کبھی تسلیم نہیں کیا،جیسے آپ ﷺ کی ذات گرامی مسلمہ شخصیت ہے،ویسے ہی آپ ﷺ کا مقام ومنصب، نبوت ورسالت اور آپ ﷺ کی حدیث وسنت بالاتفاق دین وشریعت کا جزو لاینفک ہے۔رسول اکرم ﷺ نبی اور رسول بھی ہیں، شارح اور مفسر بھی ہیں،تشریع وتقنین کا حق بھی اللہ نے انہیں عطافرمایا ہے،اس لیے وہ مطاع اور متبوع بھی ہیں،حاکم اور قاضی بھی،بشیر ونذیر اور سراج منیر بھی،اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ بھی اور پوری انسانیت کے لیے اللہ کی طرف سے رحمۃ للعالمین بھی،اور آپ ﷺ کے ان تمام مقامات ومراتب کے لیے قرآن حکیم حجت قاطع اور برہان ساطع ہے،یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے،آپ ﷺ کے حقیقی تعارف کے لیے قرآن کریم اور کتب حدث کے ابواب مناقب،ابواب معجزات اور دلائل نبوت کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے،علاوہ ازیں کتب سیرت نبویہ کے مطالعے سے آپ ﷺ کی شخصیت اور منصب کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں،مستشرقین اور منکرین حدیث کی الجھی ہوئی تحریریں شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہیں،ان کی بجائے مخلص اہل علم وعرفان اور اصحاب یقین وایمان کی روشن تصنیفات کا مطالعہ دلوں کو جلا اور دماغوں کو ضیا بخشنے کے کام آتا ہے،عربی زبان پر دسترس نہ ہو،تو اس نیر تاباں کے

ذکرِ جمیل سے اردو کا دامن بھی مالا مال ہے۔

سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی اور خطباتِ مدراس، قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم اور مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی ''الرحیق المختوم'' تو ہر لائبریری کی زینت اور ہر جگہ دستیاب ہیں، محترم ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ کی کتاب ''نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم'' بھی مقامِ نبوت و رسالت سمجھنے کے لیے ایک وقیع علمی دستاویز اور فکرِ محدثین کی ترجمان تالیف ہے، جس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

۳۔ اسوۂ حسنہ پر ایمان بھی حجیت حدیث وسنت پر ایمان کو مستلزم ہے

اللہ رب العزت نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو امت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا، آپ ﷺ کی ذاتِ پاک اور حیاتِ طیبہ کو انسانی عزت و عظمت اور شرف و وقار اور حیاتِ اسلامی کی مکمل ہیئت کا معیار بنایا، گویا جو شخص آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو بہترین نمونہ سمجھ کر اس میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی اللہ کے دربار میں رسائی نہیں ہو سکتی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱)

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ زندگی ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے۔''

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو عملی نمونہ سمجھ کر اس کی پیروی کو اللہ نے اپنی محبت کی شرط قرار دیا، فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران: ۳۱)

”کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

ان دلائل کے پیش نظر امت اسلامیہ کے تمام ائمہ وفقہاء نے بالا جماع حدیث وسنت کے بارے میں دائمی حجت اور دلیل کا عقیدہ ہی اپنائے رکھا، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمہء ھدیٰ سب نے اطاعت رسول کو اطاعت الٰہی قرار دیا، ان میں سے کسی نے بھی اپنی فقہ اور اپنے فتویٰ و اجتہاد کو حجت یا وحی کی طرح نہیں سمجھا اور اسے معصوم عن الخطاء نہیں کہا، اپنے کسی ایسے قول پر کبھی اصرار نہیں کیا، جس کے بارے میں انہیں پتہ چل گیا کہ وہ خلافِ سنت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تو یہاں تک منقول ہے:

”یوشك ان تنزل علیکم حجارة من السماء أقول لکم قال رسول اللہ و تقولون قال ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما“

”قریب ہے کہ تم پر آسمان سے سنگ باری ہو، میں کہتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم کہتے ہو ابو بکر اور عمر نے یوں کہا ہے!“

جس کا مطلب واضح ہے کہ اسوۂ حسنہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، حجت صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے افعال و اقوال اور تقریرات ہیں، نہ ان سے صرف نظر کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کے ہم پلہ کسی کو مقام حاصل ہے، خواہ وہ خلافت علی منهاج النبوة کا امین اور ترجمان خلیفة المسلمین اور امیر المومنین ہی کیوں نہ ہو، اسی نوعیت اور مفہوم کے متعدد اقوال ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء امت سے بھی ماثور ہیں، جو اجماع امت کی ترجمانی کرتے ہیں، خلافت اسلامیہ کے ادارے اور خلیفة المسلمین سے بہتر مرکز ملت کی کیا علامت ہوسکتی ہے، ایسے ہی امت کے دین و

شریعت کے احکام و مسائل کے بارے میں اجتماعی فہم و شعور کی ترجمانی اجماع سے بڑھ کر کس طریقے سے ہو سکتی ہے، اسوۂ حسنہ، اطاعت رسول، محبت سنت اور ''دوام حدیث'' پر ایمان اور عمل خلفاء راشدین کی سنت اور متفق علیہ طرز عمل ہے اور پوری امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہے، لہٰذا مرکز ملت اور اجتماعی شعور کے علم بردار اہل قرآن کو بھی اسے قبول کر لینا چاہیے، بصورت دیگر قرآن کریم کی درج ذیل آیت کریمہ پر توجہ کی ضرورت ہے، فرمایا:

﴿وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا﴾

(النساء: ۱۱۵)

''اور جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ کے علاوہ کسی راستے پر چلے، جدھر وہ جاتا ہے، ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔''

اور امت کا یہ اجماع عصر صحابہ سے تاحال قائم ہے، تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی اس کی مخالفت نہیں کی گئی۔

ختم نبوت، عموم رسالت اور ''دوام حدیث''

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت انسانی تاریخ کے اس عہد میں ہوئی، جب انسانیت اپنی حرماں نصیبی کی آخری حدود کو چھو رہی تھی، جو دین، اخلاق و آداب، تہذیب و شرافت اور انسانی اقدار کا بدترین عہد زوال تھا، تمام سابقہ آسمانی شریعتیں دست برد زمانہ کا شکار ہو کر ضائع ہو چکی تھیں، ضمیر فروش اور دین فروش مذہبی راہنماؤں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) نے انہیں قرب الٰہی کے حصول کی بجائے

اپنی شکم پروری کا ذریعہ بنالیا تھا، ان شریعتوں کے اصل نشانات مٹ چکے تھے، آسمانی کتابوں اور ان کی تعلیمات وہدایات میں تحریف ہو چکی تھی، ان کی روشن کرنیں مدھم پڑھ چکی تھی، انسانی معاشروں میں عملاً ان کے آثار نہ ہونے کے برابر تھے، حتی کہ ان کے حقیقی خدوخال تک رسائی بھی ناممکن ہوچکی تھی، ان حالات میں رسول اکرم ﷺ کی شخصیت کی صورت میں جو آفتاب و ماہتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، غار حرا سے نور نبوت ورسالت کی جو کرنیں پھوٹیں اور وحی الٰہی کے نزول کا آغاز ہوا، وہ دراصل اسی دعوت توحید کا تسلسل تھا، جس کی دعوت دینے کے لیے سابقہ تمام انبیاء و رسل اللہ کی طرف سے تشریف لائے تھے اور یہ سابقہ شریعتوں کی تجدید و تکمیل تھی، جس کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ أَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَ لَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وَ مَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ﴾ (الأحقاف: ۹)

''کہہ دیجیے! میں رسولوں میں سے کوئی نئے انداز کا رسول تو نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔''

﴿قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (الاحقاف: ۳۰)

''وہ (جن) کہنے لگے: اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے، جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے، اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، سچے دین اور صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔''

آپ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، آپ کی نبوت ورسالت پوری انسانیت کے

لیے تھی اور ہمیشہ کے لیے تھی، فرمایا:

﴿ وَ مَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾ (الأنبياء: ١٠٧)

''اور ہم نے تو آپ ﷺ کو تمام اہل جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

﴿ وَ مَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَ لٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (سبا: ٢٨)

''اور ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو جانتے ہی نہیں۔''

﴿ قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾

(ألأعراف: ١٥٨)

''کہہ دیجئے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے لیے آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے، معبود برحق صرف وہی ہے، وہی زندگی اور موت عطا کرتا ہے، تو اللہ پر ایمان لے آؤ اور اس کے رسول نبی امی پر بھی، جو اللہ اور اس کے فرامین پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پیروی کر لو، تاکہ ہدایت پا لو۔''

درج ذیل حدیث نبوی ان آیات کی تفسیر ہے:

((عن جابر بن عبد الله الانصاری رضی الله عنهما قال قال النبی ﷺ: كان النبی يبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس عامة)) (اخرجه البخاری فی التيمم، برقم: ٣٣٥)

''ہر نبی کو اسکی قوم کی طرف خاص کر مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی

طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

صحیح مسلم کے الفاظ یوں ہیں:

((بعثت إلى كل أحمر وأسود)) (المساجد،برقم:٥٢١)

"اور مجھے ہر سرخ اور کالے کی طرف مبعوث کیا گیا ہے"۔

صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے:

((أرسلت إلى الخلق كافة وختم بي النبيون))

(مسلم:٥٢٣، عن أبي هريرة)

"مجھے پوری مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہے اور سلسلہ نبوت مجھ پر ختم کردیا گیا ہے۔"

① حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور آپکی نبوت ورسالت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف دین کی تکمیل فرمائی اور نعمت کو کمال وتمام تک پہنچایا، فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾

(المائدة:٣)

"میں نے آج کے دن تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی"۔

② دوسرے سابقہ شریعتوں اور کتابوں میں جو تحریف اور تبدیلی ہو چکی تھی، اس کی اصلاح فرمائی، فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَ كَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (المائدة:٤٨)

"اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان پر نگران ہے، تو انکے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرنا، جو اللہ نے نازل کیا ہے، تیرے پاس جو حق آیا ہے، اس کی

بجائے ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔"

﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الأعراف: ١٥٧)

"اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا اور ان کے بوجھ اور طوق اتارتا ہے"۔

۳۔ تیسرے آپ ﷺ کی ذات گرامی کو سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی اور اس قصر رفیع کی آخری اینٹ قرار دے کر اس سلسلہ کو ختم فرمایا، آپ ﷺ کو خاتم الأنبیاء اور آپ ﷺ کی امت کو آخر الأمم کے شرف سے سرفراز فرمایا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الأحزاب: ٤٠)

"محمد ﷺ تم سے کسی کے باپ نہیں ہیں اور لیکن اللہ کے رسول اور خاتم الأنبیاء ہیں۔"

((عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال مثلي ومثل الأنبياء من قبلي كمثل رجل بنىٰ بنيانا فاحسنه وأجمله إلا موضع لبنة من زاوية من زواياه فجعل الناس يطوفون به ويعجبون له ويقولون هلا وضعت هذه اللبنة قال فأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين))

(متفق عليه، بخاري: ٣٥٣٥۔ مسلم: ٢٢٨٦)

"ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسے ہے، جیسے کسی شخص نے ایک عمارت بنائی، اس کے حسن وجمال کا پورا اہتمام کیا، مگر اس کے کونوں میں سے کسی ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس عمارت کا چکر لگاتے، اس کے لیے خوشی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی؟ آپ نے فرمایا: وہ آخری

اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبین ہوں''۔

اس آیت اور اس حدیث سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ خاتم الأنبیاء والمرسلین ہیں، آپ ﷺ کی بعثت سلسلہ نبوت ورسالت کی تکمیل ہے۔

۴۔ چوتھے اس کی حفاظت کا وعدہ کر کے اسے ہمیشہ کے لیے دوام وثبات بخشا اور واجب القبول والعمل ٹھہرایا اور بتایا کہ کامیابی کا یہی ایک ذریعہ ہے:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (الأعراف:١٥٧)

''تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اسکی رفاقت اختیار کی اور اسکی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی، جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

کیا کہیں اشارہ بھی ہے کہ اس ایمان، رفاقت، مدد اور اتباع کی کوئی مدت مقرر ہے؟ یا یہ کسی زمانے تک محدود ہے؟ یا یہ نور ہدایت صرف قرآن کریم تک محدود ہے؟ رسول اللہ ﷺ پر جو کچھ وحی کی صورت میں نازل ہوا، وہ واجب الاتباع اور ذریعہ نجات ہے، وہ کتاب اللہ ہو یا حدیث وسنت رسول اللہ ﷺ۔ کتاب اللہ میں اس کے متعدد واضح دلائل موجود ہیں کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، وحی الٰہی کا یہ مجموعہ ہی انسانی ضروریات کا کفیل ہے، اب انسان علم وفضل، تعمیر و ترقی، تہذیب وتمدن، صنعت وتجارت، فہم وفراست اور ادب وثقافت میں جس قدر بھی وسعت اختیار کر لے، اسکی جسمانی و روحانی تعلیم و ہدایت کی جملہ ضروریات کے لیے اسلام کے دامن وسعت میں کبھی کسی کوتاہی کا احساس نہیں ہو گا، تکمیل دین اور اتمام نعمت کا یہی مفہوم ہے۔

اسلام خاتم الأدیان ہے، اس کے بعد کوئی دین نہیں۔

محمد ﷺ خاتم الأنبیاء ہیں، اسکے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں۔

یہی وہ دین کامل ہے، جسے اللہ نے قیامت تک پوری انسانیت کے لیے پسند فرمایا اور تمام اہل ادیان کو حکم دیا کہ وہ اس دین کو قبول کر کے اس میں داخل ہو جائیں، اس لیے کہ اس کے ساتھ اللہ نے سابقہ تمام ادیان منسوخ کر دیئے ہیں، بعثت محمدی کے بعد دربار الٰہی میں کوئی دین اسلام کے سوا قابل قبول نہیں، فرمایا:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹)

"یقیناً اللہ کے ہاں دین صرف اسلام ہی ہے"۔

دین اسلام کو قبول کیے بغیر انسان کی ہر سعی لاحاصل اور محنت رائیگاں ہے، فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ۸۵)

"اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی جستجو میں رہے، تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔"

اسلام میں رسول اللہ ﷺ کی حیثیت، مقام و مرتبہ اجاگر کرنے کے لیے اگلی آیت میں ایسے لوگوں کی ہدایت سے محرومی کا ذکر کیا، جو ایمان لانے اور رسول اللہ ﷺ کی حقانیت و صداقت کی شہادت دینے کے بعد انکار کرتے ہیں اور انہیں اللہ، اسکے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کے حق دار ٹھہرایا، قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی حقیقت واقعہ کی حیرت انگیز تصویر کشی کی ہے، فرمایا:

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾

(آل عمران: ۸۶،۸۷)

"اللہ ایسے لوگوں کو کیوں کر ہدایت دے، جو اپنے ایمان کے بعد کفر کے مرتکب

ہوئے اور وہ یہ شہادت بھی دے چکے کہ یقیناً رسول برحق ہیں اور ان کے پاس روشن دلائل بھی آ چکے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے، ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ بلاشبہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے''۔

پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی پیدائش اور بعثت سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء ورسل سے یہ عہد لے لیا تھا کہ اگر وہ آپ ﷺ کے عہد نبوت ورسالت کو پالیں، تو آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور آپ ﷺ کی مدد کریں۔اس لیے تمام انبیاء کرام اور ان کی امتیں آپ ﷺ کی ذات وصفات سے آگاہ تھے اور ان کی کتابوں میں بھی آپ ﷺ کے اوصاف مذکور تھے، فرمایا:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ﴾

(آل عمران: ۸۱)

''اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت دی، پھر تمہارے پاس کوئی ایسا رسول آئے، جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو، تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی لازماً مدد کرو گے''۔

نیز فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

''وہ لوگ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں، جو نبی امی ہے، جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔

نبوت ورسالت محمدیہ کے اس عموم وشمول، جامعیت وکمال اور دوام واستمرار پر مستزاد اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا ابدی وعدہ بھی قرآن کریم کی نص قطعی سے

ثابت اور ایک حقیقت واقعہ ہے۔

''دوام حدیث'' پر ایمان ویقین اور عمل کے بغیر دین اسلام کے یہ وسیع تر محامد ومحاسن کیسے صورت گر ہو سکتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کے منصب نبوت کی دائمی حیثیت اجاگر ہوسکتی ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ایسے دین کامل کا مصدر وماٴخذ ہیں، جسے کسی چارہ گر کی ضرورت ہے، نہ کسی رفوگر کی! یہ منزل من اللہ ہے، جسے بھیجنے والا کامل واکمل، لانے اور پہنچانے والا معصوم عن الخطاء ہے، یہ تو کسی سابقہ آسمانی کتاب اور کسی سابق نبی ورسول کا بھی محتاج نہیں ہے، کسی خود ساختہ مدعی نبوت، مصلح یا شارح کی اسے کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ بعثت محمدی کے بعد سے اسلامی تاریخ کے کسی عہد میں انسانی معاشرے کی ہدایت وراہنمائی کے لیے اسے کبھی کسی مرکز ملت یا کسی ایوان زیریں وبالا کی احتیاج نہیں رہی، یہ تو اصلاح احوال کا نسخہ ءکیمیا ہے، جب اس میں کسی فساد کا امکان ہی نہیں، تو اسے کسی مصلح کی کیا ضرورت ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے ظہور اسلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا یا اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، اس نے امت کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا، بلکہ مسائل پیدا کیے ہیں، امت کی فلاح وسلامتی اسی میں ہے کہ وہ کتاب وسنت کو بغیر کسی افراط وتفریط کے بطور دین قبول کرے، اس کے منزل من اللہ اور کامل ہونے پر ایمان لائے، اس پر عمل کر کے اور اس کی طرف دعوت دے۔

مگر ختم نبوت، عموم رسالت اور ''دوام حدیث'' پر ایمان کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

جب تک منصب نبوت ورسالت کے دیگر متعدد اوصاف کے ساتھ ان تینوں مذکورہ اوصاف کو غیر مشروط اور عملاً تسلیم نہیں کیا جاتا، امت کی تشکیل مکمل نہیں ہوسکتی، مرکز ملت معرض وجود میں نہیں آسکتا. اور وحدت امت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا، جو ہر مخلص اور دردمند مسلمان کی تمنا اور آرزو ہے۔

فرقہ ناجیہ اور طائفہ منصورہ اہل السنۃ والحدیث نبوت ورسالت کے اسی منصب رفیع کو ان وسیع تر معنوں کے ساتھ قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسکی حفاظت کا علم بردار ہے، یہ دعوت اور حفاظت ان کے اسلاف کی علمی میراث ہے، اللہ کے فضل وکرم سے اسے نصرت الٰہی بھی حاصل ہے، یقیناً یہ منصب تا قیامت محفوظ بھی رہے گا اور امت کے ہاں مقبول بھی، إن شاء الله! رسول اللہ کا فرمان ہے:

((لاتزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى يأتي أمر الله وهم كذلك)) متفق عليه واللفظ لمسلم

حفاظت دین کے دو طریقے

پہلا طریقہ

دین حق کی حجت، دلیل اور برھان کے غلبے کا سامان اللہ تعالی نے یہ فرمایا کہ اس میں کچھ ایسی داخلی شہادتیں رکھ دی ہیں، جن کی صداقت پر کبھی حرف نہیں آیا، وہ متلاشیان حق کو سکون و اطمینان فراہم کرتی ہیں، جس میں قرآن کریم اور حدیث نبوی کا اعجاز سرفہرست ہے، قرآن حکیم میں متعدد ایسی تحدیات ہیں، جن کا جواب کبھی کسی سے نہیں بن پڑا اور نہ کبھی بن پڑے گا، جس میں سب سے اہم اور معروف نظم قرآن کریم کا لفظی اعجاز اور معنوی جامعیت ہے، انہی کے مقابلے کا چیلنج بھی بار بار کیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اعجاز حدیث کی ایک دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

" عن المقدام بن معدي كرب قال قال رسول الله ﷺ " ألا إنّي أوتيت القرآن ومثله معه ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه وما وجد تم فيه من حرام فحرموه" ۔ (رواه أبوداود: ٤٦٠٥)

مقدام بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا
''خبردار رہو! یقیناً مجھے قرآن بھی عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی ہی ایک اور چیز بھی، خبردار رہو! عنقریب ایک شکم سیر شخص اپنے چھپر کھٹ سے یہ دعوت دے گا کہ بس قرآن ہی کو تھامے رکھو، اس میں جو چیز حلال پاؤ، اسے حلال جانو اور جو چیز اس میں حرام پاؤ، اسے حرام جانو''۔

اور ابن ماجہ میں یہ الفاظ بھی ہیں :

"ألا وإن ماحرم رسول اللّٰه مثل ماحرم اللّٰه "

(ابن ماجه برقم ۱۲ و ۳۱۹۳)

''خبردار! اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ حرام قرار دیا ہے، وہ بھی ویسے ہی حرام ہے، جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا ہے۔''

" عن أبي رافع قال قال رسول اللّٰه ﷺ " لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه فيقول لا أدري ما وجدنا في كتاب اللّٰه اتبعناه "(أحمد، أبو داود، ترمذی)

ابو رافع سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تم میں ایک شخص کو اس حال میں نہ پاؤں، وہ اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، میرا کوئی حکم امر یا نہی کا اس کو پہنچے، تو وہ کہنے لگے کہ میں تو اسے جانتا نہیں ہوں، میں تو بس اسی کی پیروی کروں گا، جو قرآن میں ہم پاتے ہیں۔''

فتنہ انکار حدیث جو مختلف ناموں سے رونما ہوا ہے، اس کا ایک روشن اور واضح عکس اعجاز حدیث کے اس شفاف آئینہ میں نظر آرہا ہے، کس قدر صاف اور صریح الفاظ میں کاشانہ نبوت سے اس پیش گوئی کے ذریعے سے امت کو آگاہ کیا گیا کہ امت مسلمہ کی طرف نسبت رکھنے والے ہی کچھ شقاوت نصیب افراد اٹھ کھڑے ہوں

گے، جو کہیں گے، ہمیں بس قرآن ہی کافی ہے اور حدیث سے ہم مستغنی ہیں۔

"شبعان" (شکم سیر) اور "متکئا علی أریکته" (چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے) کے الفاظ سے جس مزاج اور ذہنیت کا نقشہ رسول اللہ ﷺ نے کھینچا ہے، منکرین حدیث کے سرغنوں اور اس فتنہ کے بانیوں کو جو اہل علم جانتے ہیں، وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا واقعاتی اور عملی مصداق وہی لوگ ہیں، جو علم ناقص، عقل سقیم، تلاش حق سے بے اعتنائی، خود بینی اور خود پسندی کے مخصوص نشان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ حدیث پرویزی معیار تحقیق کے مطابق صحیح بھی ہے۔

ان احادیث نبویہ میں اس قدر واضح معجزانہ خبریں ہیں کہ ان کے انکار کی کوئی صورت نہیں ہے، حیرت ہے کہ پھر بھی حرماں نصیبوں کو ہدایت میسر نہ آئی!

صدق اللّٰہ حیث قال:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

(الحج: ٤٦)

"بات یہ ہے کہ چہرے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں، وہ اندھے ہو جاتے ہیں"۔

احادیث مذکورہ میں نبی ﷺ کے مقام و مرتبہ اور امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے باب میں آپ کے فرامین کی حجیت جس طرح بیان ہوئی ہے، قرآن کریم میں بھی آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ اور حیثیت بعینہ اسی طرح بیان ہوئی ہے، فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (التوبة: ٢٩)

"ان لوگوں سے جنگ کرو، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اسے حرام نہیں سمجھتے، جسے اللہ نے حرام کیا ہے اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے"۔

دوسرے مقام پر آپ ﷺ کے فرائض منصبی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾

(الأعراف : ۱۵۷)

''اور وہ پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں''۔

عصر حاضر میں ظہور پذیر ہونی والی ایک حقیقت واقعہ کی وضاحت اور صدیوں قبل اس کی خبر کا حدیث میں ذکر ہونا حجیت حدیث کی داخلی شہادت ہے، جو اہل الحدیث کے حق میں اور منکرین حدیث کے خلاف برہان ساطع ہے۔ والحمد للہ علی ذلک

حفاظت دین کا ایک طریقہ تو یہ ہے، جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ اس میں ذاتی اور داخلی قوت ہی اتنی مستحکم ہے کہ اس کے خلاف کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس کی طبیعت ہی اپنے اوپر کسی کا غلبہ قبول کرنے والی نہیں ہے۔

حفاظت دین کا دوسرا طریقہ

یہ اختیار فرمایا گیا کہ اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالی نے اپنے بندوں میں سے کچھ ایسی طاقت ور علمی، فکری اور عملی اعتبار سے مضبوط اور قابل اعتماد محافظ شخصیات پیدا فرمائیں، جن کی زندگی کا مقصد وحید ہی دین کی حفاظت تھا، جن کا طبعی ذوق اور ذہنی میلان ہی اس کام کے لئے انتہائی مفید اور مناسب تھا، یوں لگتا ہے کہ وہ لوگ پیدا ہی اس کام کے لئے کئے گئے تھے اور انہوں نے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ اپنی تمام استعدادات اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دین کی حفاظت کا ایسا بندوبست کیا اور اپنی بہترین فکری و عملی قوتوں کی بدولت دین کی عقیدہ و عمل کی سرحدوں اور اس کے حقیقی اور اصلی دونوں سر چشموں کتاب و سنت کے الفاظ و متون اور

معانی ومفاہیم کے تحفظ کا ایسا بے نظیر اہتمام کیا کہ ان میں کسی ادنی سے تغیر وتبدل اور خلل کو برداشت کرنا بھی ان کی طبائع پر گراں گزرتا تھا، اور حفظ دین کا یہ طریق مسلسل وپیہم امت کے اعلیٰ ترین افرادِ کار کے ذریعے ہمیشہ جاری رہا اور اس کے لئے اللہ نے ایسا ظاہر و باھر انتظام فرمایا، جو بذات خود دین کی حقانیت وصداقت کی ایک حجت ودلیل ہے، مثلاً:

الف۔ ائمہ ھدیٰ کی تجدیدی مساعی

امت کو دین کی حفاظت کی نوید رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل الفاظ میں دی :

عن أبي هريرة فيما أعلم عن رسول الله ﷺ قال "إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها"۔

(رواه أبوداود : ٤٢٩١)

"بلا شبہ اللہ تعالی اس امت کے لئے ہر صدی کے شروع میں ایسے لوگ پیدا فرماتا رہے گا، جو اس کے لئے اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے"۔

یعنی حفاظت دین کے لئے تجدیدی مساعی سرانجام دیتے رہیں گے، اور دین اسلام کے نشانات اور معالم کبھی مٹنے نہیں پائیں گے، نہ ہی لوگوں کے ہاں اس کے احکام ومسائل سے اجنبیت پیدا ہوگی، بلکہ دین ہمیشہ تروتازہ اور روشن رہے گا، کوئی اس کے الفاظ ومعانی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر پائے گا، اگر کوئی شکوک وشبہات پیدا کرے گا اور اس کے خلاف دھول اڑانے کی کوشش کرے گا، تو اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کی اصل شکل کو پھر سے لوگوں کے سامنے اجاگر کرنے کے لئے ہر صدی میں مجددین میدان عمل میں آتے رہیں گے، جن کی تجدیدی مساعی کی بدولت تا قیامت دین اپنی اصل حالت میں محفوظ ومصؤن رہے گا، الحمدللہ ائمہ ھدیٰ، علماء وفقہاء اور محدثین کرام کی دین کے لئے تجدیدی مساعی کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے، جس کے نتیجے میں

کتاب وسنت کے الفاظ ومعانی بعینہ عہد نبوی کی طرح تر وتازہ اور محفوظ ہیں۔

ب۔محدثین کرام کے کارنامے

اس پر مستزاد دین کے اس مبارک علم کی حفاظت کے لئے اللہ تعالی نے ہر دور میں اہل علم کو توفیق سے نوازنے کا وعدہ بھی اپنے حبیب ﷺ کی زبان مبارک سے فرمایا ہے، حدیث میں ہے :

عن أسامة بن زيد عن النبي ﷺ أنه قال: "يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالينِ وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين"۔ (رواه الدارقطني)

اسامہ بن زید سے مروی ہے،وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"ہر آنے والی نسل میں سے عادل لوگ اس علم کو حاصل کرتے رہیں گے، جو اس سے غالی لوگوں کی تحریفات کی نفی کرتے رہیں گے، اہل باطل کی خود ساختہ تلبیسات اور جاہلوں کی تاویلات کا ازالہ کرتے رہیں گے"۔

اس پیش گوئی کے عین مطابق پوری اسلامی تاریخ میں کبھی کوئی دور ایسا نہیں گذرا، جب اہل علم کی ایک معقول تعداد ایسی موجود نہ رہی ہو، جو کتاب وسنت کی لفظی ومعنوی حفاظت کا فریضہ ادا کرنے کی اہل ہو، بلکہ ہر دور میں ایسے علماء کی ایک بڑی تعداد اس استعداد کے ساتھ موجود رہی اور اس نے اپنے آپ کو اس مقدس اور مبارک کام کے لئے وقف بھی کیے رکھا، اللہ کے فضل وکرم سے رسالتمآب علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ایک بھی حدیث امت کے علم سے محو نہیں ہونے پائی اور ذخیرہ حدیث میں ایک بھی موضوع حدیث داخل نہیں کی جاسکی، آپ ﷺ کا کوئی ایک بھی مبارک عمل امت کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو پایا اور نہ ہی ہزار کوششوں

کے باوجود امت کو آپ ﷺ کے اقوال وافعال سے برگشتہ کرنے میں کوئی کامیابی حاصل ہوسکی ہے۔

اسوۂ حسنہ کی حفاظت اور اسکی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور نظام زندگی کی ترتیب وتدوین محدثین کرام کا ایک بڑا کارنامہ ہے، جوانہوں نے صحاح ستہ کی شکل میں سرانجام دیا اور امت نے اسے قبول کیا، اور اسکے ساتھ منقول علم کلام کی روشنی میں انہوں نے فرق ضالہ کا استیصال بھی کیا، جن کے پیش نظر:

① وحی سے اعتماد اٹھانا اور اسے مشکوک بنانا تھا، جیسے روافض کا طرز عمل ہے۔

② عقل کی روشنی میں اس کی من مانی تاویل جو انکار کا ایک طریقہ ہے، جیسے جھمیہ و معتزلہ کے افکار ہیں۔

③ نبوت کا مقام کم کرکے احادیث کا جزوی انکار، جیسے خوارج وقدریہ کے نظریات ہیں۔

امام بخاری نے بالخصوص ان سب کا محاسبہ کیا۔ اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے صرف حدیث ہی نہیں، دین کی علمی وفکری اور عملی حفاظت کا کارنامہ بھی انجام دیا، امت میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

پھر ابن تیمیہ اور ان کے مدرسہ فکر نے انہی کے منہج اور اصولوں کی روشنی میں انکا ایسا تعاقب کیا کہ اس کے بعد زیر زمین انکا کام اور بوسیدہ کتابوں میں انکا نام تو ملتا ہے، مگر انکا وجود اور انکی شناخت ان کے ناموں سے مسلم معاشروں میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، حالانکہ ہمیشہ حکومتوں نے ان کی سرپرستی اور ان کے افکار کی آبیاری بھی کی، مگر اللہ کا فیصلہ ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ أَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ﴾ (الرعد:۱۷)

"پھر جو جھاگ ہے، سو بے کار چلا جاتا ہے اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع دیتی ہے، سو زمین میں رہ جاتی ہے، اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔"

بعد کی صدیوں میں ان میں کوئی نامور ہوا اور نہ کسی کا کام متعارف ہوا، اگر ان میں سے کسی کی شہرت باقی ہے، تو کتاب وسنت کی خدمت کی بدولت ہے، اپنے باطل افکار کی وجہ سے نہیں اور وہ لوگ مسلم معاشروں سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔

طلبہ علم خاطر جمع رکھیں، دور حاضر کے معتزلہ اور یورپ زدہ مدعیان علم وتحقیق بھی حکومتی حمایت کے بل بوتے پر عوامی سطح پر تو رقص کر سکتے ہیں، بگڑے ہوؤں کو مزید بگاڑ سکتے ہیں، مگر اہل ایمان کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکتے، اللہ کی بجائے چڑھتے سورج کے یہ پجاری غروب آفتاب کے ساتھ ہی غرق آب ہو جائیں گے، پھر ان کے جان لیوا تو بہت ہونگے، مگر نام لیوا کوئی نہیں ہوگا۔

﴿إن الذين آمنوا وعملوا الصلحت سيجعل لهم الرحمن وُدًّا ف إنما يسر نه بلسانك لتبشر به المتقين وتنذر به قوما لدًّا﴾

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، عنقریب ان کے لیے رحمن محبت پیدا کر دے گا۔ سو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے، تا کہ تو اس کیساتھ متقی لوگوں کو خوشخبری دے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرائے، جو سخت جھگڑالو ہیں"۔

قحط الرجال کے اس دور میں بھی جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں، حدیث سے متعلقہ جملہ علوم وفنون کے ماہرین دنیا بھر میں بمقدار وافر موجود ہیں، بلکہ بمصداق حدیث نبوی "إن الله ينصر هذا الدين بالرجل الفاجر" عصر حاضر میں تو بعض کفار بھی حدیث نبوی کی خدمت میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، خواہ ان کی

نیت فاسد ہی کیوں نہ ہو، یہ بدنصیبی صرف نام نہاد مسلمانوں کے ایک گروہ کے حصہ میں ہی آئی ہے کہ وہ لوگوں کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ ہم کتاب اللہ کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے سنت وحدیث نبوی کے محتاج نہیں ہیں، ان کا اصل مقصد لوگوں کو دین سے برگشتہ کرنا ہے، سچ فرمایا اللہ نے:

﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾

(الأنعام : ٣٣)

"سو یقیناً یہ لوگ تجھے نہیں جھٹلا رہے، لیکن ظالم لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں"۔

ج۔ حفظ دین کے لئے طائفہ منصورہ کی لازوال خدمات

اللہ تعالی نے اپنے دین کے مصادر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی علمی وعملی حفاظت کے لئے ایک ایسی جماعت کے وجود کی خوش خبری بھی اپنے رسول کے ذریعے اپنے بندوں کو دی، جو مسلسل وپیہم باستمرار اس دین پر قائم ودائم اور عمل پیرا رہے گی، انہیں اس پر کار بند رہنے کے لئے نصرت الہی بھی حاصل ہوگی، جس کی بدولت وہ کبھی بے یار ومددگار ہوگی اور نہ ہی اس کے مخالفین انہیں دینی امور میں کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔

حفاظت دین کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی کس قدر ڈھارس بندھائی کہ وہ خاطر جمع رکھیں اور کتاب وسنت اور اس پر عمل کی حفاظت کے بارے میں مطمئن رہیں، اس میں کبھی خلل نہیں آئے گا، جہاں افراد وافذاذ اس کی حمایت وتائید کے لئے کمر بستہ رہیں گے، وہاں ایسے افراد سے ایک جماعت بھی تشکیل پائے گی اور ہمیشہ برسرکار رہے گی، فرمایا:

عن معاوية قال سمعت النبي ﷺ يقول :"لاتزال طائفة من أمتي

قائمة بأمر اللّٰه لا یضرهم من خذلهم أو خالفهم حتی یأتی أمر اللّٰه وهم ظاهرون علی الناس "۔(بخاری : ۳٦٤١، مسلم : ۱۰۳۷)

حضرت معاویہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی، نہ انہیں اکیلا چھوڑ کر کوئی ان کا نقصان کر سکے گا اور نہ ان کی مخالفت کر کے ان کا کچھ بگاڑ سکے گا، حتی کہ قیامت آ جائے گی اور انہیں لوگوں پر غلبہ حاصل رہے گا"

اسی جماعت کے منہج کو اللہ تعالی نے "سبیل المؤمنین" کہا ہے، اور اس کی مخالفت کو اپنے عذاب کا موجب ٹھہرایا ہے۔(النساء:۱۱۵)

امام بخاری رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق یہ طائفہ منصورہ "أهل العلم" کی جماعت ہے، یہ پیش گوئی بھی نبی ﷺ کے دلائل نبوت میں سے ہے، جو من وعن پوری ہو رہی ہے۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی ان داخلی شہادتوں سے یہ امر واضح ہے کہ حدیث وسنت مکمل طور پر محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی، یہ اللہ کی حفاظت میں ہیں اور اللہ نے ان کی حفاظت اور دوام کا وعدہ اپنے بندوں سے کیا ہوا ہے اور اللہ سے بڑھ کر وعدے پورے کرنے والا کوئی نہیں ہے :

﴿ وَ مَنْ أَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ﴾ (التوبة : ۱۱۱)

اہل علم کی جد وجہد تو محض ایک شرف ہے، جو اللہ نے انہیں بخشا ہے، جس کے نتیجے میں دنیا میں انہیں نضارت اور تر وتازگی حاصل ہوگی اور آخرت میں اپنی منزل جنت تک رسائی آسان ہوگی، اِن شاء اللہ!

ایسے ہی اہل جہل وعناد کی سعی نامشکور قطعاً بے سود اور ان کے خلاف ایک حجت ہے، جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں ذلت ورسوائی کا شکار ہونگے اور آخرت میں مبتلاء عذاب ہونگے۔

دوام حدیث

زیر نظر کتاب '' دوام حدیث'' ان مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے، جو طویل مدت تک حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ کے قلم معجز رقم سے نکلتے رہے، اس کا آغاز انہوں نے غالباً سب سے پہلے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے ہفت روزہ جریدہ ''الاعتصام'' میں اپنے ان وقیع مقالات کی اشاعت سے کیا تھا،اس کے بعد یہ سلسلہ ایک مختصر مدت کے لیے برصغیر کی علمی،ادبی،تحقیقی تاریخ کے مایہ ناز اور یادگار ماہنامہ ''رحیق'' لاہور میں اشاعت پذیر ہوتا رہا، جو موصوف کے تلمیذ رشید محدث ابوالطیب محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا، پھر جب علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے اپنے ماہنامہ موقر مجلّہ'' ترجمان الحدیث'' لاہور کا آغاز فرمایا،تو طویل مدت تک یہ مقالات مسلسل اس کی زینت بنتے رہے۔

دفاع عن السنة کے باب میں یہ ایک انتہائی قابل قدر دستاویز ہے، اس کے مولف ومرتب جہاں اپنے عہد میں طائفہ منصورہ کے سرخیل تھے، وہاں حدیث اور علوم حدیث میں انہیں بلاشک مجدد کا مقام بھی حاصل تھا، کتاب وسنت کی نشر واشاعت،تعلیم وتدریس اور فہم ومعرفت، بدعات کی اصلاح اور حدیث وسنت کے دفاع کے اعتبار سے وہ نادر روزگار اور نابغہ عصر شخصیت تھے، ان کے عہد میں ان جیسا کسی نے کوئی دوسرا دیکھا ہوگا اور نہ ہی انہوں نے خود اپنے جیسا کوئی دیکھا ہوگا، انہیں بیہقی زماں مولانا ابوسعید محمد شرف الدین محدث دہلوی (متوفی ۱۳۸۱ھ، ۱۹۶۱م)، مجتہد العصر، فقیہ دوراں مولانا حافظ عبد اللہ محدث روپڑی (متوفی ۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۴م)، محدث القرون الاخیرہ علامہ محمد ناصر الدین البانی (متوفی ۱۴۲۰ھ، ۱۹۹۹م)، مفتی اسلام سماحة الشیخ عبدالعزیز بن باز (متوفی ۱۴۲۰ھ،۱۹۹۹م) جیسے ائمہ ھدیٰ کی معاصرت کا شرف حاصل ہے،جن میں سے ہر ایک بڑے علمی

مقام پر فائز تھا اور ان سب نے ہی دفاع سنت کے لئے خدمات سرانجام دیں۔جزاھم اللہ خیراً!

ایسے عظیم لوگوں کے عہد میں علوم وفنون کی ریاست کا شرف کوئی معمولی بات نہیں، وہ **حجۃ الإسلام** اور **آیۃ من آیات اللہ** تھے، بالخصوص ہر چیز میں اپنی مثال آپ تھے۔

شیخ الکل فی الکل میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کے بعد حافظ صاحب مرحوم سے بڑھ کر طلبہ علم حدیث کسی کو میسر نہیں آئے، ان کا حلقہ درس پورے عالم اسلام میں پھیلا ہوا تھا، ان کے تلامذہ میں علم وفضل، زہد وتقوی اور علمی ثقاہت وفقاہت کے اعلی پایہ کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

حفاظت حدیث کے لیے قدرت الٰہی کا حسن انتظام دیکھئے کہ مجدد العلوم الإسلامیہ نواب سید صدیق حسن خان قنوجی نے ۱۳۰۷ھ میں انتقال کیا، ناشر الوحیین شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی نے ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، اور حضرت العلام امام العصر حافظ محمد محدث گوندلوی کی ولادت با سعادت ۱۳۱۵ھ میں ہوئی اور انہوں نے ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵م میں وفات پائی۔

ہر صدی اور ہر علاقہ میں ایسی شخصیات کا وجود طائفہ منصورہ پر اللہ کا خاص الخاص فضل واحسان اور رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ بالا پیش گوئی کا صحیح ترین مصداق ہے۔ والحمدللہ علی ذلک!

مختصر حالات زندگی

ابو عبد اللہ حافظ محمد اعظم بن فضل الدین گوجرانوالہ کے قریب موضع گوندلانوالہ میں ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔بچپن میں مکتب کی تعلیم کے ساتھ ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا،نو برس کی عمر میں والد گرامی کے سایہ سے محروم ہوگئے، جو طاعون کی بیماری میں

شہید ہو گئے تھے، تیرہ برس کی عمر میں تحصیل علوم کے لئے سفر کیا اور امرتسر چلے گئے، وہاں انہوں نے امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے علاوہ مولانا عبدالاول غزنوی اور مولانا عبدالغفور غزنوی سے بھی حدیث وتفسیر کے علوم حاصل کئے۔ دیگر علوم وفنون کی کتابیں مولانا محمد حسین ہزاروی سے پڑھیں، امرتسر میں مشائخ غزنویہ سے کسب فیض کے بعد وزیر آباد میں استاذ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۳۴ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، درس حدیث لیا اور سند واجازت روایت حاصل کی، جو اپنے دور کی سب سے عالی سند تھی، جس کے ذریعے مرحوم دو واسطوں سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں۔اس پر علمی تشنگی باقی رہی، تو مرکز علوم دہلی کا سفر اختیار کیا، وہاں مولانا احمد اللہ محدث دہلوی، مولانا عبدالرحمن پنجابی اور مولانا عبدالرزاق پشاوری سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی اور طبیہ کالج دہلی سے طب وحکمت کی تعلیم حاصل کی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

صرف ۲۲ برس کی عمر میں جملہ علوم وفنون متداولہ سے فراغت حاصل کر کے واپس اپنے گاؤں گوندلانوالہ ضلع گوجرانوالہ تشریف لائے اور تدریس کے ساتھ ساتھ ائمہ اسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، شاطبی، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل جیسے لوگوں کی کتب کے مطالعہ میں مشغول رہے، جس کی بدولت جلد ہی وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، ۳۰ برس کی عمر میں ان کا شہرہ پورے عالم اسلام میں ہو چکا تھا۔

حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف، حضرت مولانا حافظ ابوالحسن عبداللہ بڈھیمالوی، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صافوی، حضرت مولانا حافظ اسحاق لاہوری، حضرت مولانا حافظ محمد بھٹوی ان سے کسب فیض کر چکے تھے، حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی، مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی، حافظ محمد یحیٰ عزیز میر محمدی، مولانا محمد یحیٰ شرقپوری، حافظ

عبد المنان نور پوری اور حافظ ثناء اللہ مدنی جیسے مؤلفین، مدرسین اور دعاۃ ان کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی دانش گاہ مرکز اسلام مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے استاذ حدیث بھی رہے، اس کے ساتھ متعدد وقیع علمی اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جن میں درج ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں:

١. الإصلاح (٣ اجزاء، رد بدعات)
٢. تحفة الاخوان (علم الكلام)
٣. تنقيد المسائل (بعض معاصرین کے فکری انحراف کا ناقدانہ جائزہ)
٤۔ خير الكلام في وجوب الفاتحة خلف الإمام
٥۔ التحقيق الراسخ في أن أحاديث الرفع ليس لها ناسخ
٦۔ إثبات التوحيد (ردّ عیسائیت)
٧۔ بغية الفحول في شرح مختصر الأصول (شاہ اسماعیل شہید کے رسالہ کی شرح ہے)

مرحوم کی مطبوعہ ومخطوطہ مولفات کی تعداد ١٨ کے قریب ہے۔ حضرت حافظ صاحب نے ١٤ رمضان المبارک ١٤٠٥ھ مطابق ٤ جون ١٩٨٥ء میں ٩٠ برس کی عمر میں وفات پائی۔ بروایت حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ حضرت حافظِ صاحب سے پچاس برس تک کبھی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوئی، مرحوم نماز باجماعت کا ایسا اہتمام کرتے کہ اس کی مثال ملنا دشوار ہے، ان جیسا صافی القلب اور عفیف اللسان کم ہی کسی نے دیکھا ہوگا، اللّٰهم اغفر له وارحمه

"دوامِ حدیث"

مرحوم حافظ صاحب کی نہایت معرکۃ الآراء علمی خدمت ہے، جو اپنے باب میں اپنی مثال آپ ہے، جو لوگ آپ کو علم کا کباڑ خانہ اور غیر مرتب خزانہ کہتے ہیں، یہ

انتہائی مرتب کتاب ان کے منہ پر طمانچہ ہے، یہ اہل علم کے لئے بیش قیمت علمی تحفہ اور اہل ایمان کے لئے شفاء الصدور ہے، حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا ہر صفحہ علم کا بحرِ زخار ہے۔

بارگاہ الٰہی میں التجا ہے کہ جیسے اس نے مؤلف کی شخصیت کا فیضان علم عام کیا ہے، ویسے ہی ان کی اس کتاب کو بھی شرف قبولیت سے نوازے اور ان کی درجات کی بلندی کا باعث بنائے، اس کی بدولت امت کے دین کے بارے میں فہم وشعور میں استقامت پیدا فرمائے، اہل ایمان کے یقین میں اضافہ کا ذریعہ بنائے اور اہل تشکیک کی ہدایت کا سامان بنائے ۔مصنف کے اخلاص وللّٰہیت اور حسن عمل کے پیش نظر دربار الٰہی سے یہ امید بر آنے کی توقع رکھی جاسکتی ہے، وماذلک علی اللہ بعزیز

عزیز گرامی قدر حافظ شاہد محمود سلّمہ اللہ نے اسے جمع کیا، احادیث کی تخریج کی، حسب ضرورت حواشی لکھے، ترتیب دی اور جو کچھ کیا خوب سلیقے سے کیا، حق یہ ہے کہ انہوں نے طلبہ علم پر بڑا احسان کیا، جو ان کے لئے اتنا عظیم الشان علمی تحفہ کتابی شکل میں پیش کر دیا اور مرحوم حافظ صاحب کے تلامذہ اور ان کے علوم کے خوشہ چینوں کے لئے یہ دستاویز مرتب کردی، جس سے منکرین حدیث اور ملحدین کے پیدا کردہ تمام شکوک وشبہات کا ازالہ ہوگیا ہے ۔اللہ تعالی کے حضور دعا ہے کہ وہ عزیز گرامی کو اخلاص کی دولت سے نوازے اور ایسے مزید علمی کارنامے سرانجام دینے کی توفیق بخشے اور انہیں اجر جزیل عطاء فرمائے۔

موصوف جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فاضل، علم دوست، سلجھے ہوئے نوجوان سال صاحب علم ہیں، ہمارے نہایت محبوب ومحترم اور ہر دل عزیز مرحوم دوست، معروف شاعر واہل قلم اور مربی ومصلح حافظ وقاری نعیم الحق نعیم (متوفی ۱۹۹۹ م) سابق مدیر ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، کے عزیز وقرابت دار، ان کی عزت

ووقار کے امین وپاسدار ہیں اور سیرت وصورت میں بھی بڑی حد تک ان کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، ہر اعتبار سے ان کی بہترین یادگار ہیں، ہماری اور مرحوم کے ہم جیسے بے شمار ارادت مندوں اور دوستوں کی امیدوں کا مرکز ہیں۔

جہاں ہماری ڈھیروں مخلصانہ دعائیں ان کے ساتھ ہیں، وہاں بے شمار علمی تمنائیں بھی ان سے وابستہ ہیں، امید ہے کہ وہ ان کی پاسداری اور اپنے ''عہدِ الفت'' سے وفاداری کریں گے۔ اِن شاءاللہ! وفقه الله لما يحبه ويرضاه

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر ﷾

اِسلام آباد

٦/شعبان ١٤٢٨ھ، ٢٠/اگست ٢٠٠٧

تقریظ

حافظ عبدالحمید ازھر ﷾

الحمد لله رب العلمين، أنزل على عبده الكتاب ليبين للناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفكرون، والصلاة والسلام على البشير النذيرسيد الأنبياء وخاتم المرسلين نبينا محمد وعلى آله الطيبين الطاهرين وأزواجه أمهات المؤمنين وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمدا عبده ورسوله۔

اللّٰهم صل على محمد النبي الأمّي وأزواجه أمهات المؤمنين وذريته وأهل بيته كما صليت على ال إبراهيم إنك حميد مجيد،أما بعد :

اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ اور مقبول دین صرف اسلام ہے۔اور اسلام کا قصر رفیع وجمیل اللہ رب العزت کی نازل کردہ کتاب ہدیٰ اور حدیث وسنت مصطفیٰ ﷺ کی اساسِ محکم اور اصلِ ثابت پر استوار ہے۔کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم ترین بندے اور آخری رسول حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ پر بذریعہ وحی نازل فرمایا اور اس کا سلسلہ اِسناد یوں بیان فرمایا:

﴿ وَ اِنَّهٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۞ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ۞ عَلٰی

قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۝﴾

(الشعراء : ۱۹۳-۱۹۵)

''اور یہ کتاب پروردگار عالم کی نازل کردہ ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے، یعنی اس نے اسے تمہارے دل پر اِلقاء کیا، تاکہ تم (منصب رسالت کے عالی مقام حاملین) ڈر سنانے والوں میں سے ہو جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کی آخری اور افضل ترین کتاب بھی کتب سابقہ کی طرح عوام الناس پر براہ راست نازل نہیں ہوئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور سنت محکمہ کے مطابق حضور ختمی مرتبت، رسول امی ﷺ پر نازل ہوئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ اس عالم اسباب میں انسانیت کو لاحق امراضِ مزمنہ کا علاج شافی اس کے سوا نہ تھا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾

(البينة : ۱-۳)

''کافر یعنی کتابی اور مشرک کفر سے باز آنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آجاتی، یعنی اللہ کی طرف سے رسول جو پاک اوراق کی تلاوت کرتا ہے، جن میں محکم فرائض ہیں''۔

جناب رسول اللہ ﷺ کا وظیفہ صرف تلاوت آیات تک محدود و منحصر نہیں، بلکہ ان کی تعلیم و توضیح اور ان پر عمل کی صورت بیان کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ إِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الجمعة:۲)

''وہی ہے جس نے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا، جو ان کے سامنے اس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔

بلکہ جناب رسالت مآب ﷺ پر کتاب نازل کرنے سے مطلوب ومقصود بھی یہی تھا کہ آپ قرآن کی علمی تفسیر اور عملی تعبیر بیان کریں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل : ٤٤)

''اور ہم نے تم پر یہ کتاب اس لئے نازل کی کہ جو ارشادات لوگوں کیلئے نازل ہوئے ہیں، تم انہیں کھول کر بیان کردو، تاکہ وہ غور کریں''۔

اور یہ حقیقت بھی قرآن مبین نے مکمل وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہے کہ قرآن ہی کی طرح اس کا بیان وتفسیر اور حکمت یعنی اس کی صورت تعمیل بھی بذریعہ وحی نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے اس کی بھی تلاوت وتبلیغ فرمائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ (القيمة : ١٦-١٩)

''تو (دوران وحی) اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے کہ اس کو جلدی حاصل کرلے، بلکہ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور اسے آپ سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے، اس لئے جب ہم وحی پڑھا کریں، تو تم اس کو سنا کرو، پھر اس کا بیان اور تشریح بھی ہمارے ذمے ہے''۔

نیز فرمایا :

﴿وَ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ

كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء:١١٣)

''اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ کچھ سکھایا، جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے''۔

قرآن نے یہ شہادت بھی دی کہ جناب رسول اللہ ﷺ دین کے بارے میں جو بھی کلام کرتے ہیں، وحی کی ترجمانی کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم: ٣، ٤)

''اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، وہ تو صرف وحی ہے، جو اس پر نازل ہوتی ہے''۔

اسی طرح آپ ﷺ دین سے متعلق جو بھی کام کرتے ہیں، اس میں بھی وحی کار فرما ہوتی ہے اور وہ صرف تعمیل کرتے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے :

﴿قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ﴾ (الأعراف: ٢٠٣)

''کہہ دو کہ میں تو صرف اسی حکم کی پیروی کرتا ہوں، جو میرے پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی میرے پاس آتا ہے''۔

اسی طرح آپ ﷺ کی ''تقریر'' کو مبنی بر وحی قرار دیا گیا، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ (ال عمران: ١٧٩)

''اللہ مومنوں کو اس حال میں ہرگز چھوڑے گا نہیں، تا آنکہ پاک کو ناپاک سے الگ نہ کر دے اور اللہ کا یہ بھی قانون نہیں کہ تم سب کو غیب پر مطلع کر دے، البتہ اللہ (اس کام کے لیے) اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا انتخاب کر لیتا ہے، تو تم

اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اگر ایمان لاؤ گے اور پرہیز گاری کرتے ہوئے اس کی نافرمانی سے بچو گے، تو تم کو اجر عظیم ملے گا''۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی جملہ تعلیمات وہ کتاب کی صورت میں ہوں یا حکمت کی شکل میں ان پر عمل لازم ہے اور اس کی سخت تاکید اور ایسا نہ کرنے پر وعید شدید کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ (النساء : ۸۰)

''جس شخص نے رسول کی فرماں برداری کی، تو اس نے درحقیقت اللہ کی فرماں برداری کی اور اگر کسی نے نافرمانی کی، تو اے رسول! ہم نے تمہیں ان کا نگہبان نہیں بنا کر بھیجا''۔

اور آپ ﷺ کے جملہ اقوال، افعال اور تقریرات کو حجت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (الحشر : ۷)

''سو پیغمبر تمہیں جو چیز دیں، وہ لے لو، اور جس سے منع کریں، اس سے باز رہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

اس لئے اہل ایمان کا خاصہ اور طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے جملہ احکامات کی بلا چون وچرا تعمیل کرتے ہیں اور سمع وطاعت کو اپنا شعار بناتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ (النور: ۵۱، ۵۲)

''مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ وہ ان میں فیصلہ کریں، تو کہیں کہ ہم نے حکم سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا، تو ایسے لوگ ہی مراد کو پہنچنے والے ہیں''۔

معاندین کی اسلام سے برگشتگی کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ جانتے تھے کہ ایمان لانے اور حلقہ بگوش اسلام ہونے کی صورت میں انہیں رسول ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا پابند ہونا ہوگا، اور ان کی جاہ پسند طبیعتیں اس سے اِبا کرتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝ أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِن بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ﴾

(القمر: ٢٤،٢٥)

''ثمود نے ہدایت دینے والوں کو جھٹلایا اور کہا بھلا ایک آدمی جو ہمیں میں سے ہے، ہم اس کی پیروی کریں؟ یوں ہو تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے، کیا ہم سب میں سے اسی پر وحی نازل ہوئی، (نہیں) بلکہ یہ جھوٹا اور خود پسند ہے''۔

گویا وہ اس سنت الٰہیہ پر معترض تھے، جو کتاب وحکمت کے نزول وتبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے اختیار کی تھی، اور ان کی خواہش تھی کہ ان میں سے ہر ایک صاحب کتاب ہو، تاکہ کسی کی اطاعت کا ذمہ دار نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ۝﴾(الأنعام: ١٢٤)

''اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے، تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی

رسالت اللہ کے پیغمبروں کو ملی ہے، جب تک اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے، ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، اللہ خوب جانتا ہے کہ اس نے اپنی رسالت کہاں رکھنی ہے، عنقریب ان مجرموں کو اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب پہنچے گا، اس لئے کہ مکاریاں کرتے تھے"۔

قرآن حکیم نے بصراحت تمام واضح کیا ہے کہ ان کے اس تمرد اور استکبار کا سبب اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان کا فقدان ہے، چنانچہ فرمایا :

﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِىءٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ﴾(المدثر : ۵۲،۵۳)

"اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے پاس کھلی ہوئی کتاب آئے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، حقیقت یہ ہے کہ انہیں آخرت کا خوف نہیں"۔

کچھ لوگوں نے "مسلک اعتدال" کے نام پر یہ چاہا کہ ہم اللہ کی کتاب کو تو مان لیں گے، لیکن رسول کے احکام نہیں مانیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پکے کافر قرار دیا اور ان کے دلوں کا بھید کھول کر رکھ دیا :

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ حَقًّا وَ أَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾(النساء : ۱۵۰-۱۵۱)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں، یہی لوگ

حقیقی کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ایک رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

جب کہ ایک سچا مومن جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر یقین رکھتا ہے، اسوۂ رسول کی پیروی کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے سرتابی تو کجا ان کی اطاعت میں تامل بھی نہیں کر سکتا۔

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (الأحزاب : ٣٦)

"اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کا کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں، تو اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے، وہ صریح گمراہ ہو گیا"۔

نیز اطاعت رسول سے سرتابی کو بصراحت تمام کفر قرار دیا اور فرمایا :

﴿قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾

(آل عمران: ٣٢)

"کہہ دو ! اللہ اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر وہ منہ موڑیں، تو بے شک اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا"۔

نیز فرمایا:

﴿يٰۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ أَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ أَحْسَنُ تَأْوِيْلًا﴾(النساء : ٥٩)

"اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں (یعنی علماء و حکام) پھر اگر

کسی بات پر تم میں اختلاف واقع ہو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی زیادہ اچھا ہے''۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر یقین والا شخص تو ہر لحظہ فکر مند ہوگا کہ اللہ کے حضور ایسے اعمال لے کر حاضر ہو، جو صالح ہوں اور اس کے مالک ومولیٰ کو پسند ہو اور روزِ محشر ندامت سے بچ سکے، تو ایسے شخص کے لئے نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور کاملہ کی اتباع سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱)

''بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو''۔

یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے سلف وخلف میں قرآن کے ساتھ ساتھ اس کے بیان یعنی سنت مطہرہ کو ہمیشہ حجت مانا گیا۔ صحابہ کرام نے اسی اتباع سنت کی بدولت اللہ کی جانب سے ﴿اَلسَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ﴾ کا لقب پایا اور فلاح کامل کی سند پائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَ الْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْ أُنْزِلَ مَعَهٗ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

''وہ جو محمد رسول اللہ ﷺ کی، جو نبی اُمّی ہیں، پیروی کرتے ہیں، جن کے

اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور ان پر سے بوجھ اور طوق، جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں، تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا، اس کی پیروی کی، وہی مراد پانے والے ہیں"۔

نبی اکرم ﷺ کے **الرفیق الأعلی** سے جا ملنے کے بعد صحابہ کرام، خلفاء راشدین کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنت مصطفیٰ کی پیروی کرتے رہے، چنانچہ مشہور تابعی حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا، تو وہ کتاب اللہ میں دیکھتے، اس میں مل جاتا، تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ پاتے اور اس معاملہ میں انہیں رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ہوتا، تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر ایسا نہ کر پاتے، تو مسلمانوں سے کہتے: میرے پاس یہ مسئلہ پیش ہوا ہے، تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں کیا فیصلہ فرمایا؟ بسا اوقات یوں ہوتا کہ بہت سے لوگ اس مسئلہ میں نبی اکرم ﷺ کا فیصلہ ذکر کرتے، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے:

"اللہ کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ پیدا کیے، جو ہمارے لئے ہمارا دین محفوظ کیے ہوئے ہیں"۔ (سنن دارمی)

اور اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین **بالإحسان** رحمہم اللہ کے آثار کا استقصاء کرنے کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔

ائمہ مجتہدین میں سے ہر ایک سے سنت مشرفہ پر عمل کا وجوب تواتر سے ثابت ہے، **امام ابوحنیفہ** رحمہ اللہ کا قول: " **إذا صح الحدیث فهو مذهبی** " زبان زد

خاص وعام ہے، امام مالک رحمہ اللہ تو اپنے درس کا آغاز ہی یہ کہہ کر کرتے:

"ما من أحد إلا ويؤ خذ من قو له وير دعليه إلا صا حب هذا القبر"

''ہر ایک کی بات مانی بھی جاسکتی ہے اور رد بھی کی جاسکتی ہے، سوائے اس قبر والے کے''، اور قبر شریف کی طرف اشارہ کرتے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف "الرسالة" تو سنت کے مقام اور اس سے استفادہ کی صورتوں کے بیان نیز اخبار آحاد کے نام پر احادیث صحیحہ کا اہمال کرنے والوں کے شبہات کے ازالے میں الہامی تحریر ہے۔

بیان قرآن کی کیفیات کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومنه ما أحكم فر ضه بكتا به وبين كيف هو على لسا ن نبيه مثل عدد الصلا ة والز كا ة و وقتها وغير ذلك من فر ائضه التى أنزل من كتا به"۔

"ومنه ما سنّ رسو ل الله ﷺ مما ليس لله فيه نص حكم وقد فرض الله فى كتا به طا عة رسو له ﷺ والإ نتها ء إلى حكمه فمن قبل عن رسو ل الله فبفر ض الله قبل"۔ (الرسا لة : ٢٢)

''بیان احکام کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی امر کی فرضیت تو صراحت سے ذکر فرما دی، تاہم اس کی ادائیگی کی کیفیت اپنے نبی کی زبان سے کرائی، مثلاً نمازوں کی تعداد، زکاۃ کے (احکام) اور اس کی مقادیر اور اسی طرح کے دیگر فرائض جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے''۔

''اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک طریقہ مقرر فرمایا، اس امر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص تو وارد نہیں، تاہم معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے رسول ﷺ کی اطاعت

فرض کی ہے، تو جس نے جناب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی، اس نے اللہ تعالیٰ کا عائد کردہ فرض ادا کیا"۔

رہے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تو ان کا تو لقب ہی "إمام أهل السنة والجماعة" ہے۔

قرون مفضلہ ومشہود لھا بالخیر کے بعد کی تاریخ تشتت وافتراق کی تاریخ ہے۔ اہل حدیث واہل الرأی کا اختلاف سامنے آیا، فقہی مکاتب فکر وجود میں آئے، سیاسی دھڑے بندی ہوئی، شریعت وطریقت کی تقسیم اس پر مستزاد ہوئی، لیکن اس تمام ہنگامہ آرائی اور سرد وگرم جنگوں کے ماحول میں بھی سنت کی تشریعی حیثیت کبھی متنازعہ نہیں ہوئی۔

اہل سنت والحدیث تو اس کے ہمیشہ علمبردار رہے "وکانوا أحق بها وأهلها" شیعہ، خوارج، معتزلہ، متکلمین، متصوفین کسی نے بھی اس کی حجیت میں کلام نہیں کیا، بلکہ سب اپنے اپنے موقف کی تائید میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ احادیث سے استدلال کرتے رہے اور ان میں سے ہر گروہ کی مؤلفات اس امر کا بیّن ثبوت ہیں۔ بعض احادیث کی تصحیح وتضعیف پر تو اختلاف ہوا، لیکن فی الجملہ حدیث وسنت کی حجیت اور اس کی تشریعی حیثیت کبھی متنازع فیہ نہیں ہوئی۔

یہاں تک کہ علم کلام کی چھاپ رکھنے والی کتب اصول فقہ میں بھی سنت مطہرہ کو کتاب اللہ کا قرین اور مسائل شرعیہ میں غیر متنازعہ طور پر حجت ہونا تسلیم کیا گیا ہے، سعد الدین تفتازانی متأخرین میں بہت بڑا نام ہے، رقمطراز ہیں :

"فإن قلت فما بالهم يجعلون من مسائل الأصول إثبات الإجماع والقياس للأحكام ولا يجعلون منها إثبات الكتاب والسنة لذلك؟ قلت : لأنّ المقصود بالنظر في الفن هي الكسبيات المفتقرة إلى الدليل وكون الكتاب والسنة حجة بمنزلة البديهي في نظر

الأصولي لتقرره في الكلام وشهرته بين الأنام بخلاف الإجماع والقياس"۔ (التلويح على التوضيح : ص۲۳)

''اگر تم سوال کرو کہ کیا وجہ ہے کہ علماء اصول اجماع اور قیاس کی حجیت کے اثبات کو مسائل اصول میں سے گردانتے ہیں، لیکن کتاب اور سنت کی حجیت کے اثبات سے تعرض نہیں کرتے اور نہ انہیں مسائل اصول میں سے باور کرتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں کہوں گا: اس فن میں غور وفکر کا موضوع وہ امور ہیں، جن کا تعلق استنباط و استخراج سے، جو دلیل کے محتاج ہوتے ہیں، جب کہ کتاب وسنت کا حجت ہونا تو ایک اصولی کے نزدیک بدیہی امر ہے، جو علم کلام میں مسلّم ہے اور تمام لوگوں میں مشہور ہے، جب کہ اجماع اور قیاس کا یہ معاملہ نہیں ہے''۔

اسی طرح مسلم الثبوت اور اس کی شرح فواتح الرحموت میں ہے :

"إن حجية الكتاب والسنة والإجماع والقياس من علم الكلام لكن تعرض الأصولي لحجية الإجماع والقياس لإنهما كثر فيهما الشغب من الخوارج و الروافض، (خذلهم الله)، أما حجية الكتاب و السنة فمتفق عليها عند الأمة ممن يدعي التدين كافة فلا حاجة للذكر"۔(۱۷/۱ ط حلبي)

''کتاب، سنت، اجماع اور قیاس کی حجیت علم کلام کا موضوع ہیں، تاہم علماء اصول صرف اجماع اور قیاس کی حجیت سے تعرض کرتے ہیں، اس لیے یہی وہ اصول ہیں، جن کے بارے میں خوارج اور روافض وغیرہ احمقوں کی طرف سے شور وشغب کیا گیا ہے، جہاں تک کتاب اور سنت کا تعلق ہے، تو ان کی حجیت ساری امت کے ہاں متفق علیہ مسئلہ ہے، بشرطیکہ وہ دین کے ساتھ نسبت رکھتے ہوں، اس لیے ان کی حجیت سے تعرض کی ضرورت نہیں''۔

کتاب اللہ کی قرین ہونے کے اعتبار سے سنت مطہرہ اسلام کے معاندین کے حملوں کا نشانہ بنی، اس پر داخلی حملے بھی ہوئے اور خارجی بھی، وضعی احادیث کی اشاعت کے ذریعے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش بھی کی گئی اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے طرۂ امتیاز اور سرمایہ افتخار اصول نقدِ حدیث کے بارے میں عدم اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی سعی نامشکور بھی ہوئی ۔کلامی اور درآمدی نظریات سے متاثرہ عقول کا ایقان بھی متزلزل ہوا، جس کے اثرات اصول فقہ کے توسط سے بعض فقہی مکاتب فکر کے فروع تک بھی پہنچے، تاہم اللہ تعالی کا فرمان واجب الإذعان:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾(الحجر:۹)

''بلا شبہ یہ کتابِ نصیحت ہمیں نے نازل کی اور ہمیں اس کے محافظ ہیں''۔

ہر زمانے میں اپنی صداقت کا اعلان کرتا رہا اور ہر عہد میں ایسے جہابذہ وعباقرہ پیدا ہوئے، جنہوں نے شکوک وشبہات اور سازشوں کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا اور قرآن کے ساتھ ساتھ سنت پر بھی اہل ایمان کا ایمان روز افزوں رہا :

﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَ إِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾(الحج : ٥٤)

''اور یہ بھی مقصود تھا کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے، وہ جان لیں کہ یہ یعنی وحی تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے،تو وہ اس پر ایمان لائیں اوران کے دل اللہ کے حضور جھک جائیں اور جو لوگ ایمان لائے ہیں،اللہ ان کو سیدھے رستے کی ہدایت کرتا ہے''۔

چناچہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام محمد بن اسماعیل البخاری، امام یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، امام ابن قتیبہ، امام محیي السنة البغوی، حافظ ابن حزم الأندلسی، شیخ الإسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم، علامہ محمد بن ابراھیم

الوزیر، رحمهم اللہ وغیرھم وکثیر ماھم، سب نے اپنے اپنے ادوار میں اس زمانے کی ضرورت کے مطابق سنت مطہرہ کے حظیرۂ قدس کا دفاع کیا، جزاھم اللہ عن الإسلام والسنة خیر الجزاء۔

بلا شبہ یہی وہ مقدس گروہ ہے، جس کی نسبت إمام أهل السنة والجماعة احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا :

''اللہ کا شکر ہے جس نے انقطاع نبوت ورسالت کے زمانے میں اہل علم میں سے ایسے افراد پیدا فرمائے کہ جو گمراہی میں گرفتار افراد کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے ہیں، اور لوگوں کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکلیف اور اذیت پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی کتاب کے ذریعے مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور بصیرت سے محروم لوگوں کو اللہ کے نور کی بدولت بصیرت سے بہرہ مند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس گروہ نے کتنے ہی کشتگانِ ابلیس کو زندہ کیا اور بھٹکتے ہوئے کتنے ہی گم کردہ راہوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا، ان حضرات نے انسانوں کو کس قدر فیض یاب کیا اور اس کے بدلے میں لوگوں کا ان سے سلوک کس قدر برا ہے۔

یہی جماعت ہے جو غلو پسندوں کی تحریف، باطل پرستوں کی دروغ بافی اور جاہلوں کے لفظی ہیر پھیر کو کتاب اللہ سے دور رکھتے ہیں''۔(مقدمة الرد على الجهمية)

اور ان حضرات کے وجود مسعود کے توسط سے حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ذیشان حرف بحرف پورا ہوا کہ :

''إن اللہ تعالی یبعث لھذہ الأمة علی رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا''۔(أبو داود)

''اللہ تعالی اس امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے افراد پیدا فرماتا رہے گا، جو ان کے لیے ان کے دین کی تجدید واحیاء کرتے رہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ کے فرمان عالی شان ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾(الواقعة: ٤٠)

اور بفحوائے فرمان نبوی "یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله "

یہ سلسلہ آج بھی پوری آب وتاب سے جاری ہے اور ذہبی عصر امام عبد الرحمن بن یحییٰ المعلمی کی تالیفات بالخصوص "الأنوار الکاشفة" اور "التنکیل"، علامہ محمد عبدالرزاق حمزہ کی تصنیف لطیف "ظلمات أبی ریه"، مولانا شرف الدین محدث دہلوی کی تالیف "ایک اسلام"، محدث عصر شیخ محمد ناصر الدین البانی کی جملہ مؤلفات، حجۃ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل سلفی کے رسائل، اس زمانہ میں طراز اول کے نمونہ صادق شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز کے مقالات اور بیہقی زماں، غزالی دوراں، محدث عصر، مسند پنجاب، استاذ الأساتذه، العالم الألمعی، الفقیه العبقری، حافظ محمد گوندلوی کی تصنیف "دوام حدیث"، ان مجددین علوم نبوت کی مسیحا نفسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں ـ رحمه الله رحمة واسعة ۔

ان میں سے ہر کتاب، مستطاب اور لاجواب ہے، تاہم بلا خوف تردید اور ادنی تامل کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ" دوام حدیث" اس سلسلۃ الذہب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل کتاب ہے۔

اس تصنیف لطیف میں حضرۃ العلام محدث گوندلوی رحمہ اللہ نے ہمارے زمانے کے عجوبہ روزگار گروہ کی حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے، جو پوری امت کے متفق علیہ اور اجماعی موقف سے انحراف ہی نہیں بغاوت کر کے صرف یہی نہیں کہ سنت مطہرہ کو حجت نہیں سمجھتا، بلکہ خاکش بدہن اسے دین کے خلاف سازش قرار دیتا ہے اور اس کے باوصف اسے یہ اصرار بھی ہے کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتا ہے! ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾

جو حضرت "رواروی" منکرین حدیث وسنت کو معتزلہ کا جدید ایڈیشن قرار دیتے ہیں، انہوں نے "علماء وفضلاء" کے اس غریب خوردہ گروہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا

اور نہ اس طائفہ فارقہ (منکرین سنت) کے اصول پر غائر نظر ڈالی، وگرنہ ان پر مخفی نہ رہتا، وہ صرف منکرین سنت نہیں، بلکہ واضح طور پر منکرین دین ہیں اور ان کے رؤساء وکبراء کے مسئلہ قرآنی نصوص سے ناواقفی، قرآن میں اطاعت رسول ﷺ کی تاکید سے لاعلمی یا ان کے معانی تک نارسائی نہیں ہے، بلکہ حضرت حافظ صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ فتنہ خالصۃً باطنیت ہے، جس کا خمیر اسلام دشمنی سے اٹھا ہے اور جس کے تہ منظر میں وہی نخوت اور استکبار کارفرما ہے، جس کے زیر اثر ان کے اسلاف نے کہا تھا کہ:

﴿لَوْ لَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ نَرٰى رَبَّنَا﴾ (الفرقان : ۲۱)

اور جن کے ہواجس اور خواہشات نفس کو قرآن حکیم نے یہ کہہ کر بیان فرمایا :

﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً﴾ (المدثر: ۵۲)

اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہ لانے کی پاداش ہے کہ اس گروہ کے منتسبین جناب رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کو سعادت اور ذریعہ نجات باور کرنے کی بجائے اس سے بدکتے ہیں :

﴿كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾

حضرت نے ان کے مرض کی بالکل درست تشخیص فرمائی کہ یہ لوگ بظاہر ختم نبوت پر ایمان کا دم بھرتے ہیں، لیکن درحقیقت خود مقام نبوت پر براجمان ہونا چاہتے ہیں۔ ان کا مذموم ومشئوم مقصد صرف یہ ہے کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو سرمایہ یقین سے محروم کرکے اس کے بدن سے روح محمد نکال سکیں۔ خیبهم الله وخذلهم وقد فعل!

اس مذموم مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے لغوی مغالطوں کا سہارا لیا ہے، حضرت حافظ صاحب نے ان مغالطوں کو ھباء منثورا کر دیا اور ظن کے مختلف معانی

16134

بیان کرنے کے ساتھ مدارج علم اور ذرائع علم کا تفصیلی جائزہ پیش کر دیا ہے اور ایمان افروز دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ حدیث نبوی کا معظم حصہ علم قطعی اور یقینی کا سرمایہ ہے۔ وللہ درہ!

''دوام حدیث'' صرف بیان حجیت حدیث ہی نہیں، بلکہ بیان عظمت حدیث اور بیان ضرورت حدیث بھی ہے۔ ''دوام حدیث'' حدیث کے وجوہ اعجاز کا بیان ہے اس لیے کہ حدیث بیان ہے قرآن کا، جس کا امتیازی وصف ہے کہ وہ ایسا آفتاب ہے جو خود ہی دلیل آفتاب ہے ﴿وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ﴾ (هود: ١٧)

اس کی صداقت اور اس کے کلام اللہ ہونے کی شہادت اس کے اندر موجود ہے، اور وہ اس نبی اُمّی لقب کا کلام اور بیان ہے، جسؐ کے بارے میں کہا گیا، وصدق من قال:

لو لم يكن فيه آيات مبينة

كانت بديهيته تاتيك بالخبر

''اگر ان میں واضح معجزات نہ بھی ہوں، تو بھی ان کی پہلی جھلک ہی تمہیں ان کی صداقت بتانے کے لیے کافی ہے۔''

اسی طرح حدیث بذات خود دلیل ہے کہ یہ اسی کا کلام ہے اور اسی کی تعلیم ہے، جس کا وصف یہ ہے :

﴿وَ مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْیٌ يُّوْحیٰ﴾ (النجم : ٣، ٤)

چنانچہ احادیث میں بیان شدہ عبادات وفرائض کا طریق پر وقار، اذکار مسنونہ میں مضمر گنجہائے معرفت اور ادعیہ مسنونہ کا سوز وگداز، کیا یہ دلیل نہیں ہے کہ یہ اسی قلب اطہر سے صادر ہوئے ہیں، جو مہبط وحی اور مطلع انوار تنزیل ہے؟

غرضیکہ یہ سِفر جلیل علوم و معارف حدیث کا خزینہ ہے اور ایک صاحب نظر اسے دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا :

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

علامہ زمان کی اس عظیم الشان تالیف جس کی نظیر اس کے نظائر میں نہیں، اس کے متعلق ایک ہیچمدان کا کچھ کہنا، جسارت کے زمرے میں آتا ہے۔لیکن وقت کے سلطانِ علم کی دربانی اور علوم ومعارف کے اس کاروان کی حدی خوانی بھی ایک اعزاز ہے، جس کے لیے اللہ کا شکر گزار اور عزیز مکرم، فاضل جلیل اور عالم نبیل حافظ شاہد محمود وفقہ اللہ کا ممنون ہوں، جن کی وساطت سے یہ اعزاز نصیب ہوا۔

حافظ شاہد محمود صاحب تمام طلاب علم خصوصاً حضرۃ العلام محدث گوندلوی کے معارف کے شائقین کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس گنجینہ معارف کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے سعی مشکور فرمائی اور اس پر مفید حواشی لکھ کر اس کی افادیت کو آسان اور کئی چند کردیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت العالم الربانی والفقیہ اللوذعی والفاضل الألمعي حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی جملہ تالیفات کو جو زبان اردو میں ہے، عربی زبان میں منتقل کیا جا سکے۔کیوں کہ جب سے انہوں نے کتب تراجم میں حافظ صاحب کے بارے میں پڑھا ہے، وہ زبان حال سے ہی نہیں زبان قال سے کہہ رہے ہیں :

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

مجھے یقین ہے کہ دین سے تعلق رکھنے والا جو شخص بھی حضرۃ العلام کی اس تصنیف لطیف کا مطالعہ کرے گا، میری اس دعا پر آمین ثم آمین کہے گا کہ اللہ تعالی مؤلف علام کو سلف امت کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے۔

اور پوری لگن کے ساتھ اس سفر جلیل کی خدمت کرنے اور طلاب علم تک اسے

پہنچانے پر اللہ تعالیٰ حافظ شاہد محمود صاحب اور ان کے جملہ رفقاء کی اس خدمت کو شرفِ قبول بخشے، ان کے علم وعمل میں برکت فرمائے اور اسلام اور علوم حدیث کی طرف سے انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه أجمعين

خادم العلم والعلماء

حافظ عبد الحمید ازہرؔ

محمدی مسجد ، راولپنڈی

۲۴رشعبان ۱۴۲۸ھ،۸رستمبر ۲۰۰۷ء

دیباچہ

''دو اسلام'' کا دیباچہ پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی تربیت شروع سے ایسے ماحول میں ہوئی ہے، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ حقیقی اسلام سے بالکل ناآشنا رہے اور مجموعۂ رسوم کو اسلام سمجھ کر اس کا ذمہ دار حدیث کو ٹھہرائے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کیلئے مختلف علماء وصوفیاء کے ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی، سینکڑوں واعظین کے وعظ سنے، بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں، اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلامی تعلیمات کا ماحصل یہ ہے:

① فرائض خمسۃ یعنی توحید کا اقرار اور صلوٰۃ، زکوٰۃ وصوم اور حج کی بجا آوری۔

② اذان کے بعد درود شریف پڑھنا۔

③ مختلف رسومات مثلاً جمعرات، ختم، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا۔

④ قرآن کی عبارت پڑھنا۔

⑤ اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا۔

⑥ اچھل اچھل کر ہُوحق کا ورد کرنا۔

⑦ قرآن اور درود کے ختم کرانا۔

⑧ نجات کیلئے کسی مرشد کی بیعت کرنا۔

⑨ مُردوں سے مرادیں مانگنا۔

⑩ مزاروں پر سجدے کرنا۔

⑪ تعویذوں اور گنڈوں کو مشکل کشا سمجھنا۔

⑫ غلیظ لباس کو پیغمبری لباس سمجھنا۔

⑬ سڑکوں پر اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا۔

⑭ آنحضرت ﷺ کو عالم الغیب، نیز حاضر و ناظر سمجھنا۔

⑮ کسی بیماری یا مصیبت سے نجات حاصل کرنے کیلئے ملاّ جی کی ضیافت کرنا۔

⑯ گناہ بخشوانے کیلئے قوالی سننا۔

⑰ غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا۔

⑱ امام ابوحنیفہ کی فقہ پر ایمان لانا۔

⑲ صحاح ستہ کو وحی سمجھنا۔

⑳ تمام علومِ جدیدہ مثلاً طبیعیات، ریاضیات، اقتصادیات اور تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا۔

㉑ غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا۔

㉒ صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا۔

㉓ ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت سے نہیں، بلکہ دعاؤں سے کرنا۔ مثلاً سوتے وقت یہ دعا پڑھنا ...... اللهم باسمك أموت وأحيي...... خواب میں خواجہ خضر کی زیارت ہوگی۔ اور جاگو تو یہ دعا پڑھو ...... بسم الله الذي أحياني بعد ما أماتني ...... تاکہ حوریں تمہارا منہ چاٹیں۔ (الخ) [1]

افسوس! مصنف نے عمر عزیز کے چودہ برس فضول ضائع کر دیئے۔ ہمیں واقعی دکھ ہو رہا ہے کہ انہوں نے درس نظامی کی تکمیل کر کے اسلام کو اگر یہی کچھ سمجھا ہے، جو انہوں نے بیان فرمایا ہے، تو اس سے یہی بہتر تھا کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کی

[1] دو اسلام: ١٤

بجائے کوئی اور چھوٹا موٹا کام کر لیتے!

ہاں تو جناب! درس نظامی کی کتابوں میں آپ نے کہیں بھی جہاد کا ذکر نہیں پڑھا؟ جبکہ درس نظامی کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ فقہ و حدیث میں جہاد کے احکام و مسائل کثرت سے موجود ہیں۔ اور یہ گناہ بخشوانے کیلئے قوالیاں سننا، مزاروں پر سجدے کرنا، اچھل اچھل کر ھُو حق کرنا، مُردوں سے مرادیں مانگنا وغیرہ وغیرہ، درس نظامی کی کون سی کتاب میں آپ نے پڑھا ہے؟

حدیث تو ان تمام لغویات کی تردید سے پُر ہے اور آپ یہی باتیں حدیث سے منسوب فرما رہے ہیں!!

اور اس چودہ سالہ طویل مدت میں کیا آپ کی نظر سے ایک رسالہ بھی ایسا نہیں گذرا، جس میں امور متذکرہ کے خلاف مدلل طور پر کچھ لکھا گیا ہے؟

مصنف نے یہاں تو صرف اسی قدر لکھا ہے کہ درس نظامی کی تکمیل کی، لیکن آگے چل کر ''پانچویں باب'' میں لکھتے ہیں:

> ''میرا کوئی شیخ الحدیث نہیں، اگر میں کسی شیخ الحدیث کے اڑنگے پر چڑھ جاتا، تو وہ مجھے اقلیم حقائق سے بہت دور اوہام وظنون کی دنیا میں لے جا کر وہ پٹخنی دیتا کہ میرا سر اور نظریہ دوآب کی طرح چکرا جاتے۔'' (ص:۱۲۰)

مصنف کا مبلغ علم!

اور مصنف کے استدلال کو دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مصنف نے قرآن کی آیات اور احادیث کو لکھتے وقت اچھی طرح ان کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یا ممکن ہے یہ ان کی درس نظامی میں چودہ سالہ محنت کا نتیجہ ہو۔!

چنانچہ ''پانچویں باب'' کے (صفحہ: ۱۱۰) پر قرآن مجید کی ایک آیت اس طرح لکھی ہے:

" إنما أوحي إلي هذا القرآن لأنذركم به"

اور ''بیسویں باب'' (ص: ۳۴۶) میں پھر اس آیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں کسی مقام پر ان الفاظ کے ساتھ یہ جملہ نہیں آیا۔

اسی طرح احادیث لکھتے وقت بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ ''دسویں باب'' میں لکھتے ہیں کہ:

''فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزہ رکھے اور نماز نہ پڑھے۔ "إن الحائض تقضي الصيام ولا تقضي الصلوٰة"...... کہ حائضہ روزے رکھے اور نماز نہ پڑھے...... لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کی ایک زوجہ حضور ﷺ کے ہمراہ معتکف ہوگئیں۔ اس دوران میں انہیں حیض شروع ہوگیا اور حالت یہ ہوگئی کہ جب وہ نماز پڑھتی تھیں، تو ہم ان کے نیچے برتن رکھ دیتے تھے، تاکہ خون مسجد میں نہ گرنے پائے۔

(بخاري: ١/ ٢٢٩، ٢٤٢)

اس عبارت میں مصنف نے تین جگہ غلطی کی ہے:

(۱) فقہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حائضہ روزہ رکھے، حالانکہ ایک ادنیٰ طالبعلم بھی جانتا ہے کہ حائضہ کو نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے، نہ روزہ رکھنے کی۔ بلکہ روزہ کی قضا کا اس میں حکم ہے، نہ کہ نماز کی قضا کا!!

(۲) عربی عبارت "إن الحائض تقضي الصيام ولا تقضي الصلوٰة"[1] کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''حائضہ روزے کی قضا دے اور نماز

[1] دیکھیں: الهداية: كتاب الطهارة، باب الحيض والاستحاضة، (ص: ٣٢)

کی قضا نہ دے"...... آپ کہتے ہیں کہ "روزہ رکھے اور نماز نہ پڑھے!"

④ حدیث [1] میں مستحاضہ کا ذکر ہے، نہ کہ حائضہ کا، مستحاضہ اس عورت کو کہتے ہیں، جس کو ایامِ حیض کے علاوہ خون آتا ہو۔ یعنی بیماری کی وجہ سے خون آتا ہو۔ ایسی عورت پر نماز اور روزہ فرض ہوتا ہے۔ آپ غلطی سے حائضہ سمجھ رہے ہیں۔

احادیث میں تناقض یا......!!

اسی صفحہ میں دو حدیثوں میں تناقض ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حضور فرماتے ہیں: "مجھے رکوع اور سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔" [2] (مسلم) لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور رکوع و سجود میں قرآن کی آیت "سبوح قدوس ربنا ورب الملائکة والروح" پڑھا کرتے تھے۔ [3]

غور فرمایئے! یہ حضرت حدیث پر اور اصحابِ حدیث پر تنقید کرنے چلے ہیں، جن کو یہ بھی علم نہیں کہ یہ جملہ قرآن کی آیت نہیں، اور آپ نہ صرف اسے قرآنی آیت سمجھ رہے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد پر دو حدیثوں میں تناقض ثابت کرنے کی کوشش بھی فرمائی جارہی ہے!!

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الاعتكاف، باب اعتكاف المستحاضة، رقم الحديث(١٩٣٢)، حدیث کے الفاظ یہ ہیں "اعتكفت مع رسول الله صلى الله عليه و سلم امرأة من أزواجه مستحاضة، فكانت ترى الحمرة والصفرة، فربما وضعنا الطست تحتها و هي تصلي"

[2] صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب النهي عن قرأة القرآن في الركوع والسجود ، رقم الحديث(٤٧٩)

[3] یہ الفاظ حدیث میں وارد دعائیہ کلمات ہیں، نہ کہ قرآنی کلمات! چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں: عن عائشة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول في ركوعه و سجوده "سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ " (صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود، رقم الحديث(٤٨٧)

تیرہویں باب میں لفظ ''مغفرت'' کی تحقیق ہے۔ چودھویں باب میں مسئلہ شفاعت...... پندرہویں باب میں قرآن سے متصادم احادیث، سولہویں باب میں غلامی اور اسلام، سترہویں باب میں تقدیر، اٹھارہویں باب میں متضاد احادیث انیسویں باب میں چند دلچسپ احادیث اور بیسواں باب ''صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا......'' کے بیان میں ہے۔

پہلا باب

حدیث میں تحریف

اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا ذکر ہے:

① ''وہ اقوال جو جاہ طلب، خودبین اور شکم پرست لوگوں نے تراش کر آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر دیئے تھے، آج وہ اقوال رسول کے قول میں اس طرح خلط ملط ہو چکے ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے۔

② بعض علماء نے سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی، لیکن معاملہ اس قدر الجھ چکا تھا کہ اسے سلجھانا انسان کی دسترس سے باہر تھا

جس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا: علم کم تھا۔

ب: لکھنے والے محدود تھے۔

ج: ذخائر علم محدود تھے۔

د: صحابہ کی تمام توجہ قیامِ سلطنت، نشر و اشاعتِ اسلام اور تعمیرِ سلطنت پر صرف ہو رہی تھی۔

③ ان کے پاس خود رسول موجود تھا، اور رسول کے بعد آپ کا دیا ہوا مکمل اور اتم ضابطہ حیات یعنی قرآن۔

④ صحابہ نے اقوالِ رسول کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر نہیں لکھا:

ا: قرآن کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے، جب آنحضرت ﷺ نے کتاب و کاغذ کو طلب کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' ❶

قرآن میں ہے کہ دین کامل کر دیا گیا ہے۔ ❷

ب: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کے سوا میرا اور کوئی قول نہ لکھو، اگر کوئی شخص ایسا قول لکھ چکا ہو، تو اسے مٹا دے۔'' (مسلم) ❸

اس فرمان کی دو وجہیں تھیں:

اول: کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں۔

دوم: آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات یاد نہیں رہتی، وہ دوسرے کی کیا یاد رکھے گا۔ حضور کو انسان کی اس فطری کمزوری کا علم تھا، اس لئے آپ ﷺ نے لکھنے سے منع کر دیا۔

---

❶ صحیح البخاري: كتاب المغازي، باب مرض النبي صلى الله عليه و سلم و وفاته، رقم الحديث(٤١٦٩)، صحيح مسلم: كتاب الوصية، باب ترك الوصية لمن ليس له شيء يوصي فيه، رقم الحديث(١٦٣٧)، کتاب اللہ کا اطلاق صرف قرآن مجید پر نہیں، بلکہ احادیث نبویہ پر بھی کیا جاتا ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاري: كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، رقم الحديث(٢٥٤٩)، صحيح مسلم: كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنا، رقم الحديث(١٦٩٧)، صحيح البخاري: كتاب البيوع، باب إذا اشترط شروطا في البيع لا تحل، رقم الحديث(٢٠٦٠)، صحيح مسلم: كتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، رقم الحديث(١٥٠٤) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اپنے اس قول: "حسبنا كتاب الله" سے یہی مراد تھی کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر مبنی جو احکام ہمارے پاس موجود ہیں، وہ ہماری رشد و ہدایت کے لیے کافی ہیں۔

❷ المائدة: ٣

❸ صحيح مسلم: كتاب الزهد، والرقائق باب التثبت في الحديث و حكم كتابة العلم رقم الحديث (٣٠٠٤) حدیث کے الفاظ ہیں: "لا تكتبوا عني و من كتب عني غير القرآن فليمحه وحدثوا عني ولا حرج و من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار"

⑤ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عراق کا قرآن حجازی قرآن سے مختلف تھا۔

⑥ جو چیز لکھی نہ جائے، وہ لازماً پہلے بگڑتی اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔ حضور کا مقصد یہی تھا، جو عمر (رضی اللہ عنہ) قرآن کا ایک لاکھ نسخہ لکھوا سکتا تھا، وہ پانچ چھ ہزار حدیث کا مجموعہ بھی تیار کرا سکتا تھا، کیا انہیں اقوال رسول سے معاندت تھی؟

⑦ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ ایک صبح اٹھے، اسے جلا دیا۔ (تذکرة الحفاظ ذهبي)

⑧ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے احادیث کے لکھنے کا ارادہ کیا۔ مہینہ بھر استخارہ کیا پھر ارادہ ترک کر دیا اور کتاب اللہ سے لوگوں کے منحرف ہونے سے ڈر گئے۔

(جامع بيان العلم)

⑨ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو۔ آئندہ یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے گا، اس لیے تم آنحضرت سے کوئی حدیث بیان نہ کرو، اگر کوئی پوچھے، تو کہو: ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے، اسے جائز سمجھو، اور جو اس نے ناجائز قرار دیا ہے، اسے ناجائز سمجھو!'' (تذكرة الحفاظ ذهبي)

⑩ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا: ''گھر جاؤ اور تمام ذخیرہ احادیث اٹھا لاؤ'' آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔ (طبقات ابن سعد: ٥ / ١٤٠)

اس کی وجہ یہی تھی کہ اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی۔

⑪ مقام حیرت ہے، پھر وہی احادیث جن کو ضائع کر دیا گیا، اڑھائی سو سال بعد امام بخاری، امام مسلم وغیرہ نے ان کو جمع کیا اور ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا......
''هذا أصح الكتب بعد كتاب الله''۔

⑫ چند ایک احادیث جو جمع تھیں، جلا دی گئیں، جو زبانوں پر جاری تھیں، ان میں

ہر لمحہ رد و بدل ہو رہا تھا، بات ایک دن میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ان اقوال پر تو اڑھائی سو برس گذر چکے تھے۔ صحابہ فوت ہو چکے تھے اور بعد میں بچے وہ لوگ جو کہ امام حسین کے قاتل، حضرت علی کے باغی، کعبے کے ڈھانے والے تھے۔ حاکم شرابی، امراء راشی، فقیر پست کردار لوگ، کیا ایسے ماحول (امیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اصلی حالت پر رہنا ممکن تھا؟ بعض صحابہ سے لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

(13) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بڑی تعداد تھی اور ظاہر ہے کہ دونوں راستی پر نہ تھے، پھر رحلتِ رسول کے بعد بعض مرتد ہو گئے تھے اور بعض نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں اور سہو و نسیان کا خطرہ تو ہر وقت تعاقب میں رہتا تھا۔ دو سو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پہ جاری رہیں، ہر نیک و بد کے پاس پہنچیں، الفاظ بدلے، مفہوم بدلا، اضافے ہوئے، لاکھوں نئی حدیثیں وضع کی گئیں۔ امام بخاری نے چھ لاکھ سے صرف ''۲۷۵ے'' کا انتخاب کیا اور باقی کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ آپ نے انتخاب کا معیار راویوں کی صداقت کو قرار دیا، امام بخاری کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے؟

(14) ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص تھا، حسن ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ و مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔

ایک ہی دور کے چند راوی لیکر ذھبی کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں:

(1) ''علي بن حسين'' کے متعلق لکھا ہے:

''كان يصلي في اليوم والليلة ألف ركعة'' (تذکرہ: ٤٦)

کھانے پینے کے آٹھ گھنٹوں کے علاوہ باقی سولہ گھنٹوں میں اتنی رکعات کا پڑھنا محال ہے۔

❷ "مطرّف بن عبداللّٰہ" (وفات ۹۵ھ) کے متعلق لکھا ہے:

"كان رأسا في العلم" (تذكرة: ٥٥)

❸ "محمد بن سيرين" (وفات ۱۱۰ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ:

"عزيز العلم ثقة رأس في الورع" (تذكرة: ٦٧) [1]

دونوں ہم عصر اور دونوں علم میں سردار!

❹ "طاؤس بن كيسان" کے متعلق لکھا ہے:

"كان رأسا في العلم والورع" [2]

❺ "أبو صالح" (وفات ۱۱۰ھ) کے متعلق لکھا ہے:

"من أجلّ الناس و أوثقهم ......" (تذكرة: ٧٨)

❻ "شعبي" کے متعلق لکھا ہے کہ

"ما رأيت أعلم و أفقه منه" (تذكرة: ٧٠)

❼ "عكرمة" (وفات ۱۰۷ھ) کے متعلق لکھا ہے:

"أعلم بكتاب اللّٰه" (تذكرة: ٨٤)

❽ "قاسم بن محمد" (وفات ۱۰۶ھ) کے متعلق لکھا ہے:

"ما رأيت فقيها أعلم من القاسم" (تذكرة: ٨٤)

❾ "عطاء بن أبي رباح" (وفات ۱۱۴ھ) کے متعلق لکھا ہے:

"ما رأيت أفضل من عطاء......" (تذكرة: ٨٤)

---

[1] اصل الفاظ ہیں: غزير العلم......" (تذكرة الحفاظ: ١/ ٧٨(٧٤)

[2] اصل الفاظ ہیں: "كان رأسا في العلم والعمل". (تذكرة الحفاظ: ١/ ٩٠(٧٩)

ظاہر ہے کہ ایک ہی زمانہ کے سب لوگ بے نظیر اور بے مثال نہیں ہو سکتے''

آگے چل کر مصنف نے لکھا ہے:

① ''امام مالک کا بچھو کاٹنے کا واقعہ اور نو سو اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنا، ہر فقرہ اپنی تردید کر رہا ہے۔ نو سو اساتذہ سے پڑھا بھی، پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ نو سو اساتذہ کہاں جمع تھے؟ اگر ایک استاد کے ہاں کم از کم ایک ماہ بھی بسر کیا تھا، تو بھی ان کا زمانہ تعلیم پچھتر برس بنتا ہے۔''

② ''ایک دن حضرت علی نے تمام صحابہ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ اپنے ذخیرہ احادیث کو جلا ڈالے۔''

(مختصر جامع بیان العلم: ۳۳)

③ علامہ ذہبی کہتے ہیں: ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے أبي بن کعب کو روایتِ احادیث پر پیٹا[1] اور اسی جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوذر اور حضرت ابو الدرداء جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا۔

(تذکرة الحفاظ: ۱/ ۷)

ان صحابہ کو سزا اس لئے ملی ہو گی کہ وہ صحیح اور غلط میں امتیاز نہیں کر سکتے ہوں گے۔''

④ ''آج عبداللہ بن مسعود کی طرف سینکڑوں احادیث منسوب ہیں۔ لیکن اَبو عمرو شیبانی بیان کرتے ہیں: میں ان کی خدمت میں برسوں رہا، مگر ان سے کوئی

---

[1] معترض نے ان الفاظ کو نقل کرنے میں صریح بددیانتی کا مظاہرہ کیا ہے، مذکورہ بالا مصدر میں کہیں بھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو روایتِ حدیث پر پیٹنے کا ذکر نہیں۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: " أما إني لم أتهمك و لكني أحببت أن أتثبت"!(تذكرة الحفاظ: ۱/ ۸) حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" و قد كان عمر بن الخطاب رضي لله عنه يكرم أبيًا ويهابه و يستفتيه و لما توفي قال عمر اليوم مات سيد المسلمين"(تذكرة الحفاظ: ۱/ ۱۷)

حدیث نہیں سنی۔" (تذکرة الحفاظ: ۱ / ۱٤)

⑤ " أبواسحاق، مرة سے اور وہ عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب تمہیں حصول علم کی ضرورت ہو، تو قرآن پڑھو، اس لئے کہ اس میں اولین و آخرین کا علم موجود ہے۔" (تذکرة: ۱ / ۱۱٤)

⑥ "ایک شخص نے أُبَيّ بن کعب سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے، فرمایا:

"اتخذ كتاب الله وارضَ به حكما" (تذكرة: ۱ / ۱٥)

⑦ "عبداللہ بن عباس سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں، مگر آپ کی عمر نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت ۱۳ برس تھی۔" (تذکرة: ۱ / ۳٤)

⑧ "ایک مرتبہ کاتبِ وحی زید بن ثابت نے امیر معاویہ کو چند احادیث لکھائیں، منشی لکھتا گیا، آپ نے کاغذ لے کر چیر ڈالا اور کہا: رسول اللہ ﷺ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمایا ہے۔" (جامع بيان العلم: ۳۲)

⑨ ابوموسیٰ اشعری کے استئذان کے واقعہ کے بعد لکھتے ہیں: "خوش قسمتی سے انہیں شہادت مل گئی، ورنہ پٹ جاتے۔" (تذکرة: ۱ / ٦)

⑩ حضرت عبداللہ بن مسعود نے پانی منگوایا اور اس کتاب کو، جسے اسود بن ہلال لے کر گیا اور جس میں احادیث درج تھیں، دھو ڈالا، پھر جلا ڈالا۔" (جامع: ۳۳)

⑪ "ضحاک بن مزاحم (وفات ۱۰۵ھ) فرمایا کرتے تھے:

"وہ زمانہ جلد آ رہا ہے جب احادیث بکثرت ہو جائیں گی۔ لوگ کتاب الٰہی کو ترک کر دیں گے۔ مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی اور وہ گرد و غبار کے نیچے یوں دب جائے گی کہ نظر تک نہیں آئے گی۔" (جامع: ۳۳)

⑫ عبداللہ بن مسعود کے پاس اُسود نے ایک مجموعہ احادیث پیش کیا۔ آپ نے خادمہ سے پانی منگوا کر اس کو دھو ڈالا، پھر فرمایا:

"إن هذه القلوب أوعية فاشتغلوها بالقرآن ولا تشتغلوها بغيره" (جامع:۳۳)

۱۳ ''منصور، مغیرہ اور اعمش کتابتِ حدیث کو گناہ سمجھتے تھے۔'' (جامع : ۳٤)

۱۴ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی طرف جانے والوں کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا: ''عراق والوں کو احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دور نہ پھینکنا۔''

(تذكرة الحفاظ: ٦ ، جامع بيان العلم : ١٧٤)

۱۵ ''حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ رحلت سے صرف تین برس قبل مشرف بہ اسلام ہوئے، لیکن احادیث میں سب سے بازی لے گئے۔ اور احادیث بھی ایسی کہ سارا قرآن ایک طرف اور ابو ہریرۃ کی احادیث دوسری طرف! یہ ایک دفعہ پٹے بھی، مگر روایت سے باز نہ آئے۔'' (پھر وہ مسلم والی روایت جس میں "لا إله إلا الله" پر جنت کی بشارت کا ذکر ہے، بیان کی) اس حدیث پر مصنف نے مندرجہ ذیل اعتراضات کئے ہیں:

ا: نہ صوم، نہ صلوٰۃ، نہ زکوٰۃ، نہ جہادِ اکبر، نہ اصغر۔

ب: پھر حضرت عمر کا حکم کہ ابو ہریرۃ کہتے ہیں کہ

" لقد حدثتكم بأحاديث لوحدثت بها في زمن عمر بن الخطاب لضربني بالدرة" (تذكره :٨)

۱۶ ہمارے موجودہ علماء میں ایک دو بڑی خوبیاں ہیں:

اول: ان کا دامن وضعِ احادیث سے ملوث نہیں۔

دوم: انہیں سرورِ کائنات سے گہری محبت ہے۔

اور ایک دو خرابیاں بھی ہیں۔

⌘ اولاً: یہ کہ ملکہ تنقید سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے صحیح یا غلط میں تمیز نہیں کر پاتے۔

⌘ دوم: یہ کہ وہ اسلاف پرستی اور اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔

شیخ عبدالحق لاکھ چلائیں: "صحاح میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے،" علامہ ابن حجر ہزار کہیں کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں،

(ملاحظہ ہو: الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، صفحہ: ۲۶۸، ۲۷۶)

مصنف کا تردّد:

نیز کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف حدیث کے ماننے نہ ماننے میں متردد ہے، کبھی تو کہتے ہیں:

"اسی طرح ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآنی کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ صحابہ کرام کی جرأت، شجاعت ایثار، سرفروشی، خدمتِ خلق، حرارتِ ایمانی، عشق رسول، تقویٰ اور نظم و ضبط کی حیات انگیز داستانیں سناتی ہیں۔ اس عہد کے تمدن پر مکمل روشنی ڈالتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی کے اسباب کیا تھے؟ اکاسرہ کیوں مٹ گئے؟ قیاصرہ کو کیوں شکست ہوئی؟ مٹھی بھر مسلمان سندھ کے ریگستان سے فرانس کی عشرت گاہوں تک کیسے پہنچ گئے؟ لٹیرے فرمانروا کیسے بن گئے؟ گڈریئے اورنگِ جہانبانی پر کیسے جا بیٹھے؟ وحشی فلسفۂ حکمت کا درس کیسے دینے لگے؟ شرابیوں اور جواریوں میں اس بلا کی پاکیزگی کہاں سے آ گئی؟ بتوں کے پجاری ایک خدا، ایک قبیلہ، ایک مرکز اور ایک نصب العین کے تخیل پر کیسے متحد ہو گئے؟ یہ تمام تفاصیل حدیث سے ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں۔ اور جس سے اب تک سینکڑوں

غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔" (بیسواں باب : ۳۴۳)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"کیا سارے قرآن میں حدیث کا ضمناً بھی کہیں ذکر ہے؟ اگر نہیں ہے تو آپ اسے ہمارے ایمان کا جزو کیسے بنا رہے ہیں؟" (صفحہ: ۱۰۰)

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

"لیکن حدیث! توبہ ہی بھلی، اس کا تو وہ ستیاناس ہوا کہ اس سے زیادہ محرّف، بریدہ، تراشیدہ اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پر موجود نہیں۔"

(صفحہ:۱۰۸)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا احادیث کی بدولت ہوا اور ہم سب حدیث کے اس گراں بہار ذخیرہ پر ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔" (صفحہ:۱۹۹)

ان تحریروں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ڈرامائی انداز میں لکھ رہے ہیں۔ حقیقت سے نقاب اٹھانا، ان کے پیش نظر نہیں۔ چنانچہ اپنے متعلق خود مصنف لکھتے ہیں:

"اور آج جب کہ میری عمر ۴۷ سے کچھ اوپر ہو چکی ہے، علم کے کئی منازل طے کر چکا ہوں، متانت، حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی، مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پوری طرح نہیں بچ سکا۔" (صفحہ:۱۲۱)

مصنف نے حدیث کا مطالعہ کرتے وقت دماغ سے کام نہیں لیا، جب کسی غلط فہمی کی بناء پر یہ سمجھا کہ یہ حدیث میرے مذاق کے مطابق ہے، فوراً اپنی طرف سے ترجمہ

کرکے لکھ دی۔ چنانچہ متضاد احادیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آنحضرت ﷺ نے عورتوں کے ایک مجمع کو خطاب کیا۔ دورانِ تقریر میں فرمایا ''جو عورت تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے نار جہنم سے بچا لے گا۔'' ایک عورت کہنے لگی، ''اور دو بچوں والی؟'' فرمایا: دو والی بھی جنت میں جائے گی۔'' (بخاري: ۱/۲۰، دواسلام: ۳۰۵)

یہ ہے مبلغ علم!! حدیث میں بچوں کی موت پر صبر کا ذکر ہے اور اسی پر اجر کا بیان ہو رہا ہے[1] اور آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بچے جننے پر جنت مل رہی ہے۔ سبحان اللہ!

مندرجہ بالا باتوں کا جواب دینے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے بارہ میں محدثین نے جو کوششیں فرمائی ہیں، ان کا مختصر جائزہ لیا جائے

اس ذیل میں ہم تین امور کو زیر بحث لائیں گے:

1. حقیقت حدیث۔
2. حجیت حدیث۔
3. حفاظت و کتابت حدیث۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم، رقم الحديث(۱۰۱) ، صحيح مسلم: كتاب البر و الصلة، باب فضل من يموت له ولد فيحتسبه، رقم الحديث(۲٦۳۳)

۱

حقیقت وحجیت حدیث

حدیث کی تعریف:

حدیث اصل میں رسول اللہ ﷺ کے فعل، قول، آپ ﷺ کی تقریر اور آپ ﷺ سے متعلقہ امور کا نام ہے۔

افعالِ رسول کی اقسام:

آپ ﷺ کے فعل کی دو قسمیں ہیں:

اول: وہ امور جن کا تعلق آپ ﷺ کی عادتِ مبارک سے ہے۔

دوم: وہ کہ جن کا تعلق عبادت سے ہے۔

انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہوتے ہیں، اس واسطے ان کے افعال سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلاں کام جائز ہے، بشرطیکہ اس فعل کے متعلق یہ ثابت نہ ہو کہ پیغمبر (نبی کریم ﷺ) کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تردید بھی وارد نہ ہوئی ہو۔

اقوالِ رسول کی اقسام:

اور آپ ﷺ کے قول کی بھی دو قسمیں ہیں:

ا: امر و نہی۔

ب: اخبار، واقعات، ترغیبات اور فضائل و مناقب وغیرہ۔

امر میں اصل ایجاب اور نہی میں اصل تحریم ہے، جیسے قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ ❶

”جو نبی کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، ان کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ وہ فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، یا عذاب الیم کی گرفت میں نہ آ جائیں۔“

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ﴾ ❷

”کسی مومن مرد یا عورت کو اختیار نہیں رہتا، جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر دے۔“

فرمانِ رسول کی شرعی حیثیت:

اگر کوئی کہے: نبی قرآن کے سوا کیسے حکم کرے گا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں یہ بحث نہیں کہ یہ حکم قرآن کے خلاف ہے یا موافق، بلکہ اس بات کا ذکر ہے کہ جب کسی امر کے متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ یہ نبی کا فرمان ہے۔ اس وقت کیا کرنا چاہیے، کیا اس وقت صرف یہ کہہ کر کہ ”یہ قرآن نہیں، ہم اس کی پابندی کے مامور نہیں۔“ سبکدوش ہو سکتے ہیں یا ہم اس وقت پابند رہنے کے مامور ہیں؟

”دو اسلام“ کے (صفحہ:۱۱۱) میں لکھا ہے:

---

❶ النور:٦٣

❷ الأحزاب:٣٦

"تو کیا اقوال رسول قابل ایمان نہیں؟ جواب: کیوں نہیں! بشرطیکہ کہیں سے قولِ رسول مل جائے۔ رونا تو اسی بات کا ہے کہ اقوالِ رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوالِ رسول مل جائیں، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآنِ حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرۂ ایمان میں شامل ہو جائے۔"

مصنف نے پھر اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اقوالِ رسول پر ایمان لانا ضروری ہے، مگر اس کے دستیاب ہونے میں تردد کا اظہار کیا ہے۔

بلکہ (صفحہ:۱۲۹) میں لکھا ہے:

"دراصل اقوالِ رسول کی تعداد پانچ سات ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔"

احادیث کی تعداد:

حالانکہ صحیح بخاری میں اصل احادیث کی تعداد اس سے بہت کم ہے، کل اڑھائی ہزار کے قریب ہے۔ احکام کی روایات اس سے بھی کم ہیں۔ بعض علماء نے ان کی تعداد صرف بارہ سو بتلائی ہے، اور چودہ لاکھ کا یہ مطلب نہیں (جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے) کہ احادیث کی اصل تعداد چودہ لاکھ ہے، بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہی احادیث مختلف طرق اور اسانید کی بناء پر چودہ لاکھ بن جاتی ہیں۔

امام ابوداؤد نے سنن کا مجموعہ پانچ لاکھ سے تیار کیا ہے اور فرماتے ہیں: "میں نے کوئی صحیح حدیث نہیں چھوڑی۔" یعنی قریب قریب پانچ لاکھ کی پانچ لاکھ سب اس مجموعہ میں درج ہو چکی ہیں، حالانکہ سنن ابی داؤد میں صرف ۴۸۰۰ کے قریب احادیث ہیں۔ ❶ پس چودہ لاکھ کا یہ مطلب نہیں کہ احادیث کی گنتی بڑھ کر

---

❶ رسالة أبي داود إلى أهل مكة: ٣٥

چودہ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ یہ بالکل بے معنی بات ہے، بلکہ مرورِ زمانہ کی بناء پر چونکہ ایک ایک حدیث کی تین تین سو سندیں پھیل چکی تھیں، لہٰذا مختلف اسانید کی بنا پر ان کی گنتی بڑھتی گئی۔ [1] جیسے صحیح بخاری کی تعداد احادیث حافظ ابن حجر نے ۹۰۸۲ بتلاتی ہے، تکرار کو چھوڑ کر اصل گنتی ۲۶۰۲ رہ جاتی ہے۔ [2] ایک حدیث کے جتنے طرق ہونگے، اسی قدر اس کو قوت ہوگی، پس ایک حدیث اگر سو طرق سے مروی ہوگی، تو وہ اس حدیث سے زیادہ قوی ہوگی، جو صرف ایک طریق سے مروی ہے۔

---

[1] دیکھیں: علوم الحديث لابن الصلاح: ١٠، توجيه النظر: ١/ ٤١

[2] هدي الساري: ٤٦٩، ٤٧٧، فتح المغيث: ١/ ٥٩.

حفاظت وکتابت حدیث

کتبِ احادیث کے طبقات:

اس وقت حدیث کا وجود صرف کتابوں میں ہے اور حدیث کی کتابیں پانچ قسم کی ہیں:

طبقہ اولیٰ:

بعض وہ ہیں جن میں صرف صحیح احادیث پائی جاتی ہیں، جیسے بخاری ومسلم۔ ان دونوں کتابوں میں قریب قریب کل احادیث باتفاق امت صحیح ہیں۔ صرف دو سو کے قریب ایسی احادیث ہیں، جن میں علماء محققین نے بحث کی ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ حدیثیں بھی صحیح ہیں۔ ❶ صرف بعض احادیث کے چند کلمات ایسے ہیں، جو شاذ ہیں۔ بعض محققین نے "مؤطا" کو بھی "صحیحین" کے ساتھ ملایا ہے اور تینوں کتابوں کو طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔ ❷

طبقہ ثانیہ:

دوسری قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن میں صحیح، حسن، ضعیف، ہر طرح کی

❶ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیحین میں احادیث منتقدہ کی تعداد ایک سو دس (۱۱۰) ہے۔ (هدي الساري: ٣٤٦)

❷ جیسا کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ (حجة الله البالغة:۱/۱۰۵)

حدیثیں ہیں۔ مگر ان کے مؤلفین نے التزام کیا ہے کہ اگر حدیث ضعیف ہو، تو اس کا ضعف بیان کر دیں گے۔ اس طبقہ میں تین کتابیں ہیں:

1. سنن أبی داود۔
2. سنن نسائی۔
3. جامع ترمذی۔

اس طبقہ کی احادیث پر بحث کی گنجائش ہے، مندرجہ بالا دو طبقوں کو "صحاح ستہ" کہتے ہیں۔ "صحاح ستہ" کی ہر حدیث صحیح نہیں، مگر ان سے "صحیح" کا معلوم کرنا بہت آسان ہے، کیونکہ عام طور پر محدثین نے التزام کیا ہے۔ اگر ضعف ہو، تو بیان کر دیں گے اور جہاں ضعف بیان نہ کیا ہو، تو وہ حدیث "حسن" یا "صحیح" ہوتی ہے۔ بہت کم ایسے مواقع ہیں، جہاں بحث کی ضرورت ہوتی ہے ان دو طبقوں پر محدثین کا عمل ہے۔

طبقہ ثالثہ:

تیسری قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن میں صحیح، حسن، ضعیف، منکر، شاذ ہر طرح کی احادیث ہیں، مگر محدثین نے اس امر کا التزام نہیں کیا کہ جہاں ضعف ہو ضرور بیان کر دیں۔ بعض جگہ بیان کرتے ہیں اور بعض جگہ بیان نہیں کرتے۔ مگر ایک محقق آدمی أسماء الرجال کی مدد سے ان کا حال معلوم کر سکتا ہے اور اسی طبقہ میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے مگر محدثین نے ان کے حکم کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان کی احادیث کو محققین محدثین کے حوالے کیا، جنہوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اگر ایسی کتاب میں کوئی حدیث ہو اور کسی محقق نے اس پر کلام نہیں کی، تو صاحب کتاب کا فیصلہ معتبر ہے یہ تیسرا طبقہ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

ابن ماجه، دارمی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن أبي شيبة،

مسند أبی یعلیٰ، مسند أحمد، مسند شافعی، مسند عبد بن حمید، مسند ابیداود طیالسی، طحاوی، کتب بیهقی، دارقطنی، مستدرك حاکم، صحیح ابن حبان صحیح ابن خزیمة، صحیح ابن سکن، صحیح أبی عوانة مختارة ضیاء مقدسی، منتقیٰ، تصانیف طبرانی وغیرہ۔

طبقہ رابعہ:

چوتھی قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن کے تفردات سب ضعیف ہوتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: کتاب الضعفاء لابن حبان، کتاب الضعفاء للعقیلي ابوحیان کی کتابیں، مسند فردوس، تفسیر ابن جریر وغیرہ۔

طبقہ خامسہ:

پانچویں قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن میں محدثین نے موضوع حدیثیں جمع کی ہیں۔ جیسے تذکرۃ الموضوعات، موضوعات کبیر ملا علی قاری، اللآلي المصنوعة في الأحادیث الموضوعة للسیوطي، ابن جوزی کی کتاب جس پر سیوطی کے تعقبات ہیں، اللؤلؤ المصنوع في الحدیث الموضوع، امام شوکانی کا رسالہ۔[1]

ماحصل یہ ہے کہ جو حدیث باتفاق محدثین "صحیح" ہو، جیسے بخاری و مسلم کی وہ روایات کہ جن پر محدثین نے جرح نہیں کی اور باقی صحاح ستہ اور دیگر کتب کی وہ روایتیں جن پر کسی محدث نے صحت کا فتویٰ لگایا ہو اور اس کے خلاف کوئی قابل قبول

[1] امام شوکانی کی کتاب کا نام ہے: "الفوائد المجموعة في الأحادیث الموضوعة" کتب احادیث کی مذکورہ بالا پانچ طبقات میں تقسیم شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔(حجة الله البالغة: ۱/۱۰۵)

فتویٰ نہ ہو، وہ حدیث حجت ہے۔ اسی طرح جو ''حسن'' ہو، وہ بھی قابل عمل ہے۔

صحیح حدیث کی اقسام:

اور ''صحیح حدیث'' کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے، جیسے بخاری و مسلم کی وہ روایات جن پر کسی نے تنقید نہیں کی اور ان کے معانی میں تعارض بھی نہیں۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے، بغیر بحث کے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کا مضمون بھی قطعی الثبوت ہے، یعنی سننے والوں کو ان احادیث کے مضمون کا یقین ہو جاتا ہے، بشرطیکہ ان کے اوصاف سے بھی واقف ہو۔ یا امت کے اتفاق کا اس کو علم ہو۔

یہ روایتیں بھی دو قسم کی ہیں۔ بعض متواتر ہیں اور بعض غیر متواتر۔

متواتر کی اقسام:

متواتر کی پھر دو قسمیں ہیں:

1. متواتر بالعمل
2. متواتر بالروایۃ

صحیح حدیث پر عمل واجب ہے:

اور جو حدیثیں صحیح ہیں، مگر ان کی صحت پر امت کا اجماع نہ ہو، تو ایسی حدیثوں کے متعلق علماء کا یہی خیال ہے کہ ان سے علم کا وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو عمل کیلئے ضروری ہوتا ہے۔

صحیح حدیث کی شرائط قرآن سے مأخوذ ہیں:

جن قواعد پر محدثین نے احادیث کو جانچا ہے، وہ قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔

محدثین نے صحت کیلیے پانچ شرطیں لگائی ہیں:

① سب راوی مصنف سے لیکر نبی کریم ﷺ تک ثقہ اور عادل ہوں۔ عادل کا مطلب یہ ہے کہ امانت دار، پرہیزگار اور سچا ہو۔

② ان کا حافظہ اچھا ہو۔

③ سند میں جس قدر راوی ہیں، ایک دوسرے سے ان کی ملاقات اور سماع (یعنی حدیث سننا) ثابت ہو۔

④ راوی نے اس حدیث میں غلطی نہ کی ہو۔ اکثر کی یا اپنے سے زیادہ ''ثقہ'' کی مخالفت نہ کی ہو۔

⑤ اس حدیث کے متعلق عدم سماع کی مخفی دلیل نہ ہو، یعنی علت نہ ہو۔

ان تمام شرائط کا یہ مطلب ہے کہ کوئی راوی فاسق یا مجہول نہ ہو۔ قرآن مجید کی آیت ذیل سے یہ شرائط ماخوذ ہیں:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ ...... ﴾ ❶

''اگر کوئی فاسق خبر لائے، تو اس خبر کی چھان بین کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم جہالت سے کوئی غلط کام کر بیٹھو۔''

یعنی اگر مخبر عادل ہو، تو اس کی خبر پر عمل کرو، کیونکہ اس کی خبر سے جہالت جاتی رہتی ہے اور فاسق کی خبر سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ اسی واسطے شہادت میں ایک مرد کے ساتھ قرآن مجید میں دو عورتوں کا ذکر ہے، اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ غلطی سے بچا جائے۔ ❷

❶ الحجرات:٦

❷ البقرة:٢٨٢

چنانچہ مندرجہ بالا شرائط اسی لئے لگائی گئی ہیں کہ راوی کے متعلق پتہ چل جائے کہ فاسق ہے یا عادل؟ حافظہ اچھا ہے یا نہیں؟ یا حافظہ ہونے کے باوجود کبھی بھول تو نہیں جاتا؟ نیز واسطہ کا بھی علم ہو جائے کہ کیسا ہے؟

انسانی جدوجہد میں اتنی ہی گنجائش ہے اور اسی کا انسان مکلّف ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ أٰمَنُوْا إِذَا جَاءَ كُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ﴾ [1]

"جب ایماندار عورتیں تمہارے پاس وطن چھوڑ کر آئیں، تو ان کا امتحان کرو۔ اللہ کو ان کے ایمان کا تم سے زیادہ علم ہے۔ اگر تم کو ان کے ایمان کا علم ہو، تو اُن کو کفار کے حوالے مت کرو۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنی سی جدوجہد کرے اور انتہائی کوشش کے بعد جس نتیجے پر پہنچے، وہی اس کا علم ہے۔ یہاں ایک اور نکتہ ہے اور وہ یہ کہ شریعت کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لی ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ جب ہم اپنی جدوجہد اور انتہائی کوشش کے باوجود شریعت کی ایک بات کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہیں، اگر اس میں کسی قسم کی غلطی ہو، تو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی دلیل قائم کرے، جس سے ہمیں غلطی پر اطلاع ہو جائے۔

صحتِ حدیث کی دیگر شرائط:

اب یہ امر زیر بحث لانا باقی رہ جاتا ہے کہ اگر کوئی حدیث ان پانچ شرائط پر

[1] الممتحنة: ١٠

مشتمل ہو اور امت میں سے کسی محدث یا مجتہد کو اس میں کسی غلطی کا علم بھی نہیں ہوا، تو کیا حدیث کی صحت کیلئے اسی قدر کافی ہے یا اور شرائط کی بھی ضرورت ہے؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ حدیث مذکورہ شرائط کے علاوہ عقل، قرآن اور حدیث متواتر کے خلاف نہ ہو۔ مگر محدثین نے فرمایا ہے کہ جو حدیث مذکورہ شرائط پر پوری اترتی ہے، وہ عقل، قرآن اور حدیث متواتر کے خلاف نہیں پائی گئی، اس کی تشریح اس طرح ہے:

دلیل کی اقسام:

دلائل دو قسم کے ہیں: عقلی اور نقلی۔

پھر ان کی بھی دو قسمیں: یقینی اور غیر یقینی۔

متواتر اور اجماعی الصحت (1) حدیث یقینی ہے اور باقی غیر یقینی۔ اسی طرح عقلی باتیں بعض یقینی ہوتی ہیں، جیسے بدیہیات وغیرہ اور بعض غیر یقینی، جیسے نظریات۔ محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دلیل نقلی یقینی اور عقلی یقینی میں تعارض نہیں ہوتا اور نہ یقینی دلائل عقلیہ کا آپس میں، نہ یقینی دلائل نقلیہ کا آپس میں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دلیل یقینی ہو اور دوسری ظنی، اگر اس طرح کی کوئی صورت ہو، تو اس وقت یقینی کو ظنی پر ترجیح ہوگی۔ مثلاً حدیث متواتر یا اجماعی الصحت نہ ہو، بدیہیات کے خلاف ہو، وہ مردود ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی نظریہ حدیث متواتر، قرآن یا حدیث اجماعی الصحت کے خلاف ہو، تو وہ نظریہ مردود ہوگا۔ مگر یہ بات بھی فرضی ہے، اب تک کوئی صحیح حدیث کسی عقلی یقینی دلیل کے خلاف نہیں پائی گئی۔ اگر کسی کے دماغ میں

---

(1) یعنی جن احادیث کی صحت پر اجماع ہے، جیسے بخاری و مسلم کی وہ احادیث جن پر کسی محدث نے کلام نہیں کیا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاوی ابن تیمیة: ٤/٤٧

یہ بات بیٹھ جائے کہ فلاں صحیح حدیث بدیہیات کے خلاف ہے، وہ اس کی تاویل کر سکتا ہے یا اس کو رد بھی کر سکتا ہے۔

حدیث قرآن کا بیان ہے

بعض احادیث وہ ہیں، جو قرآن مجید کی عملی صورتیں ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ [1] یعنی "نماز قائم کرو۔"

مختلف مقامات پر اس کے اجزاء "قیام، رکوع، سجود، تسبیح، تحمید، تکبیر، قرأت قرآن" کا اور اس کی شرائط میں سے "وضو، جنابت سے غسل وغیرہ" کا ذکر ہے۔ استقبال قبلہ ایک جگہ بدون نماز مذکور ہے اور ایک جگہ جماعت کی طرف بھی اشارہ ہے ﴿ وَ ارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴾ [2] اور صلوٰۃ خوف میں باجماعت پڑھنے کا بیان ہے [3] اور نداء کا ذکر ہے۔ [4]

جمعہ کے دن ذکر اللہ اور نماز کو خاص طور پر بیان فرمایا ہے اور مختلف آیات میں اوقاتِ نماز کی طرف بھی اشارات ہیں۔ مگر حدیث میں ایک خاص طریقہ پر اذان، نماز، اقامت، امامت اور خطبہ جمعہ کا بیان ہے۔ جو قرآن کے مخالف نہیں، بلکہ قرآن کے بیان کردہ منتشر اجزاء کا مجموعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر مداومت کی۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ اسی پر عامل رہے، یہاں تک کہ وہ نماز اسی صورت میں ہم تک پہنچی۔ ہر قرن میں نمازیوں کی تعداد قرآن کے ناقلوں (حافظوں اور کاتبوں) سے زیادہ رہی۔ پس نماز جس طریق پر نبی کریم ﷺ نے پڑھی، اس کا ثبوت قرآن

---

1. البقرۃ:٤٢
2. البقرۃ:٤٢
3. النساء:١٠٢
4. المائدۃ:٥٨، الجمعۃ:٩

کے ثبوت سے بڑھ کر ہے۔

قرآن مجید میں ذکر ہے:

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ﴾ ❶

''اللہ کا ذکر اسی طرح کرو، جیسے تم کو ہدایت کی گئی۔''

اسی طرح قرآن مجید نے ''نداء'' کا ذکر بطور حکایت کے کیا ہے، اس پر استہزاء کرنے والوں کو ڈانٹا ہے۔❷ نداء (اذان) کی ہیت کذائی چونکہ تواتر سے ثابت ہے اور قرآن سے بھی بڑھ کر اس کا تواتر ہے۔ اس واسطے اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پس لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نماز یا نداء منشا قرآن کے خلاف نہیں پڑھی ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہوگی۔ اگر قرآن کے منتشر اجزاء اور حدیث میں ان کے اجتماع کو بیک نظر دیکھا جائے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا عمل قرآن کے اس الہام کا بیان ہے، جو نماز کے متعلق قرآن نے اختیار کیا ہے۔

شریعت ہم تک کیسے پہنچی؟

مگر ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ شریعت ہم تک دو طریقوں سے پہنچی ہے:

ایک تعامل، یعنی ہر زمانہ میں لوگ ایک کام پر عمل کرتے آئے۔

دوم: روایت، جو کتب حدیث میں موجود ہیں۔

ہر ایک میں ایک نقص ہے، جس کا جبر دوسرے طریقہ سے ہو جاتا ہے۔ تعامل میں یہ نقص ہے کہ کبھی بعد کا پیدا شدہ عمل بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے رفع کرنے کیلئے ہمیں روایت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

❶ البقرة: ١٩٨

❷ المائدة: ٥٨

اور اسی طرح روایات میں ابہام ہوتا ہے، جو عمل سے رفع ہو جاتا ہے۔ لفظ میں ایک سے زیادہ احتمال ہوتے ہیں، مگر تعامل سے ایک شق متعین ہو جاتی ہے۔

یہی حال قرآن مجید کے اور مقامات کا ہے۔

حج کا بیان حدیث میں ہے:

مثلاً حج کے متعلق قرآن مجید نے حلال ہونے اور محرم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مگر احرام باندھنے کے متعلق سوائے سر منڈانے، مجامعت کرنے اور شکار کرنے کی ممانعت کے اور چیزوں کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح بیت اللہ کے طواف کا ذکر کیا، اس کی گنتی اور وقت کے بارے میں نہیں بتایا، یہی حال صفا و مروہ کے طواف کا ہے، اس کیلئے کوئی گنتی نہیں بتائی۔

رسول اللہ ﷺ نے سات دفعہ طواف کیا اور احرام میں خوشبو لگانے اور سلے ہوئے کپڑے پہننے کی ممانعت، نیز مرد کو سر ننگا رکھنے کا حکم دیا۔ اجمار کے بعد حلال ہونے کو کہا، اگر قربانی لازم نہ ہو، ورنہ قربانی کرنے کے بعد، اور عمرہ میں بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ میں سعی پر اکتفا فرمایا۔ احرام باندھنے کیلئے "مواقیت" کو متعین کیا۔ قرآن مجید نے صرف یہ کہا کہ ﴿ اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ﴾ [1] مگر ان کی تعیین نہیں کی۔

نبی کریم ﷺ نے جس طرح حج کیا، آپ ﷺ کو ہزاروں آدمیوں نے دیکھا، پھر ہر سال آپ ﷺ کے خلفاء حج کرتے رہے، تعامل اور روایت سے حج کا طریقہ نماز کی طرح ہم تک پہنچا۔

---

[1] البقرۃ:۱۹۷

احکام زکاۃ کی تفصیل حدیث میں ہے:

یہی حال زکوۃ کا ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ زکوۃ ادا کرو۔ مگر اس کا اندازہ نہیں بتایا، نہ مال کی مقدار متعین کی اور نہ ہی نصاب بیان فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے نصابِ مال اور زکوۃ متعین کی اور ایک رقعہ میں لکھا دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی ایک نقل حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دی اور مختلف عمال کو اس کی نقلیں بھیجیں۔ [1] وہی حکومت کا قانون بنا، اس وجہ سے رد و بدل سے محفوظ ہو گیا۔ قران کی یہ آیت ﴿لتبين للناس ما نزل إليهم﴾ [2] ان احادیث پر ٹھیک منطبق ہو جاتی ہے۔

حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے:

اگر کوئی کہے کہ ہم نماز کی ایسی تفسیر کریں گے، جو ان احادیث کی محتاج نہ ہو گی، اسی طرح حج کی اور زکوۃ کی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس نماز کی تفسیر نہ ہو گی، جو قرآن کے زمانۂ نزول میں پڑھی جاتی تھی اور آج تک تواتر عملی سے ہم تک پہنچی ہے، بلکہ وہ اور نماز ہو گی، اسی طرح وہ حج نہ ہو گا، جو زمانۂ نزول قرآن میں کیا جاتا تھا، ایک نئی اصطلاح ہو گی، اسی طرح وہ زکوۃ بھی ایک نئی چیز ہو گی۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک آدمی کو کہے، سیالکوٹ جاؤ اور اتنا کہہ کر خاموش ہو جائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ سیالکوٹ سے مراد وہی لیا جائے گا، جو مشہور و معروف ہے۔ اگر مامور یہ کہے (چونکہ متکلم نے سیالکوٹ کی تفصیل نہیں کی، اس واسطے) میں اپنی طرف سے ایک تفسیر کر لیتا ہوں۔ "سیال" کے معنے جاڑا، اور

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الزكاة، باب صدقة الغنم، رقم الحديث (١٣٨٦)، سنن أبي داود (١٥٦٨)، سنن الترمذي (٦٢١)، سنن ابن ماجه (١٧٩٨)

[2] النحل: ٤٤

''کوٹ'' بمعنی کوٹ، پس سیالکوٹ کا معنی ہوا: ''جاڑے والا کوٹ'' اس واسطے میں کوٹ فروش کے پاس چلا جاتا ہوں، تو یہ اس کی حماقت ہوگی۔

اسی طرح جب نماز، زکوۃ اور حج کی صورت نبی کریم ﷺ کے وقت سے چلی آتی ہے۔ خود اگر کوئی نئی صورت بنائے، تو یہ اس کی حماقت ہوگی۔

قرآن میں نکاح کا ذکر ہے اور نکاح کا اطلاق ''عقد'' اور ''وطی'' دونوں پر ہوتا ہے۔[1] قرآن مجید صرف نکاح کا حکم دیتا ہے اور زنا سے روکتا ہے۔ مگر نکاح کے متعلق کوئی صورت نہیں بتاتا، جس سے نکاح اور زنا میں فرق کیا جا سکے۔

بیانِ قرآن، قرآن سے الگ بھی ہے

قرآن مجید میں ہے:

﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝﴾ [2]

''قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذِمہ ہے۔ جب ہم پڑھیں، تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر، پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔''

پہلی مثال:

① ......﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ﴾ [3]

---

[1] القاموس المحيط:٢٣٧

[2] القيامة:١٧-١٩

[3] البقرة:١٤٣

’’جس کعبہ پر آپ تھے، اس کو ہم نے اس لئے بنایا تھا، تا کہ ہم اس کو جانیں جو رسول کا متبع ہے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جاتا ہے۔‘‘

اس آیت میں پہلے ’’کعبہ‘‘ کا ذکر ہے اور اس کعبہ کا معین کرنا، من جانب اللہ بتایا گیا ہے، مگر قرآن میں کہیں اس کعبہ کی طرف منہ کرنے کا ذکر نہیں۔

دوسری مثال:

② ...... ﴿ وإذْ أسَرَّ النَّبِيُّ إلَى بَعْضِ أزْوَاجِهِ حَدِيثاً فَلَمَّا نبأت به وأظهره الله عليه عرّف بعضه وأعرض عن بعض فلما نبأها به قالت من أنباك هذا قال نبأني العليم الخبير﴾ ❶

’’جب (نبی ﷺ) نے اپنی ایک بیوی کو ایک راز بتایا، اس نے آگے اس کا افشا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے آگاہ کیا۔ نبی نے کچھ حصہ اپنی بیوی کو جتلایا اور کچھ نہ جتلایا۔ بیوی نے پوچھا: آپ کو کیسے پتہ چلا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے علیم و خبیر نے بتایا ہے۔‘‘

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ کی طرف سے خبر آیا کرتی تھی۔

تیسری مثال:

③ ...... ﴿ لقد صدق الله رسوله الرؤيا بالحق لتدخلن المسجد الحرام إن شاء الله ﴾ ❷

’’اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچی خواب دکھائی کہ تم مسجد حرام میں انشاء اللہ

❶ التحریم:۳

❷ الفتح:۲۷

اس سوال کا جواب قرآن مجید نے یہ دیا ہے کہ:

''یہ بات ہماری مرضی پر موقوف ہے جس کو ہم چاہیں اپنی رحمت کے ساتھ خاص کریں۔'' ❶

پس ثابت ہوا کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے صرف دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص دلائل کا مطالبہ کفار کی عادت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے۔

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ ❷

''جو اللہ تعالیٰ کرے، اس سے یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ ایسا کیوں کیا۔ یہ سوال دوسروں سے ہوتا ہے۔''

کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان کی سمجھ میں حکمت آئے یا نہ آئے، صرف اس قدر ثابت کر دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے۔

کتابت اور حجیت

پس جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ قرآن و حدیث دونوں حجت ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے دونوں میں خود فرق کیا ہے۔ قرآن کو بلحاظ فصاحت و بلاغت کے معجزہ بنایا، اور اس کی کتابت کا باقاعدہ انتظام آنحضرت ﷺ کی معرفت کرایا، تاکہ یہ الفاظ بعینہ محفوظ رہیں اور ان کی تلاوت سے امت مستفید ہو، اور یہ معجزانہ نظم ہمیشہ کے لیے رہے، اور حدیث کو قرآن مجید کی طرح آنحضرت ﷺ کی معرفت اس کی کتابت کا باقاعدہ انتظام نہ کرایا اور دونوں کو حجت ٹھہرایا، اور ہر ایک کی اتباع کو فرض قرار دیا۔ اگر احادیث ہمیشہ کے لیے واجب الاتباع نہ ہوتیں، تو باقاعدہ لکھانے سے

❶ البقرۃ:١٠٥

❷ الأنبیاء:٢٣

بھی ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہ پڑتا، کیونکہ حجت ہونے اور لکھانے میں کوئی تلازم نہیں۔ چنانچہ بہت سی حدیثیں ایسی ہیں، جن کو آپ نے لکھایا، مگر منکرین حدیث ان کو بھی واجب الاتباع نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کے نزدیک حدیث وقتی تھی۔ پس اگر حدیث لکھا دی جاتی، تب بھی وقتی ہی رہتی، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی بعض احکام ایسے ہیں، جو وقتی ہیں، جیسے یہ آیت:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ﴾ ❶

"اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرو، تو پہلے کچھ صدقہ کرلیا کرو۔"

مگر یہ حکم فقط وقتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ساتھ ہے، مگر یہ حکم لکھا ہوا ہے۔ لکھا ہوا بھی قرآن مجید میں ہے۔ اسی طرح وہ احکام جن کا تعلق صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھا، وہ سب کے سب وقتی تھے۔ جیسے یہ حکم:

﴿ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ❷

"وہ عورت بھی اے نبی ہم نے تیرے لیے حلال کی ہے جو ایماندار ہو، اپنے نفس کو نبی کے لیے ہبہ کرے اور نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ حکم خالص تیرے لیے ہے، دوسرے مومن اس میں شریک نہیں۔"

اسی طرح یہ حکم:

﴿ وَلَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ﴾ ❸

---

❶ المجادلة: ١٢

❷ الأحزاب: ٥٠

❸ الأحزاب: ٥٢

''اے نبی! اس کے بعد تیرے لیے عورتیں حلال نہیں۔ نہ ان میں تبدیلی کی اجازت ہے۔ خواہ کتنی ہی خوب صورت ہو۔''

اور دوسرے ایمانداروں کو تبدیلی کی اجازت ہے:

﴿ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ﴾ ❶

''اگر اپنی بیوی کو بدلنا چاہو، یعنی ایک کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرنا چاہو (تو پہلی سے مہر واپس نہ لو)۔''

اسی طرح یہ حکم:

﴿ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴾ ❷

''اللہ نے تجھ پر کتاب وحکمت (سنت) نازل کی، اور تجھے وہ کچھ سکھایا، جس سے تو واقف نہ تھا، اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔''

اسی طرح یہ حکم:

﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا ...... ﴾ ❸

آنحضرت ﷺ کی بیویوں سے آپ کے بعد نکاح کرنا منع ہے۔ اللہ کے ہاں یہ بہت بڑا جرم ہے۔

اسی طرح بہت سے احکام ہیں، جو ہمارے لیے پند وعبرت کا باعث تو بن سکتے ہیں، مگر عمل کے اعتبار سے وقتی ہیں۔ جب وقتی احکام قرآن کے اندر رکھے جاسکتے ہیں، تو حدیث لکھنے سے کیسے دائمی بن جاتی۔ پس حدیثیں وقتی بھی ہوں، تب بھی ان

❶ النسآء: ۲۰

❷ النسآء: ۱۱۳

❸ الأحزاب: ۵۳

کے لکھنے سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے۔ آپ لوگ (منکرین حدیث) تو کہتے ہیں کہ حدیثوں کے احکام ایک دو سورتوں میں بیان کیے جاسکتے تھے۔ اگر ایسا کردیا جاتا اور اخیر میں یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ احکام پائیدار قسم کے ہیں، وقتی ہیں، دائمی نہیں، تو لکھنے سے ان کے دائمی ہونے کا شبہ بھی نہ پڑتا۔ بس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ احکام نہ لکھنے سے دائمی بنتے ہیں اور نہ نہ لکھنے سے وقتی ہوجاتے ہیں۔

پس جب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ خلافت راشدہ صرف تیس سال تک چلے گی، بلکہ اس سے کم زمانہ، اس کے بعد شاید چودھویں صدی میں جاکر منکرین حدیث کا ایک گروہ پیدا ہوکر خلافت راشدہ کے قائم کرنے کی سعی کرے گا۔ اس وقت جو وقتی بائیلاز (قانونی دستاویز) تیار ہوگا، وہ اس وقت کے لیے مناسب ہوگا۔ پس اس برزخی زمانہ تیرہ سو سال کے لیے امت کو قرآن کے تشریحی بائیلاز سے واقف رکھنے کے لیے ان احکام کو جو حدیث میں ہیں، ایک دو سورتوں میں (بقول آپ کے) لکھ دیا جاتا، تاکہ خلافت راشدہ کے قیام ثانی تک امت ان سے مستفید ہوتی۔

حدیث دائمی حجت ہے

ہم میں اور آپ میں فرق تو صرف وقتی اور دائمی ہونے کا ہے۔ نہ مفید اور غیر مفید ہونے کا۔ دونوں ان احکام کو مفید سمجھتے ہیں۔ ہم اس لیے کہ وہ دائمی شریعت ہیں اور آپ اس لیے کہ دوسرے بائیلاز کے تیار کرنے میں ممدومعاون ہیں اور جب تک تقاضائے زمانی نہیں بدلتا، قابل عمل بھی ہیں۔ پس ان احکام کے نہ لکھنے کا اعتراض تو دونوں فریق پر یکساں ہے۔ آپ صرف اسی فریق پر اس کا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں، جو حدیث کو دائمی حجت سمجھتا ہے۔ آپ خود کہتے ہیں:

”لہٰذا اس تاریخی مسئلہ کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس نہایت صحیح اور محکم معیار خود

کتاب اللہ ہے۔ اس میں جو بات بھی قرآن کے خلاف نظر آئے یا ایسی ہو جس سے حضور ﷺ کی شان میں طعن پایا جاتا ہو، اسے بلا ادنیٰ تامل الگ کر دیا جائے اور باقی حصہ کو نکھار کر ایک جگہ جمع کر لیا جائے، تاکہ اس سے تاریخی کام لیا جا سکے۔ یہ ہماری تاریخ کا گراں بہا سرمایہ ہوگا، جس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکیں گے۔''❶

اگر یہ بات واقعی ہے کہ یہ ذخیرہ گراں بہا سرمایہ ہے۔ پھر سنت کا وہ حصہ جو بائیلاز کہلاتا ہے، وہ بہت قلیل ہوگا۔ وہ تو آپ کے نزدیک بھی نہایت بیش قیمت ہوگا، پس دو بائیلاز اگر قرآن میں بیان کر دیے جاتے اور بعد میں یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ وقتی ہیں تو کیا ہی اچھا ہوتا، مگر ایسا نہ کرنے سے آپ کے خیال کے مطابق اس کی ایسی گت بنی کہ اللہ کی پناہ!

حاصل کلام یہ ہے کہ حدیث کے حجت ہونے یا نہ ہونے، وقتی ہونے یا دائمی ہونے کی صورت میں جو اختلاف نظر آتا ہے، وہ اس قسم کا نہیں جس میں ایک صورت میں حدیث کا (لکھنا) منع ہو اور دوسری صورت میں واجب ہو۔ بلکہ وقتی ہونے کی صورت میں بھی حدیث کا لکھنا مفید ہے اور دائمی ہونے کی صورت میں اگرچہ مفید ہے، مگر واجب نہیں، کیونکہ حجیت کے لیے لکھنا کوئی ضروری نہیں۔

حدیث نہ لکھنے کا سبب

اگرچہ ایک مسلم مومن کے لیے یہ جواب کافی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، کرتا ہے، مگر آج کل زمانہ اس قسم کا ہے کہ لوگ ہر امر کی کچھ نہ کچھ حکمت بھی معلوم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذوق کے مطابق بھی کچھ لکھا جاتا ہے۔ (یہ اس سوال کا دوسرا جواب ہے)

❶ مقامِ حدیث: ۲/۳۹٤

قرآن و سنت میں یہ فرق کہ ''ایک کو فوری طور پر لکھا دیا گیا اور دوسری چیز کے کچھ حصے کو عمل اور حفظ کے حوالہ کیا گیا۔'' اس لیے ہے کہ شریعت کے دونوں حصوں میں اعجاز ظاہر ہو۔ قرآن مجید نظم میں بے نظیر ہونے کی وجہ سے معجز ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت درجہ علیا میں ہے۔ مقصد، الفاظ اور ترکیب میں انسانی دسترس سے باہر ہے۔ جن ّبھی اس کی نظیر نہیں لا سکتے۔ اس بناء پر رسول کریم ﷺ کی صداقت کی ایک زندہ دائمی نشانی موجود ہے۔

حدیث بلحاظ شرح و بیان، جامع العلوم اور مکمل تعلیم ہونے کی بناء پر ایک بے بہا ذخیرہ ہے۔ اس قسم کی باتوں کا اگر لکھائی کے ساتھ انتظام نہ کیا جائے، تو ان میں اگر حفاظت الٰہی نہ ہو، تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، مگر باوجود اس کے کہ حدیث کو قرآن کی طرح باقاعدہ طور پر نہیں لکھا گیا، مگر پھر بھی اس کا دینی حصہ جوں کا توں محفوظ رہا۔ ایسا کلام جس کے اجزاء قرآن کی طرح فوری طور پر سب کے سب نہیں لکھے گئے۔ حوادثات کے تلاطم اور عجمی سازشوں کے باوجود اس کا ہمیشہ کے لیے اسی طرح قائم رہنا، اس کی حفاظت کے لیے اسباب کثیرہ کا پیدا کر دینا بھی ایک زندہ معجزہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کی حفاظت جو دینی حدیثوں کی گئی ہے، اسی صورت میں ممکن ہے جب تائید غیبی شامل ہو۔

اس امر میں غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان اسباب میں غور کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے حدیث کے محفوظ رہنے کے لیے پیدا کیے، تاکہ غور کرنے والے کو اس امر کا یقین ہو جائے کہ ان اسباب کے ہوتے ہوئے حدیث میں رد و بدل ناممکن ہے اور اسباب کے پیدا ہونے میں غیبی طاقت کو دخل ہے۔

حفاظتِ حدیث کے اسباب کا اجمالی ذکر

احادیث کو عملی شکل دینا

1 حدیث کی حفاظت کا سبب حدیثوں کو عمل میں داخل کرنا ہے۔
جو حدیثیں نماز کے متعلق ہیں، خواہ نماز کے اوقات سے ہو یا نماز کی دیگر شرائط طہارت و استقبال کعبہ سے یا نماز کے آداب و ارکان سے، یہ تمام حدیثیں ایسی ہیں کہ جن پر چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ بار عمل کو لازم قرار دیا گیا ہے۔
اب جن حدیثوں پر دن رات میں پانچ مرتبہ عمل کیا جائے، وہ کب بھول سکتی ہیں؟ یہی حال ان احادیث کا ہے، جن کا روزوں سے تعلق ہے، اگرچہ فرض روزے سال میں ایک دفعہ آتے ہیں، مگر پورا ایک مہینہ رہتے ہیں اور سال میں نفلی روزے ہمیشہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے آتے رہتے ہیں، ناممکن ہے کہ ایسی حدیثیں بھول جائیں۔
یہی حال حج کا ہے۔ حج اگرچہ عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ مگر حج میں چونکہ لاکھوں آدمی شریک ہوتے ہیں۔ اس واسطے اس میں ان احکام کو بھول جانا، پھر اس بھول کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔ مکہ والے تو کم از کم اُن کے احکام نہیں بھول سکتے۔

احادیث کو حکومت کا آئین بنانا

2 زکاۃ وعشر وخراج، قصاص، نکاح وطلاق وعدت، غلاموں کا آزاد کرنا، والدین کے حقوق، زوجین کے حقوق اور اقتصادی امور ان سب کو ریاست کے حوالے

کیا گیا۔ حکومت قائم کر کے ان تمام امور کو منظم کر کے علماء، قضاۃ، امراء اور عمال کے سپرد کر دیا گیا۔

۳ پھر لوگوں کے دلوں میں دین کی محبت اور آنحضرت ﷺ کی الفت ڈال دی گئی۔

۴ پھر ایسے ایسے حافظہ والوں کو قرآن و سنت کے مسائل سیکھنے کی طرف متوجہ کیا گیا۔

کتابتِ حدیث

۵ بعض ضروری مسائل کو آنحضرت ﷺ نے خود لکھوایا، اور بعض کو صحابہ اور خلفاء نے تحریر کرایا اور کیا۔ یہاں تک کہ تابعین کے زمانہ میں تمام احادیث قریب قریب تحریر میں آ گئیں اور تابعین صحابہ سے سننے والے تھے۔ تابعین کے نسخے صحابہ کے نسخوں پر مشتمل ہوئے اور بعد میں آنے والوں نے تمام شہروں کے نسخوں کو جمع کروایا۔ یہاں تک کہ دوسری صدی میں ساری حدیثیں کتابی شکل میں مجموعوں میں جمع ہو گئیں، مگر ان میں کچھ اختلاط بھی پایا گیا۔ کیونکہ ان تمام کے استیعاب سے یہ غرض تھی کہ ان تمام شائع شدہ ذخیرہ احادیث سے صحیح و ضعیف کو الگ الگ کر دیا جائے۔ جو قابل عمل اور بالکل صحیح ہیں، ان کو الگ کر دیا جائے تاکہ عوام بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے رطب و یابس اور تمام لکھے ہوئے ذخیرے پر بدوں امتیاز عمل ہوتا تھا، بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ پہلے حدیث پر عمل کرنے کے لیے بڑے بڑے محدثین کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ وہ محدثین عوام کی راہ نمائی کرتے تھے، مگر بعد میں جب دو کتابیں ''صحیح بخاری و مسلم'' لکھی گئیں، تو اب عوام کے لیے حدیث پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔ آسانی کے لیے چھانٹا گیا، ورنہ پہلے بھی قابل عمل حدیثیں یہی تھیں، مگر ان حدیثوں کے ساتھ لکھی ہوئی تھیں، جو ناقابل عمل

تھیں۔ محدثین نے ان حدیثوں کو معرفت کے لیے لکھا تھا۔ ❶

سوال: ان ناقابل عمل حدیثوں کو کیوں لکھا گیا۔ شروع ہی میں نہ لکھتے، تا کہ چھانٹنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

جواب: شروع میں ان غیر قابل عمل حدیثوں کو اس لیے لکھا گیا کہ حدیثیں لکھنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ گروہ تھا جو فن حدیث میں ماہر تھے، جن کی بات پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ صحیح اور ضعیف میں پورے طور پر امتیاز کیا کرتے تھے۔ یہی گروہ حدیث کی خدمت کے لیے چنا گیا تھا۔ مگر حدیث پر چونکہ ان کی اجارہ داری نہ تھی، اس لیے دوسرے لوگ بھی اس فن میں مشغول ہو گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فن میں ماہر نہ ہو، اس سے غلطیاں ضرور ہوتی ہیں، مگر عوام میں وعظ و تبلیغ کے لیے یہی گروہ پیش پیش ہوتا ہے اور خواص پہلے گروہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر اس غیر ماہر گروہ کی اغلاط کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے، تو امت کے لیے ایک مستقل خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے شروع میں تو ان کو لکھ لیا گیا، مگر بعد میں یا تو چھانٹی کے وقت نکال دیا گیا یا ان کی اصلیت پر متنبہ کر دیا گیا، اس

---

❶ امام ابو الولید الباجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جب یمن میں عبدالرزاق بن ہمام کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے گئے، تو ایک دن امام احمد نے یحییٰ بن معین کو دیکھا کہ وہ موضوع احادیث لکھ رہے ہیں، امام احمد کہنے لگے: تم کو معلوم ہے کہ یہ احادیث موضوع ہیں، پھر بھی ان کو لکھ رہے ہو! ابن معین فرمانے لگے: مجھے معلوم ہے کہ یہ احادیث موضوع ہیں، لیکن میں انھیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ کہیں کوئی شخص کل کلاں ان احادیث کو صحیح سند کے ساتھ جوڑ کر بیان کرے، تو میں اس کو کہہ سکوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، یہ تو اس ضعیف و موضوع سند سے مروی ہیں۔

اسی طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں تین مقاصد کے لیے احادیث لکھتا ہوں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ضعیف راوی کی احادیث معلوم کر سکوں، امام اوزاعی فرماتے ہیں: جس طرح تم وہ علم حاصل کرتے ہو جو قابل عمل ہے، اسی طرح وہ علم بھی حاصل کرو جو قابل عمل نہیں ہے۔ (التعدیل والتجریح: ۱/ ۳۹۰)

طرح کہ تصریح کردی گئی یا سند کے ذکر کردینے پر اکتفا کردیا گیا، تاکہ ماہرین سند سے ہی ان کی حقیقت معلوم کرلیں، یا ضعیف راویوں کے متعلق الگ الگ کتابیں لکھ کر آگاہ کردیا گیا، جیسے قرآن مجید یا دوسری کتابیں جو طبع ہو کر آتی ہیں، کاتبوں کی سستی کی وجہ سے ان میں کمی وبیشی ہوجاتی ہے اور اس کا تدارک اس طرح کیا جاتا ہے کہ کتاب کے پیچھے اغلاط نامہ لگا دیا جاتا ہے، کیونکہ ان اغلاط کا تمام کتاب سے نکالنا مشکل ہوجاتا ہے۔

فتنۂ وضعِ حدیث کا تدارک

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک گروہ جو دین کی تخریب کے درپے تھا۔ اس نے حدیثیں بنائیں اور عوام کے لیے ایک فتنہ برپا کردیا۔ مگر جو گروہ ماہر حدیث اس خدمت پر مامور تھا۔ اس نے چن چن کر ان حدیثوں کو الگ لکھا اور ان کے نام کے متعلق کتابیں لکھیں اور حدیثیں بنانے کے اسباب بیان کیے، یہاں تک کہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ الگ ہوگیا اور امت اس فتنہ سے بچ گئی اور وضعی احادیث کا ذخیرہ لکھا ہوا لوگوں کے سامنے آ گیا۔[1]

جیسے قرآن مجید کے متعلق بھی بعض لوگوں نے کوشش کی کہ غیر محفوظ ہوجائے، مگر ان کی کوشش کارگر نہ ہوئی، بلکہ منکرین حدیث کے نزدیک تو بہت سے قرآن بنائے

---

[1] امام عبدۃ بن سلیمان فرماتے ہیں: کسی شخص نے عبداللہ بن مبارک سے کہا کہ ان موضوع احادیث کا کیا ہوگا؟ عبداللہ بن مبارک فرمانے لگے: ''ان کے لیے نقاد اور راسخ علماء زندہ رہیں گے۔'' یعنی امت کو اس فتنہ سے بچائیں گے۔ (الكفاية: ٣٧، التعديل والتجريح: ١/ ٢٩١، فتح المغيث: ٢/ ١١٢، تدريب الراوي: ١/ ٢٨٢)

اسی طرح ایک زندیق کو ہارون الرشید کے پاس قتل کرنے کے لیے لایا گیا، تو وہ کہنے لگا: تم لوگ ان ایک ہزار احادیث کا کیا کرو گے، جو میں نے وضع کی ہیں؟ ہارون الرشید نے جواب دیا: اے دشمن خدا! ان احادیث کے لیے عبداللہ بن مبارک اور ابو اسحاق فزاری زندہ ہیں، جو ان کا ایک ایک حرف نکال باہر کریں گے۔ (الموضوعات لابن الجوزي: ١/ ٤٥، سير أعلام النبلاء: ٨/ ٥٤٢، فتح المغيث: ٢/ ١١٢۔)

گئے، مگر اصل قرآنِ محفوظ رہا۔ یہی حال احادیث کا ہے کہ حدیثیں وضع اگرچہ بنائی گئیں، مگر وہ حدیثیں حدیث کے دینی حصہ میں داخل نہ ہوسکیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حدیث کے اندر اساتذہ اور تلامذہ کا سلسلہ صحابہ کے زمانہ سے قائم ہو چکا تھا۔ ہر استاذ کے تلامذہ گنے گئے تھے اور ان مشہور اساتذہ کی احادیث شمار کرلی گئی تھیں۔ اب ان میں احادیث داخل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ جو شخص کسی استاذ کا نام لے کر کوئی حدیث بیان کرتا، تو اس کے لیے لازم تھا کہ اس کی سند استاذ کے آگے رسول اللہ ﷺ تک بیان کرے۔ اب اس کی کذب بیانی کا پتہ لگانا بالکل آسان تھا، کیونکہ اس سند کے سلسلہ میں جتنے راوی ہوتے ہیں، ان کے اساتذہ اور تلامذہ معروف تھے اور ان کی حدیثیں بھی معروف تھیں۔ اگر اس نے ایسی حدیث بیان کی جو اس سلسلہ کے راویوں میں کسی ایک کی نہیں، تو ظاہر ہے کہ جھوٹ ہے۔ اس طرح اگر سلسلۂ اسناد میں کسی شاگرد کا اضافہ کردیا یا ایسی سند ذکر کردی، جو حقیقت میں نہیں، تو اس سے بھی اس کی کذب بیانی ظاہر ہوجاتی۔ اس لیے کسی جھوٹے کا جھوٹ چھپ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عوام پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مطلب برآری کی کوشش کرتے تھے، مگر خواص ان سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ دینی علم کا تعلق چونکہ خواص سے ہوتا ہے۔ اسی لیے دین اسی طرح محفوظ رہا۔ چنانچہ دارقطنی نے اپنے زمانہ میں بغداد میں اعلان کیا تھا کہ کوئی شخص موضوع روایت دین میں داخل نہیں کرسکتا۔ ❶ کیونکہ ان کو اسانید پر اتنا عبور تھا کہ اگر کوئی شخص جعلی حدیث بناتا، تو فوراً معلوم کرلیتے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض روایات کے بعض الفاظ شاذ ہوں، مگر صحیحین کی ان روایات میں جن پر تنقید نہیں ہوئی، یعنی بعد کے محدثین نے بخاری کے حکم کو صحیح مانا ہے اور بالاجماع وہ صحیح ہیں یا جن میں صحت کا فتویٰ ایک دو محدثوں کا ہے، مگر اس کے

---

❶ فتح المغیث: ۱/ ۲۶۰

خلاف کسی سے مروی نہیں۔ ان پر شذوذ کا کوئی اثر نہیں۔

احادیث کے ذخیرہ میں صحیح وضعیف کا مخلوط ہونا اور موضوعات کا دنیا میں پایا جانا، اس بات کو مستلزم نہیں کہ جو حصہ دستور العمل ہے اور محققین محدثین کے نزدیک معتبر ہے، اس میں بھی اختلاط پایا جاتا ہو۔

جیسے قرآن مجید ہمارے سامنے مختلف مطابع میں طبع ہوتا ہے۔ کاتبوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ زیروزبر بلکہ بعض جگہ کلمات میں بھی ردوبدل ہوجاتا ہے، مگر قرآن میں نفس الامر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگرچہ بعض تھوڑے علم والے جس طرح غلط لکھا ہوا ہوتا ہے، اس طرح ہی پڑھتے ہیں، مگر قرآن کی صحت کے لیے ان پر اعتماد نہیں ہوتا۔

یہی حال حدیث کے ذخیرہ کا ہے کہ اس میں ہر طرح کا مواد موجود ہے، جس کی وجہ رواۃ کی انسانی خامیاں یا دشمنان اسلام کی کارستانیاں اور ناداں دوستوں کی بیوقوفیاں ہیں، مگر جو حصہ محدثین کے نزدیک قابل عمل اور صحیح ہے، اس میں اختلاط نہیں۔

حدیث کی کتابت

آنحضرت ﷺ کے عہد میں شروع ہوگئی تھی

بعض لوگ جو علم اور تاریخ سے پوری واقفیت نہیں رکھتے، جب دیکھتے ہیں کہ حدیث کی کتابیں جو مشہور ہیں، اور "صحاح ستہ" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان سے پہلی کتاب "مؤطا" دوسری صدی میں لکھی گئی اور باقی (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) تیسری صدی میں تصنیف ہوئیں، تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حدیث کے لکھنے کا رواج دوسری یا تیسری صدی میں ہوا ہوگا۔ جامعین حدیث نے سنی سنائی باتوں کو جمع کیا ہوگا۔

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ کتابت کا رواج آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں شروع ہوگیا تھا۔ صحاح ستہ میں اکثر وہی احادیث ہیں، جو پہلی صدی میں لکھی گئیں، بلکہ بعض وہ بھی ہیں، جو آنحضرت ﷺ نے خود تحریر کرائیں اور پہلی صدی کے مجموعوں کی سندیں بالکل مختصر ہوتی ہیں۔ بعض جگہ ایک ہی واسطہ ہوتا ہے، یعنی آنحضرت ﷺ اور جمع کرنے والے کے درمیان صرف ایک واسطہ (صحابی) ہوتا ہے۔ کبھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ "ھمام بن منبہ" کا صحیفہ جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں صرف ایک واسطہ ہے یعنی ابوہریرہ، اور حضرت ابوہریرہ کی وفات 58ھ میں ہوئی ہے، [1] یعنی آنحضرت کی وفات کے 48 سال بعد، اور یہ صحیفہ قطعاً

---

[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ ولادت کے بارے میں تین قول ہیں: ۵۷ھ۔ ۵۸ھ۔ ۵۹ھ، دیکھیں: طبقات خلیفة بن خیاط: ۱۱۴، الاستیعاب: ۵۷۱/۱، الإصابة: ۴۴۴/۷، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ۵۷ھ کو راجح قرار دیا ہے۔

اس سے پہلے کا ہے۔ اس میں 138 حدیثیں ہیں، یہ سب کی سب ایسی ہیں، جو "مسند أحمد" اور "صحیح بخاری و مسلم" وغیرہ میں آ چکی ہیں۔ ❶ ان کے دیکھنے سے حدیث کی حفاظت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ صحیفہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ احادیث جن الفاظ کے ساتھ "همام بن منبه" کے صحیفہ میں ہیں۔ اسی طرح صحیحین وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی کے صحیفہ کی احادیث کس طرح تیسری صدی کے مجموعوں میں بعینہ نقل در نقل ہو کر آئی ہیں کہ ان میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہیں ہوئی۔

اسی طرح وہ خط جو آنحضرت ﷺ نے ہرقل کو لکھایا تھا۔ ❷ اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے۔ دیکھو محدثین نے جو الفاظ اس خط کے تیسری صدی میں نقل در نقل کی صورت میں لکھے ہیں، بالکل وہی ہیں۔ حالانکہ اس خط کی نقل آنحضرت ﷺ کے پاس نہ تھی۔ صرف صحابہ نے وہ خط سنا اور یاد کر لیا، پھر نقل در نقل ہوتا ہوا مصنفین تک پہنچا اور اسی طرح محفوظ پہنچا، جیسے لکھا گیا تھا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک صحیفہ لکھا، ❸ جس کو "صادقہ" کہتے

---

❶ مثلاً دیکھیں: مسند أحمد ۲/۳۱۲۔۳۱۹/۲ (۸۱۱۵۔۸۲۵۲) بخاري (۱۳۵، ۲۳۷، ۲۷۸، ۲۰۷۲، ۲۴۰۰، ۲۵۵۲، ۳۴۰۲)، مسلم: ۷۷۱، ۹۷۷)

❷ صحيح البخاري: بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي (حديث: ۷) صحيح مسلم: كتاب المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلى هرقل (حديث: ۴۶۰۷)

❸ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، رسول اللہ ﷺ سے سن کر احادیث لکھا کرتے تھے۔ دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب العلم، باب كتابة العلم (حديث: ۱۱۳)، سنن الترمذي: كتاب العلم، باب ما جاء في الرخصة فيه (حديث: ۲۶۶۸) بلکہ بعض روایات میں آتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو جو چیز بھی رسول اللہ ﷺ سے سنا کرتے تھے، اس کو لکھ لیتے تھے۔ دیکھیں: سنن أبي داود: كتاب العلم، باب في كتاب العلم (حديث: ۳۶۴۶)، مسند أحمد: ۲/۱۶۲، المستدرك: ۱/۱۸۷، (۳۵۹)

←

ہیں۔❶ اس کی حدیثیں بھی صحاح ستہ میں موجود ہیں، زکاۃ کا رسالہ آنحضرت ﷺ

← امام حاکم فرماتے ہیں: امام بخاری اور امام مسلم نے الولید بن عبد اللہ کے علاوہ اس حدیث کے رواۃ سے حجت پکڑی ہے، الولید بن عبد اللہ کی تعیین میں اختلاف ہے، امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر وہ "ولید بن أبي الولید الشامي" ہے، تو پھر مسلم کی شرط پر ہے۔" لیکن وہ "ولید بن عبد اللہ بن أبي مغيث العبدري" ہے۔ جو کہ "ثقه" ہے۔ (الكاشف: ٢/٣٥٢ (٦٠٧٣)، تهذيب التهذيب: ١١/١٢٢) امام عراقی رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور "صحيح" کہا ہے (تخريج أحاديث الإحياء ٢/٢٨٠) شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے "صحیح" کہا ہے۔ (السلسلة الصحيحة: ٤/٤٥ (١٥٣٢))

❶ سنن الدارمي: المقدمة: باب من رخص في كتابة العلم، (حديث: ٤٩٦)، مسند البزار: ٦/٣٧٤ (٢٣٩٢)، الطبقات الكبرى: ٧/٤٩٤، المحدث الفاصل: ١/٣٦٦، تقييد العلم: ٨٤، تاريخ دمشق: ٣/٢٦٢، یہ حدیث ان کتب میں مختلف طرق سے مروی ہے، لیکن زیادہ تر ان کا دارو مدار دو راویوں "إسحاق بن يحيى بن طلحة بن عبد الله القرشي" اور "ليث بن أبي سليم" پر ہے، یہ دونوں ہی "ضعيف" ہیں۔ اسحاق بن یحییٰ کو امام احمد نے "متروك الحديث" اور ابن معین نے "ضعيف" قرار دیا ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں: محدثین ان کے "حفظ" میں کلام کرتے ہیں۔ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محدثین نے اسے "ضعيف" قرار دیا ہے۔ (العلل ومعرفة الرجال: ١/١٠٥، تاريخ ابن معين- رواية الدوري: ٣/١٧٣ (٧٦٤) التاريخ الكبير: ١/٤٠٦، الكامل في الضعفاء: ١/٣٦٨، الضعفاء للعقيلي: ٢/١٠٣ (١٢١)، الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي: ١/١٠٥ (٣٤٠) الكاشف: ١/٢٣٩ (٣٢٧)

ليث بن أبي سليم کو ابن عيينة، أحمد، ابن معين، ابن مهدي اور نسائي نے "ضعيف" قرار دیا ہے۔ (العلل و معرفة الرجال ٢/٣٧٩، ٣/٢٩، تاريخ ابن معين- رواية الدارمي: ١٥٨ (٥٦٠)، الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي: ٣/٢٩، الكامل في الضعفاء: ٦/٨٧ (١٦١٧)، الضعفاء للعقيلي: ٤/١٥- تهذيب التهذيب: ٨/٤١٧) لیکن کئی علماء نے اس صحیفہ کو "صحيفة صادقه" کے نام سے ذکر کیا ہے۔ (أسد الغابة: ١/٦٥٧، صفة الصفوة: ١/٦٥٥، تقييد العلم: ٨٤، عمدة القاري: ٢/١٧٢، تأويل مختلف الحديث: ٧٨، فتح المغيث: ١/١٣١- حافظ سخاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس صحیفہ صادقہ کے علاوہ "صحيفه يرموكيه" بھی تھا، جس میں اہل کتاب کے اقوال تھے۔ (فتح المغيث: ١/١٣٠) ←

نے لکھوایا، وہ رسالہ صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہے۔ ❶

حضور ﷺ کے مکاتیب کا ذکر

(1) صلح حدیبیہ کا معاہدہ جو صحیح بخاری میں منقول ہے، ❷ اور دیگر معاہدات۔ ❸

← طبقات ابن سعد میں یہ حدیث اس سند کے ساتھ بھی مروی ہے: "أخبرنا أبوبكر بن عبد الله بن أبي أويس عن سليمان بن بلال عن صفوان بن سليم عن عبد الله بن عمرو......" اس سند میں "صفوان بن سلیم" اگرچہ "ثقة" ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ صفوان بن سلیم ۷۲ برس کی عمر میں ۱۳۲ھ کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کی تاریخ ولادت ۶۰ھ بنتی ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو ۶۵ھ کو طائف یا مکہ میں فوت ہوئے، امام ابوداؤد فرماتے ہیں: صفوان بن سلیم صرف دو صحابہ: أبو أمامة اور عبد الله بن بسر سے ملے ہیں۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھی انھوں نے نہیں دیکھا (حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ۹۳ھ کو وفات پائی) محدثین نے ان کے اساتذہ میں دیگر صحابہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن کسی نے "عبداللہ بن عمرو" کا ذکر نہیں کیا۔

(تهذيب الكمال: ۱۳/۱۸۴ (۲۸۸۲)، تهذيب التهذيب: ۴/۳۷۳)

علاوہ ازیں "سلیمان بن بلال" کی "صفوان بن سلیم" سے ملاقات بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ "سلیمان" کے اساتذہ میں "صفوان" کا شمار نہیں ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سلیمان بن بلال کو "طبقة ثامنة" اور صفوان بن سلیم کو "طبقة رابعة" میں ذکر کیا ہے۔

تقريب التهذيب: ۴۰۵ (۲۵۵۴) و: ۴۵۳ (۲۹۴۹)

❶ صحيح البخاري: كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، رقم الحديث (۱۳۸۶)، سنن أبي داود: كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، رقم الحديث (۱۵۶۷)، سنن النسائي: كتاب الزكاة، باب زكاة الابل، رقم الحديث (۲۴۴۷)، سنن ابن ماجه: كتاب الزكاة، باب إذا أخذ المصدق سنا دون سن أو فوق سن، رقم الحديث (۱۸۰۰)

❷ صحيح البخاري: كتاب الصلح، باب كيف يكتب هذا ما صالح فلان بن فلان وفلان بن فلان و إن لم ينسبه إلى قبيلته أو نسبه، رقم الحديث (۲۵۵۱)، صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية في الحديبية، رقم الحديث (۱۷۸۳)، سنن أبي داود: كتاب المناسك، باب المحرم يحمل السلاح، رقم الحديث (۱۸۳۲)، مسند أحمد: ۴/۲۹۱ (۱۸۵۹۹)

❸ دیکھیں: ابن حبان: ۱۴/۴۹۱-۵۱۵ (۶۵۵۳-۶۵۵۹)

مروی ہیں۔ ❶ پس ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا مطلب وہی لیا جائے گا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ قرآن کے ساتھ حدیث نہ لکھو، بلکہ الگ لکھو، یا اس حدیث کو بسبب خبر واحد ہونے کے متواتر اور مشہور کے مقابلہ میں مرجوح یا منسوخ قرار دیا جائے گا۔ ❷

صحیفۂ عمرو بن حزم:

مولانا مولوی ابوالقاسم بنارسی کی کتاب "جمع القرآن والأحادیث" میں ہے:

> "رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن یعنی اہل نجران کے لئے ایک کتاب لکھوائی، جس میں تمام مسائل فرائض وسنن اور دیات وغیرہ کے تحریر تھے اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجی۔ پھر وہ خاندان عمرو بن حزم کے ہاں محفوظ رہی، چنانچہ امام ابن شہاب زہری تابعی نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے نقل کی۔ یہ حدیث تواتر سے سنن نسائي (مطبع انصاری) کتاب القود والقسامة والدیات: ۲/۲۲۱، مراسیل ابوداود: ۳۸، سنن دارقطني: ۴۵، ۳۳۶، ۳۳۷، مسند دارمی: ۳۱۰، مؤطا امام مالك: ۳۳۲، مسند شافعي: ۱۹۸، کتاب الشافعي: ۶۶، ۶۸، سنن بیهقي: ۴/۸۹، مستدرك حاکم: ۱/۳۹۵، بلوغ المرام: ۱۴۲، جامع بیان

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیں:

❷ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو "موقوف" قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان نہیں ہے، دیگر اہل علم نے اس حدیث کے متعلق جمع، ترجیح، نسخ کے حوالے سے کئی جوابات دیے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: شرح السنة: ۱/۲۹۴، تأویل مختلف الحدیث(۱۹۳)، معالم السنن: ۴/۴۲، جامع الأصول: ۸/۳۳، مجموع الفتاوی: ۱۸/۳۱۸، جامع بیان العلم: ۱/۲۹۲، مقدمة ابن الصلاح: ۱۹۰، تقیید العلم: ۳۲، ۵۷، ۹۳، فتح الباري: ۱/۲۷۵، الأنوار الکاشفة للمعلمي: ۴۳۔

العلم وفضله لابن عبدالبر: ۱/ ۷۱، فتح الباری (مطبع انصاری) :۲۸، ۲۹۵ ، اور تفسیر ابن کثیر :۳/ ٦٤ وغیرہ کتب میں ثابت ہے۔"

پس کتابت کے خلاف جو ادلہ ذکر کی جاتی ہیں، وہ کمزور ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اثر:

❷ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا۔ لیکن ایک صبح اٹھ کر اسے جلا دیا۔

جواب:

اس اثر کی سند "تذکرۃ الحفاظ" میں اس طرح ہے:

"(وقد نقل الحاكم) فقال حدثني بكر بن محمد أنا محمد بن موسىٰ البربري أنا الفضل بن غسان أنا علي بن صالح أنا موسىٰ بن عبدالله بن حسن عن إبراهيم بن عمر بن عبيدالله التيمي حدثني القاسم بن محمد قالت عائشة جمع أبي...... الحديث۔"

ا: یہ سند صحیح نہیں۔ اس کی سند میں "علي بن صالح" ہے، جو مجہول ہے۔

ب: "مفضل بن غسان" بھی مجہول اور غیر مقبول ہے۔

ج: اس میں "موسیٰ بن عبدالله" ہے، جو "متهم بالكذب" ہے۔

د: اس اثر کے اخیر میں "تذکرہ" میں بھی لکھا ہے۔ "لا يصح" یعنی یہ صحیح نہیں۔ ❶

ھ: امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس کی تردید کی ہے، جیسے "كنز العمال" سے

---

❶ تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۵۔

معلوم ہوتا ہے۔ ❶

ز: بخاری میں ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جب بحرین کی طرف بھیجا، تو ان کو ایک لمبی حدیث کی نقل لکھ کر دی، ❷ جس میں زکوٰۃ کا مکمل مسئلہ ہے۔

ز: "شرف أصحاب الحديث" میں ہے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو مجھ سے کوئی حدیث لکھے، جب تک وہ حدیث پڑھی جائے گی، اس کو ثواب ملتا رہے گا۔" ❸

یہ عام وجوہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ احادیث کے جلانے کا جو افسانہ مروی ہے، وہ باطل و بے دلیل ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر:

❸ تذکرۃ (۱/۳) میں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی حدیث ہے، جس میں ذکر ہے کہ:

"تم حدیث میں اختلاف کرتے ہو، تم سے پیچھے آنے والے تم سے زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس واسطے تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نہ بیان کرو، جو تم سے پوچھے، تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔"

---

❶ كنز العمال: ۱۰/ ۵۰۳ (۲۹٤٦۰) نیز دیکھیں: الأنوار الكاشفة: ۳۷

❷ صحيح البخاري: كتاب الزكاة: باب صدقة الغنم، رقم الحديث (۱۳۸٦)

❸ اس کی سند "موضوع" ہے۔

جواب:

ا: مگر یہ ''مرسل منقطع'' ہے۔ چنانچہ (ذہبی) لکھتے ہیں: "ومن مراسیل بن أبي مليكة" اور اخیر میں کہتے ہیں کہ "فهذا المرسل......" اور ''مرسل منقطع'' محدثین کے نزدیک حجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ لکھا ہے:

" ردّه جماهير النقاد ......للجهل بالساقط في الإسناد" ❶

یعنی جمہور محققین ''مرسل'' کو مردود جانتے ہیں، کیونکہ جو راوی غیر مذکور ہے، وہ مجہول ہے۔

ب: اس حدیث میں اختلاف کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حدیث کا بیان کرنا، تم جیسے لوگوں کا کام نہیں، جو حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ ان لوگوں کا کام ہے، جن کا حافظہ اللہ نے اچھا بنایا ہو۔ تم صرف قرآن کا ہی حوالہ دیا کرو، کیونکہ حدیث بھی قرآن ہی کی تفسیر ہے۔

ج: امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ مطلب تھا کہ حدیث میں تحقیق سے کام لیا کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ بالکل روایت ہی بیان نہ کرو۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود دادی یا نانی کے متعلق حدیث کے فتویٰ پر عمل کیا، جب کہ اس کا حکم کتاب اللہ سے نہ ملا۔'' ❷

د: آگے یہ ذکر کیا ہے: ایک دفعہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حدیث سنائی، تو اس نے کہا: اسی طرح ہے؟ آپ نے فرمایا ''اسی طرح ہے۔ ورنہ میں زمین پر کیسے چل پھر سکتا ہوں۔ اگر ایسی حدیث بیان کروں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان

---

❶ ألفية العراقي: ٧٨

❷ تذكرة الحفاظ: ٣/١

نہیں فرمائی۔“ ❶

ح: ”توجیه النظر“ میں ہے:

”وأما الرواية فمنقطعة لا تصح“

کہ یہ روایت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک نہیں پہنچتی، اس لئے ”صحیح“ نہیں۔ ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر:

◆ ۴ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین آدمیوں عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء اور ابومسعود (رضی اللہ عنہم) کو حدیث کے بیان کرنے میں قید کر دیا تھا۔“

جواب:

یہ اثر بھی صحیح نہیں، اس کی سند اس طرح ہے:

”عن شعبة عن سعد بن إبراهيم عن أبيه أن عمر حبس......“

(تذكرة الحفاظ ١/٧)

”توجيه النظر“ میں لکھا ہے:

”هذا مرسل ومشكوك فيه من شعبة فلا يصح، ولا يجوز الاحتجاج به ثم هو في نفسه ظاهر الكذب“ (توجيه النظر: ١/٧٣)

---

❶ تذكرة الحفاظ: ١/٣۔ اس کی سند ”منقطع“ ہے۔ کیونکہ امام زہری رحمہ اللہ اس اثر کو حضرت ابوبکر صدیق سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

❷ الإحكام لابن حزم: ٢/٢٥٨، توجيه النظر: ١/٧٤، امام ابن حزم رحمہ اللہ نے یہ الفاظ حضرت ابوبکر صدیق کی اس روایت کے متعلق کہے ہیں، جس میں دادی کی توریث کا ذکر ہے کیونکہ قبيصة بن ذويب اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان ”انقطاع“ ہے۔

"یہ حدیث صحیح نہیں، مشکوک ہے، اس کا جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہے۔" ❶

اس کے جھوٹا ہونے کیلئے یہ کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ والوں کی طرف عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اُن کا وزیر بنا کر بھیجا اور کہا: "یہ دونوں بدری ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اصحاب میں سے ہیں، ان کی اقتداء کرو اور ان کی باتیں سنو۔ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تمہارے پاس اپنی ذات پر ترجیح دے کر بھیجا ہے۔" ❷ (تذکرہ : ١٤)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر:

❺ ایک روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"قرظۃ بن کعب! لوگوں کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا اور یہ روائتیں نہ سنانا۔"

جواب:

(۱) اس حدیث کو پورے طور پر لکھا نہیں گیا، ورنہ اس کا مطلب ظاہر ہو جاتا۔ "تذکرۃ الحفاظ" میں یہ روایت اس طرح ہے:

"عن الشعبي عن قرظة بن كعب قال لما سيّرنا عمر إلى العراق مشى معنا عمرو قال أتدرون لم شيعتكم قالوا نعم

---

❶ امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ اثر "منقطع" ہے، ابراہیم نے حضرت عمر کی زندگی کے صرف تین سال پائے ہیں، حالانکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں تھے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ اثر "صحیح" نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد: ١/٣٤٦ (٦٦٦)

❷ تذاكرة الحفاظ: ١/١٤ (٥) نیز دیکھیں: طبقات ابن سعد: ٣/٢٥٥، ٦/٧

تکرمة لنا وقال مع ذلك أنكم تأتون أهل قرية لهم دوي بالقرآن كدوي النحل فلا تصدوهم بالأحاديث فتشغلوهم، جردوا القرآن وأقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا شريككم فلما جاء قرظة قالوا حدثنا فقال نهانا عمر رضي الله عنه" ❶

"قرظہ بن کعب کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ہم کو عراق کی طرف بھیجا، تو ہمارے ساتھ خود ہی چلے اور فرمایا: کیا تمہیں علم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں چلا ہوں؟ انہوں نے کہا: ہماری عزت افزائی کے لیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات بھی ہے اور ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ تم ایسے شہر میں جا رہے ہو، جہاں لوگ قرآن لگاتار پڑھتے رہتے ہیں۔ تم حدیثوں کے ساتھ ان کو قرآن پڑھنے سے مت روکنا، قرآن کو خالص رکھو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات کم بیان کرو، پھر میں تمہارا شریک ہوں۔ چنانچہ قرظہ بن کعب آئے، تو لوگوں نے کہا: ہمیں حدیث سنائیے! تو آپ نے کہا کہ ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرما دیا ہے۔"

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کرنے سے نہیں روکا، بلکہ یہ کہا ہے کہ روایات کم بیان کرو۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کا زیادہ وقت اسی میں صرف ہو جائے اور وہ قرآن پڑھنے سے رک جائیں۔

ب: قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے کتب احادیث میں روایات موجود ہیں۔

ج: یہ اثر بلحاظ سند کے صحیح نہیں۔ "توجیہ النظر" (صفحہ: ۸) میں لکھا ہے:

❶ تذکرة الحفاظ: ۱/ ۷ (۲)

''شعبی کی ملاقات قرظہ سے نہیں ہوئی، لہٰذا یہ اثر ساقط اور باطل ہے''۔ ❶

''مختصر جامع بیان العلم'' (صفحہ ۱۷) میں ہے:

''والآثار الصحاح عنه من رواية أهل المدينة بخلاف حديث قرظة وإنما يدور على بيان عن الشعبي وليس مثله حجة في هذا الباب لأنه يعارض السنن والكتب''

''صحیح آثار جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور مدینہ کی روایت میں ثابت ہیں، وہ قرظہ کی روایت کے خلاف ہیں۔ قرظہ کی روایت کا مدار ''بیان عن الشعبي'' ہے اور وہ اس باب میں سند نہیں۔'' ❷

و: ''دارمی'' میں ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے تم قرآن مجید کا علم حاصل کرتے ہو، ایسے ہی فرائض، لغت اور سنن یعنی آنحضرت ﷺ کی حدیثیں بھی سیکھو۔'' ❸

ح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پانچ سو سے بھی زیادہ حدیثیں مروی ہیں۔ ❹

(توجيه النظر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تیسرا اثر:

❻ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے رسول

---

❶ توجيه النظر: ۱/۷۳، نیز دیکھیں: الإحكام لابن حزم: ۲/۲۵۶۔ اس اثر کی سند ''صحیح'' ہے اور سند میں انقطاع بھی نہیں ہے۔

❷ جامع بیان العلم: ۲/۱۰۰۶، لیکن شعبی سے یہ اثر بیان کرنے میں ''بیان بن بشر'' منفرد نہیں، بلکہ شعبی کے دوسرے ثقات شاگردوں نے بھی ان کی متابعت کی ہے۔

❸ سنن الدارمي: ۲/۴۴۱ (۲۸۵۰)

❹ الإحكام لابن حزم: ۲/۲۵۷، توجيه النظر: ۱/۷۴

کریم ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کا اسوہ لکھنے کا ارادہ کیا، مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے، پھر فرمایا:

"کان قبلکم قوم کتبوا کتباً فأکبوا علیها و ترکوا کتاب اللّٰه وإني واللّٰه لا أشوب کتاب اللّٰه بشيء أبدا" ❶

(کتاب جامع بیان العلم ۔مصری ۔: ۳۳)

"تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گزرے، جنھوں نے کتابیں لکھیں اور خدائی کتاب کو چھوڑ کر انھی پر جھک پڑے۔ خدا کی قسم! میں کتاب اللہ میں کسی شیئے کو نہیں ملاؤں گا۔"

جواب:

ا: اس روایت کی سند اس طرح ہے:

"وعن عروة أن عمر بن الخطاب..............."

حالانکہ عروۃ کی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں۔ ❷ جس سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، اسی سال وہ پیدا ہوئے۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ چھ سال بعد پیدا ہوئے، ❸ اس لئے یہ روایت سند کے لحاظ سے باطل ہے۔

ب: اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

"لا أشوب بکتاب اللّٰه"

---

❶ جامع بیان العلم: ۱/ ۲۷۵ (۳۴۳) یہ "اثر" دیگر طرق سے بھی مروی ہے، لیکن ان کی اسانید میں شدید ضعف پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ "اثر" کسی طرح بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

❷ دیکھیں: جامع التحصیل: ۲۳۶ (۵۱۵)

❸ تاریخ خلیفة: ۱۵۶، سیر أعلام النبلاء: ٤/ ٤٢٢

"میں اللہ کی کتاب سے کوئی چیز نہیں ملاؤں گا۔"

اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، تو سب نے لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث لکھنے کے قائل تھے، صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے قائل نہ تھے۔

ج: "موطا" میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز کے بارہ میں اور اوقات کے متعلق سب عمال کو لکھا۔ ❶

د: مستدرك حاكم، دارمی اور جامع بيان العلم میں [حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول] ہے:

((قيدوا العلم بالكتابة))

"علم کو ضبط تحریر میں لاؤ۔" ❷

ج: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لکھ کر بھیجی۔ ❸

(مسلم: ۲/ ۱۹۱)

د: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو منع کی روایت ہے، بلحاظ اس کے باطل ہے کہ یہ ان ادلہ صحیحہ کے مقابلہ میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، قابل التفات نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چوتھا اثر:

❹ "طبقات ابن سعد" کے حوالہ سے ایک اور روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل

---

❶ المؤطا: ۱/ ٦ (٦)

❷ سنن الدارمي: ۱/ ۱۳۸ (٤۹۷)، مصنف ابن أبي شيبة: ۳۱۳٥، المستدرك ۱/ ۱۷۸ (۳٥۹)، جامع بيان العلم: ۱/ ۳۰۹، المدخل للبيهقي: ۲/ ۲۳٤ (۷٥۸) المحدث الفاصل: ۳۷۷، یہ اثر دیگر کئی صحابہ سے بھی مرفوعاً و موقوفاً مروی ہے۔

❸ صحيح مسلم: كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة، رقم الحديث (۲۰٦۹)

کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ۔ ذخیرہ جمع ہو گیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اسے جلا دیا۔ ❶

جواب:

یہ اثر بچند وجوہ باطل ہے:

ا: مذکورہ اثر منقطع ہے، اس کی سند اس طرح ہے:

زید بن یحییٰ، عبداللّٰہ بن علاء سے اور وہ "قاسم بن محمد" سے..... اور قاسم مذکور کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہے، کیونکہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئے۔ ❷

ب: بلا تنقید و تحقیق لکھا ہوا جلا دینا خلافِ عقل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے فہیم آدمی کا یہ کام نہیں ہو سکتا۔

ج: اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے، تو دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم جو کتابت کے قائل تھے، ضرور انکار کرتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر:

❽ بعض نے یہ کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف سینکڑوں احادیث منسوب ہیں، لیکن ابو عمرو شیبانی بیان کرتے ہیں: "میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں برسوں رہا اور ان کی زبان سے کوئی حدیث نہ سنی۔ ہاں جب کبھی مجبوراً

❶ الطبقات الكبرى: ٥/١٨٨

❷ "القاسم بن محمد بن أبي بكر" خلافت علی رضی اللہ عنہ کے دوران پیدا ہوئے تھے۔ (سير أعلام النبلاء: ٥/٥٤) نیز دیکھیں: طبقات خليفة: ٢٤٤، تهذيب الكمال: ٢٣/٤٣٥۔

کوئی حدیث بیان کرنی پڑتی، تو خوف سے کانپنے لگتے اور فرماتے رسول اللہ ﷺ نے غالبًا یوں ہی فرمایا تھا۔''

جواب:

ا: اصل لفظ یہ ہیں: ''میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک سال بیٹھا، آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے حدیث نقل نہیں کرتے تھے، جب کبھی یہ کہتے: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' آپ کانپنے لگتے اور فرماتے کہ اس طرح فرمایا یا اس کے قریب یا اس کے ہم معنی۔'' [1] (تذکرہ الحفاظ: ١/١٥)

ب: اس اثر سے حدیث کی نفی نہیں، بلکہ اثبات معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرنے میں سخت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک ان کو پورا یقین نہ ہوتا، اس وقت تک حدیث بیان نہ کرتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر:

٩ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک اور اثر نقل کرتے ہیں:

''آپ کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا، آپ نے اس کے بعد فرمایا: پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے نوشتوں کے پیچھے لگ کر اصل کتاب کو چھوڑ دیا۔'' [2]

جواب:

ا: یہ اثر بھی صحیح نہیں، کیونکہ ابن عبدالبر کی أبوبکر بن أبي شيبة سے ملاقات

---

[1] المعجم الكبير: ٩/١٢٢ (٨٦١٣)، تاريخ أبي زرعة: ٧٢، المحدث الفاصل: ٥٤٩، تاريخ دمشق: ٣٣/١٦٤، الإلماع: ١٧٧

[2] مصنف ابن ابي شيبة: ٥/٣١٥ (٢٦٤٤٧)، جامع بيان العلم: ٢/٢٧٨ (٣٥٠)

نہیں ہوئی، سو سال کا فاصلہ ہے۔

ب: اس میں ''اعمش'' ہے جو ''مدلس'' ہے اور ''عن'' سے روایت کرتا ہے، جو ناقابل استدلال ہے۔

ج: اس کی سند میں ''ابو معاویہ'' ہے، اس کنیت والے بہت سے ہیں، بعض معتبر اور بعض غیر معتبر، ایسی حالت میں حدیث غیر معتبر ہوتی ہے۔ [1]

اس اثر میں یہ بھی ذکر نہیں کہ اس نوشتے میں حدیث رسول تھی یا کوئی اور کلام۔ اس قصہ کے ایک راوی ابوعبید کہتے ہیں: دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہل کتاب سے لیا گیا تھا، اسی واسطے حضرت عبداللہ نے اسے مکروہ جانا۔'' (صفحہ: ٣٤) [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر:

(۱۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ''آپ نے لکھی ہوئی حدیثوں کو مٹانے کا حکم دیا اور فرمایا: گذشتہ قومیں اس طرح تباہ ہوئیں کہ انہوں نے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اپنے رب کی کتاب کو چھوڑ دیا۔'' [3]

---

[1] یہ اثر مصنف ابن أبي شيبه میں موجود ہے، جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے ذکر کیا ہے (٣١٥/٥، (٢٦٤٤٧) لہٰذا ابن عبد البر کی ابن ابی شیبہ سے عدمِ لقاء کا اس اثر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور سند میں مذکور ''ابو معاویہ'' کا نام ''محمد بن خازم الضرير الكوفي'' ہے جو ''ثقة ثبت في الأعمش'' اور امام اعمش کے اخص تلامذہ سے ہیں۔ (تهذيب الكمال: ١٢٤/٢٥)

[2] جامع بيان العلم: ٢٨٣/١ (٣٥٨) اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد امام مرة بن شراحيل الهمداني فرماتے ہیں: أبو مرة الكندي حضرت عبد اللہ بن مسعود کے پاس اہل کتاب کی کتب سے ایک کتاب لے کر آئے، تو ابن مسعود نے اسے مٹا دیا، مرة الهمداني کہتے ہیں: اگر وہ قرآن یا نبی اکرم ﷺ کی سنت ہوتی، تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اسے نہ مٹاتے، مگر وہ یہود و نصاریٰ کی کتاب تھی، اس لیے انھوں نے اسے مٹا دیا۔ (سنن الدارمي: ١٣٤/١ (٤٧٧)

[3] مصنف ابن أبي شيبة: ٣١٤/٥ (٢٦٤٣٩)، جامع بيان العلم: ٢٧١/١ (٣٣٧)

جواب:

ا: اصل الفاظ یہ ہیں کہ:

"حيث تتبعوا أحاديث علماء هم"

"یعنی جب انہوں نے علماء کی باتوں کی پیروی کی"

یہ روایت بھی بلحاظ سند معتبر نہیں:

ب: اس میں "بقية" ہے، جو قابل وثوق نہیں۔

ج: اس میں "عبداللہ بن یسار" ہے، جو "مجہول" ہے۔ [1]

د: اس میں علماء کی باتوں کی پیروی کا ذکر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی احادیث کا ذکر نہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کی احادیث تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قلمبند کی تھیں، جیسے بخاری میں ہے۔ [2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تیسرا اثر:

⑪ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی بطور معارضہ پیش کی جاتی ہے:

---

❶ اس کی سند میں "بقي بن مخلد" ہیں، جو کہ "ثقہ" ہیں، دیکھیں: تاريخ دمشق: ٣٥٤/١٠ (٩٣٥)، سير أعلام النبلاء: ٢٨٥/١٣۔ بعض مطبوعہ نسخوں میں "بقية" غلطی سے لکھا گیا ہے، کیونکہ وہ اس طبقہ کے راوی نہیں۔
مزید برآں ابن ابی شیبة کی سند میں یہ "بقي بن مخلد" بھی نہیں ہیں اور دوسرا راوی "عبد الله بن يسار الجهني الكوفي" ہے، جو کہ "ثقہ" ہے۔ (الثقات لابن حبان: ٥١/٥ (٣٨٠٥)، تهذيب الكمال: ٣٢٦/١٦ (٣٦٦٨)، الكاشف: ٦٠٩/١ (٣٠٦٥)، تقريب التهذيب: ٣٣٠ (٣٧١٧) لیکن اس کی سند میں "جابر بن يزيد الجعفي" راوی "متروك" ہے۔ (التاريخ الكبير: ٢١٠/٢، الضعفاء للنسائي: ٢٨ (٩٨) تهذيب الكمال: ٤٦٥/٤ (٨٧٩)، تهذيب التهذيب (٤١/٢) لہٰذا یہ اثر سخت "ضعیف" ہے۔

❷ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب كتابة العلم، رقم الحديث (١١١)

"إذا أردتم العلم فانثروا القرآن فإن فيه علم الأولين والآخرين" (تذكره : ١٥)

"جب تم علم چاہو تو قرآن کو پھیلاؤ، اس میں غور و فکر کرو، کیونکہ اس میں اوّلین اور آخرین کا علم موجود ہے۔ ❶

جواب:

روایت کے الفاظ ہی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اثر حدیث کے خلاف نہیں پیش ہوسکتا، کیونکہ اس میں قرآن کی فضیلت ہے، حدیث کا انکار نہیں!

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر:

⑫ آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں گئے۔ انہوں نے آپ سے احادیث کی فرمائش کی۔ آپ نے چند احادیث سنائیں اور منشی دربار ساتھ ساتھ لکھتا گیا۔ آپ نے وہ کاغذ لیکر چیر ڈالا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کے لکھنے سے منع کیا ہے۔ ❷

جواب:

ا: یہ حدیث ابوداؤد کی ہے، مگر اس کی سند صحیح نہیں۔

ب: زید اور مطلب بن عبداللہ قابل وثوق نہیں۔ ❸

---

❶ المعجم الكبير: ١٣٦/٩ (٨٦٦٦) مصنف ابن أبي شيبة: ١٢٦/٦ (٣٠٠١٨)، الزهد لابن المبارك: ٢٨٠، اس کی سند "صحیح" ہے۔

❷ سنن أبي داود: كتاب العلم، باب في كتاب العلم، رقم الحديث (٣٦٤٧)

❸ اس کی سند میں دو راوی " كثير بن زيد" اور " المطلب بن عبد الله" ہیں، "كثير بن زيد السهمي المدني" حسن الحديث ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "صدوق يخطئ" نیز دیکھیں: الجرح والتعديل: ١٥٠/٧، الثقات لابن حبان: ٣٥٤/٧ (١٠٤١١) تهذيب الكمال: ←

ج: اس کتاب میں اس کے راوی کی دلیل بھی موجود ہے، لکھا ہے:

”زید بن ثابت کہتے ہیں: کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے یہود کی کتابت پر اعتبار نہیں، تم یہود کی کتابت سیکھ لو۔“ پس میں نے آدھے مہینے میں ان کی کتابت سیکھ لی، پھر آنحضرت ﷺ کوئی خط ان کو لکھواتے تو میں ہی لکھتا۔“ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے اور بخاری میں تعلیقاً موجود ہے۔ ❶

د: زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرائض (علم میراث) میں ایک کتاب لکھی تھی۔ ❷ (توجیہ النظر)

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث:

❸ یہ حدیث یوں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ تین آوازیں دیں اور واپس چل دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ باہر نکلے، واپس

← ٢٤/١١٣ (٤٩٤١) اور ”المطلب بن عبد الله بن حنطب“ ثقہ ہے۔ (مشاهير علماء الأمصار: ٧٤ (٥٢١)، الثقات لابن حبان: ٥/٤٥٠ (٥٦٦٧)، تهذيب الكمال: ٢٨/٨١ (٦٠٠٦)، الكاشف: ٢/٢٧٠ (٥٤٨٣)

اس اثر میں وجہِ ضعف ”المطلب بن عبد الله بن حنطب“ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے درمیان ”انقطاع“ ہے۔ (جامع التحصيل: ٢٨١ (٧٧٤)

❶ صحيح البخاري ـ تعليقاً مجزوما به۔ كتاب الأحكام، باب ترجمة الحكام، سنن أبي داود: كتاب العلم، باب رواية حديث أهل الكتاب، رقم الحديث (٣٦٤٥)، سنن الترمذي: كتاب الاستئذان، باب ما جاء في تعليم السريانية، رقم الحديث (٢٧١٥) اسے امام ترمذی، حاکم اور ذہبی رحمہم اللہ نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

❷ توجيه النظر: ١/٥٠، نیز دیکھیں: سنن سعيد بن منصور: ١/٤٥، سنن البيهقي: ٦/٢١٠، المعرفة والتاريخ للفسوي: ١/٤٨٦، سير أعلام النبلاء: ٢/٤٣٦۔

جانے کا سبب پوچھا، تو کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم گھر پر تین آوازیں دو۔ اگر صاحب خانہ نہ بولے، تو لوٹ جاؤ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس حدیث کی شہادت پیش کرو، ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ وہ گھبرائے ہوئے مسجد نبوی میں پہنچے اور خوش قسمتی سے انہیں شہادت مل گئی۔ [1] ورنہ پٹ جاتے۔" (تذکرۃ: ۱/۶) [2]

جواب:

یہ حدیث منکرین حدیث پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حدیث مثبتین کی زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث کے حجت ہونے کا انکار نہیں کیا، بلکہ احتیاط کیلئے اس پر شہادت طلب کی اور شہادت ملنے پر فرمایا: "میں نے تم کو متہم نہیں سمجھا، شہادت اس لئے طلب کی ہے، تاکہ لوگ حدیث میں دلیری نہ کریں۔" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ حدیث کے متعلق سخت احتیاط کرتے تھے۔ حکومت خاص طور پر اس طرف متوجہ تھی۔

قرآن مجید میں جو ذکر ہے:

﴿ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارتضى لهم ﴾ [3]

"(ان خلفاء کی معرفت) ان کے اس دین کو جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے، زمین میں نافذ کرے"

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الاستئذان ، باب التسليم والاستئذان ثلاثا، رقم الحديث (۵۸۹۱)، صحيح مسلم: كتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحديث(۲۱۵۳)

[2] تذكرة الحفاظ: ۱/۶، "ورنہ پٹ جاتے" کے الفاظ معترض کی خانہ ساز تشریح ہے، روایت میں ایسے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔

[3] النور: ۵۵

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی انہی مساعی جمیلہ اور حزم و احتیاط کی طرف اشارہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم حدیث کو حجت سمجھتے ہیں۔

ضحاک بن مزاحم کا اثر:

ضحاک فرمایا کرتے تھے:

"وہ زمانہ چلا آ رہا ہے کہ جب احادیث کی کثرت ہو جائے گی، لوگ کتاب الٰہی کو ترک کر دیں گے، مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی اور وہ گرد و غبار کے نیچے یوں دب جائے گی کہ نظر تک نہیں آ سکے گی۔"[1] (جامع:۳۳)

جواب:

یہ اثر بلحاظ سند کے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں، بلکہ باطل ہے۔ کیونکہ:

ا۔ اس کی سند میں سیف بن ہارون ہے۔ جو "ضعیف" اور "متروك الحديث"

---

[1] جامع بیان العلم:۲/۱۰۲٤ (۱۹۵٤) اس کی سند میں "سیف بن هارون البرجمي "ضعیف ہے۔ ابن معین نے اسے "لیس بشيء"، نسائی نے "ضعیف" دارقطنی نے "ضعیف متروك" اور امام ابو داود نے "لیس بشيء" کہا ہے۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں: "یروي عن الأثبات الموضوعات" حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "ضعیف أفحش ابن حبان القول فیه" (تاریخ ابن معین ـ روایة الدوري:۱/٤۲۱ (۲۰٦٤) الضعفاء للنسائي:٤۹ (۲۵٤)، سوالات البرقاني للدارقطني :۳٤ (۲۰۳) المجروحین لابن حبان:۱/۳٤٦ (٤٤٤)، تهذیب الکمال: ۱۲/۳۳۲ (۲٦۷۹)، تقریب التهذیب: ۲٦۲ (۲۷۲۷) مزید برآں سیف بن ہارون کا استاد بھی اس سند میں "مجہول" ہے۔

حافظ ابن عبدالبر نے انہی معنوں میں ضحاک بن مزاحم کا ایک دوسرا قول بھی نقل کیا ہے۔ (جامع بیان العلم:۱/۲۷۹ (۳۵۱) لیکن اس کی سند میں " سنان بن هارون أخو سیف بن هارون البرجمي" ضعیف ہے۔ (المجروحین لابن حبان:۱/۳۵٤ (٤٦۱) الضعفاء للعقیلي :۲/۱۷۱ (٦۸۸)، تهذیب الکمال:۱۲/۱۵۵ (۲۵۹۸) تهذیب التهذیب: ٤/۲۱۳

یہاں تک کہ ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جھوٹی روایتیں نقل کیا کرتا ہے۔

جریر کا اثر:

⑫ وہ کہتے ہیں کہ "منصور، مغیرہ اور اعمش محدثین کی کتابتِ احادیث کو گناہ سمجھتے تھے۔"

جواب:

اس کا ترجمہ "گناہ سمجھتے تھے" ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ خیال کرتے تھے، حدیث کا یاد رکھنا بہتر ہے اور لکھنا مکروہ ہے۔

اثر کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"كانوا يكرهون كتابة الحديث"[1] (جامع: ٣٤)

ابن عبدالبر نے یہ آثار اپنی کتاب "جامع" میں نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ لکھا ہے کہ یہ لوگ جو کمال درجہ کا حفظ رکھتے تھے، پیدائشی طور پر ان کا حافظہ بہت قوی تھا، جیسے عربوں کی حالت تھی کہ ایک دفعہ بات کو سن کر یاد کر لیتے تھے، جیسے ابن شہاب سے مروی ہے کہ:

"میں بقیع میں کان بند کر کے گذرتا ہوں، تاکہ میرے کان میں کوئی بری بات نہ داخل ہو جائے، اللہ کی قسم! میرے کان میں کوئی چیز پڑ جائے، تو میں اس کو کبھی بھی نہیں بھولا۔"[2]

اور شعبی سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ یہ لوگ عرب تھے[3] اور عرب کا

---

1. جامع بيان العلم: ١/ ٢٩٠ (٣٧٠) تقييد العلم: ١٤٨ اس کی سند میں "عمر بن محمد الجمحي" مجہول الحال ہے۔ الجرح والتعديل: ٦/ ١٢٧، لسان الميزان: ٤/ ٣٢٠ (٩٠٤)
2. جامع بيان العلم: ١/ ١٩٦ (٣٨٢)
3. جامع بيان العلم: ١/ ٢٩٦ (٣٨٣)

حافظہ بہت قوی تھا، کتنے کتنے اشعار بعض عرب ایک دفعہ سننے سے یاد کر لیتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عمر بن ابی ربیعہ کا قصیدہ ایک ہی دفعہ سن کر یاد کر لیا تھا[1] مگر آج کل حافظہ اتنا قوی نہیں۔ اگر کتاب نہ ہو، تو علم ضائع ہو جائے۔ اسی لئے بہت سے علماء نے کتابت حدیث کی رخصت دی ہے۔ ابراھیم نخعی کے حافظہ میں اخیر عمر میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا۔ منصور کہتے ہیں کہ إبراھیم حدیث حذف کر دیتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: سالم بن أبي الجعد حدیث یوں بیان کرتا ہے۔ إبراھیم نے کہا: سالم لکھتا تھا اور میں لکھتا نہیں تھا۔[2]

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ نخعی باوجودیکہ وہ کتابت کو مکروہ جانتے تھے، اخیر وہ بھی کتابت کی فضیلت کے قائل ہو گئے۔[3]

ابو خالد احمر کا اثر

⑮ کہتے تھے:

”یأتي علی الناس زمان تعطل فیها المصاحف لا یقرأ فیها ویطلب الحدیث والرأي“[4]

---

[1] جامع بیان العلم: ۱/ ۲۹٦

[2] جامع بیان العلم: ۱/ ۲۹۷ (۳۸۵)

[3] جامع بیان العلم: ۱/ ۲۹۷

[4] جامع بیان العلم: ۲/ ۱۰۲۱ (۱۹٤۷) سیر أعلام النبلاء: ۹/ ۲۱ اس کی سند میں ”عبد الباقي بن قانع“ ضعیف ہے۔(تاریخ بغداد: ۱۱/ ۸۸ (۵۷۷۵) ، لسان المیزان: ۳/ ۳۸۳ (۱۵۳٦)، الکواکب النیرات: ۷۰ (٤٦) حافظ ابن عبدالبر کے استاد“ عبد اللّٰہ بن محمد بن عبد المومن“ کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں: من قدماء شیوخ أبي عمر بن عبد البر کان تاجرا صدوقا لقي ابن داسة والکبار ، قال ابن الفرضي: لم یکن ضبطه جیداً و ربما أخل بالهجاء“ میزان الاعتدال: ٤/ ۱۹۱، لسان المیزان: ۳/ ۳۵۳ (۱٤۲۸) ابن الفرضي کے اصل الفاظ یہ ہیں: ←

”ایک زمانہ ایسا بھی آرہا ہے، کہ لوگ قرآن شریف نہ پڑھیں گے، حدیث اور رائے کو طلب کریں گے۔“

جواب:

① یہ اثر بھی حدیث کی صحت اور کتابت کے منافی نہیں، کیونکہ اس میں قرآن نہ پڑھنے کی مذمت ہے۔ کیونکہ أبو خالد احمر کے زمانہ میں حدیث اور رائے کی کتابت اور پڑھنے کا بہت رواج تھا۔

② اس کی سند میں ”عبداللّٰہ بن محمد“ ہے اور اس کا حافظہ بہت خراب تھا۔

③ اس میں لکھا ہے کہ اس کے دو راوی ہیں، جن میں ایک ”ضعیف“ ہے اور دوسرا ”زندیق“۔ ❶

④ قرآن اس وقت معطل نہیں، پڑھا جاتا تھا، ہاں ان کے خیال میں ایک ایسا زمانہ آنے والا تھا، جس میں قرآن معطل ہو جائے گا اور اس کا پڑھنا ختم ہو جائے گا۔

”دواسلام“ میں لکھا ہے کہ وہ زمانہ دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے۔

(ص ٦٢)

اور کہنے والے کی وفات ۱۹۰ھ بتا رہے ہیں اور کہنے والا کہتا ہے کہ وہ زمانہ ابھی نہیں بلکہ آئندہ آئیگا، پھر دوسری صدی سے کیسے شروع ہوا؟

← ”كان كثير الحديث مسندا صحيحا للسماع، صدوقا في روايته إلا أن ضبطه لم يكن جيدًا، و كان ضعيف الخط ربما أخل بالهجاء“ (تاريخ علماء الأندلس: ١/٤٢٣ (٧٥٥)۔

❶ اس کلام کا مرجع و مفہوم معلوم نہیں ہو سکا، کیونکہ اس اثر کی سند میں ایسا کوئی راوی نہیں جس کو کسی محدث نے ”زندیق“ کہا ہو۔ واللہ أعلم

شعبہ کا اثر

⑫ " ليس شيٌ أبغض إليّ من أن أرىٰ واحدا منهم " ❶

(جامع :١٨٦)

❶ جامع بيان العلم:٢/١٠٢٨ (١٩٦٨) اس اثر کی سند یہ ہے:قال ابن عبد البر: أخبرنا أحمد بن محمد بن أحمد، نا أحمد بن الفضل، نا محمد بن جرير الطبري قال ثنا عبد الله بن الدورقي ثنا محمد بن بكار العيشي قال سمعت ابن أبي عدي يقول قال شعبة......" رواۃ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

① أحمد بن محمد بن بن أحمد بن سعيد بن الحباب بن الجسور أبو عمر القرطبي" حافظ ذہبی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:" كان خيرا فاضلاً شاعرا عالي الإسناد مكثرا" ، حمیدی فرماتے ہیں:"محدث مكثر" (جذوة المقتبس في ذكر ولاة الأندلس:٣٩۔ من اسمه أحمد۔ تاريخ الإسلام للذهبي ، تاريخ الأدب الأندلسي:٢٥٥)

② " أحمد بن الفضل بن العباس البهراني الخفاف أبوبكر الدينوري" ابن الفرضی کہتے ہیں:لزم محمد بن جرير الطبري و خدمه و تحقق به و سمع منه مصنفاته فيما زعم، و لم يكن ضابطا لما روى و كان إذا أتي بكتاب من كتب الطبري، قال: قد سمعته منه و سمعته يقرأ عليه و يحدث به عنه...... و كان عنده مناكير قد تسهل الناس فيه و سمعوا منه كثيراً۔

ابن الفرضي، محمد بن يحيى سے نقل کرتے ہیں:و ما كان ممن يكتب عنه بحال" (تاريخ علماء الأندلس:١/٢٥ (٢٠٣) جذوة المقتبس:٥١، تأريخ دمشق:٥/١٦٤(٧٩)، ميزان الاعتدال: ١/٢٧٢، لسان الميزان :١/٢٤٦ (٧٦٩)

③ "محمد بن جرير أبو جعفر الطبري" "الإمام الجليل المفسر، ثقة صادق فيه تشيع يسير و موالاة لاتضر (تاريخ بغداد:٢/١٦٢ (٥٨٩) ، تاريخ دمشق:٥٢/ ١٨٨ (٦١٦٠) تذكرة الحفاظ:٢/٧١٠ (٧٢٨)، لسان الميزان:٥/١٠٠ (٣٤٤)

④ "عبد الله بن أحمد بن إبراهيم الدورقي" بعض مطبوعہ نسخوں میں غلطی سے "محمد بن عبد اللہ دورقی" لکھا گیا ہے،(دیکھیں: جامع بيان العلم:٢/١٠٢٨۔حاشیہ:٣۔طبعة دار ابن الجوزي) ←

یعنی ''سب سے زیادہ قابل نفرت یہی لوگ ہیں۔''

جواب:

یہ اثر باطل ہے:

① اس کی سند میں أحمد بن محمد "متهم" ہے۔

② دوسرا محمد بن فضل "منكر الحديث" ہے۔

③ تیسرا محمد بن عبدالله دورقی "مجهول" ہے۔[1]

شعبہ کا دوسرا اثر:

④ "إن هذا الحديث ليصدكم عن ذكر الله فهل أنتم منتهون"[2]

← ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:"صدوق" امام دارقطنی نے انھیں "ثقه" قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعديل: ٥/٦، سوالات الحاكم للدارقطني: ١٢١، (١٢٠)

⑤ محمد بن بكار بن الزبير العيشي الصيرفي "ثقه" ہے اور صحیح مسلم کے رواۃ سے ہے۔(تقريب التهذيب : ٤٧٠ (٥٧٥٩)

⑥ محمد بن إبراهيم بن أبي عدي أبوعمرو السلمي "ثقة" (تهذيب الكمال: ٣٢٢/٢٤ (٥٠٢٩) تذكرة الحفاظ: ٣٢٤/١، تهذيب التهذيب: ١٢/٩)

[1] اس سند میں مذکور'' أحمد بن محمد بن أحمد" متهم نہیں ہے۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم! اسی طرح سند میں مذکور "أحمد بن الفضل" راوی بھی'' منكر الحديث'' نہیں ہے۔ لیکن قابل احتجاج بھی نہیں ہے۔ اور " عبد الله بن أحمد الدورقی" کو ابن ابی حاتم نے "صدوق" اور دارقطنی نے "ثقه" قرار دیا ہے۔

[2] جامع بيان العلم: ١٠٢٩/٢ (١٩٦٩) ، شرف أصحاب الحديث(١١٤)۔ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے یہ اثر اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

قال ابن عبد البر أخبرنا عبد الوارث بن سفيان أنا قاسم بن أصبغ ثنا أحمد بن زهير حدثنا عبيد الله بن عمر قال نا يحيى بن سعيد القطان قال سمعت شعبة يقول......" ←

← ① " عبد الوارث بن سفيان بن جبرون" روى عن قاسم بن أصبغ فأكثر...... و روى عنه ابن عبد البر و أثنى عليه ، و قال: كان من ألزم الناس لأبي محمد قاسم بن أصبغ و من أشهر أهل قرطبة بصحبته ، حتى يقال إنه قلما فاته شيٌ مما قرئ عليه...... و قال ابن عبد البر : رأيت كثيرا من أصول قاسم بن أصبغ، فرأيت سماعه في جميعها و حدث بعلم جم (جذوة المقتبس في ذكر ولاة الأندلس:١٠٦)

② "قاسم بن أصبغ بن محمد بن يوسف الأندلسي القرطبي" الامام الحافظ محدث الأندلس ، صدوق' (تذكرة الحفاظ:٣/٨٥٣ (٨٣١)، لسان الميزان: ٤/٤٥٨ (١٤١٥)

③ أحمد بن زهير بن حرب أبو بكر بن أبي خيثمة النسائي " امام دارقطنی فرماتے ہیں:"ثقة مامون" حافظ خطیب بغدادي لکھتے ہیں: " كان ثقة عالما متقنا حافظا بصيرا بأيام الناس...... و له كتاب التاريخ الذي أحسن تصنيفه و أكثر فائدته ...... ولا أعرف أغزر فوائد من كتاب التاريخ......" (سوألات الحاكم للدارقطني:٨٨(١١) ، تاريخ بغداد:٤/١٦٢(١٨٤٠)، لسان الميزان:١/١٧٤ (٥٥٦)

④ عبيد الله بن عمر بن ميسرة أبو سعيد القواريري البصري " ثقة ثبت ، حافظ" صحیحین کے راوی ہیں (الجرح والتعديل:٥/٣٢٧، التعديل والتجريح:٢/٨٩١، (٩٤٠)، تهذيب الكمال:١٩/١٣٠ (٣٦٦٩)، تقريب التهذيب:٣٧٣(٤٣٢٥)

⑤ " يحيى بن سعيد القطان التميمي "ثقة متقن حافظ إمام قدوة ، كان رأسا في العلم والعمل (تهذيب الكمال:٣١/ ٣٢٩ (٦٨٣٤)، تقريب التهذيب ٥٩١ (٧٥٥٧)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا یہی اثر اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

"قال الخطيب أخبرنا أبو الحسن محمد بن أحمد بن رزق البزار حدثنا عثمان بن أحمد الدقاق حدثنا الحسن بن مكرم حدثنا أبو الوليد، قال ح و أخبرنا أحمد بن محمد بن غالب الفقيه قال قرئ على إسحاق النعالي، و أنا أسمع حدثكم أبو خليفة قال سمعت أبا الوليد يقول سمعت شعبة يقول......" یہ سند بھی "صحیح" ہے۔اور ابوالولید کا نام "هشام بن عبد الملك الباهلي الطيالسي" ہے۔

جواب:

یہ اثر بھی باطل ہے:

① اس کی سند میں عبدالوارث "مجہول" ہے۔

② دوسرا راوی زہیر ہے، جو آخر مختلط ہے۔

شرف أصحاب الحديث میں اس کی ایک اور سند ہے، جس میں "محمد بن محمد" ہے۔ امام ابوداؤد کہتے ہیں: "اس کی چار سو روایتیں ذکر کی گئی ہیں اور سب کی سب باطل ہیں۔"[1]

③ اگر انہوں نے ایسا کہا بھی، تو اس کا مخاطب کوئی خاص آدمی یا شاگرد ہوگا، نہ کہ سب محدث! یا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ حدیث میں اتنا منہمک نہیں ہونا چاہیے کہ نماز کا بھی خیال نہ رہے۔ ایسا انہماک تو قرآن میں بھی جائز نہیں کہ آدمی قرآن پڑھتے پڑھتے نماز سے بھی غافل ہو جائے۔[2]

---

[1] عبد الوارث بن سفیان "مجهول" نہیں ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اسی طرح اس کی سند میں "أحمد بن زهير" ہے، جو کہ "ثقہ" ہے۔ اسے کسی نے "مختلط" نہیں کہا ہے۔ خطیب بغدادی کی سند میں "محمد بن محمد" نام کا کوئی راوی نہیں ہے۔ واللہ أعلم

[2] مذکورہ بالا اثر کے راوی ابوخلیفہ کہتے ہیں: امام شعبہ بن حجاج کا مقصد یہ ہے کہ حدیث کے طلبا جو کچھ سنتے ہیں، اس پر عمل کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ احادیث سننے کے لالچ میں عمل کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ حدیث اللہ کے ذکر سے نہیں روکتی، بلکہ وہ تو اس کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ امام احمد بن حنبل سے شعبہ بن حجاج رحمہ اللہ کے اس قول کے متعلق سوال کیا گیا، تو فرمانے لگے: شاید شعبہ روزہ رکھتے ہو، اور طلب حدیث میں مگن رہنے کی وجہ سے تکان محسوس کرتے ہو، اسی وجہ سے روزہ یا نیکی کا کوئی دوسرا عمل بجالانے سے عاجز رہ جاتے ہو۔
حافظ خطیب بغدادی فرماتے ہیں: کسی شخص کے لیے یہ کہنا روا نہیں کہ شعبہ رحمہ اللہ طلب حدیث کو بوجھ خیال کرتے تھے، یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ جب کہ حدیث میں ان کے مرتبہ و مقام ←

ایاس بن معاویہ کا اثر:

⑯ ''اللہ کی قسم میں بدمعاشوں سے اتنا نہیں ڈرتا، جتنا حدیث والوں سے ڈرتا ہوں۔'' [1]

جواب:

اصل بات یہ ہے کہ حدیث پڑھنا پڑھانا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس میں اگر غلطی ہو جائے، تو اس کا اثر سنانے والے پر بھی پڑتا ہے۔ جب حدیث سننے والے آتے، تو وہ ڈر جاتے کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہو جائے۔ بدمعاش سے تو بچ کر بھی رہا جا سکتا ہے، مگر حدیث سننے کی درخواست پر خاموش رہنا مشکل ہے۔ لہٰذا اس کا یہ

← کی بدولت ہی " أمير المومنين في الحديث" ان کا نام رکھا گیا؟ یہ مرتبہ ان کو صرف حدیث کی طلب میں تگ و دو کرنے کی وجہ سے دیا گیا، اور تمام عمران کا یہی مشغلہ رہا، یہاں تک کے حدیث کے جمع وطلب کے لالچ میں ہی انھیں موت نے آلیا۔

اس کے بعد خطیب بغدادی امام شعبہ بن حجاج کا قول نقل کرتے ہیں: بسا اوقات میں حدیث یاد کرتا ہوں، جب مجھے بھول جاتی ہے، تو اسی وجہ سے بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اسی طرح امام شعبہ کے سامنے ایک ایسی حدیث ذکر کی گئی، جو اس سے پہلے انھوں نے نہیں سنی تھی، تو فرمانے لگے: "واحزناه" ہائے افسوس!! شرف أصحاب الحديث(١١٤)

امام شعبہ بن حجاج کے طلب حدیث میں شدتِ حرص کا اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ خالد حذاء کے پاس گئے، جبکہ خالد اس وقت بیمار تھے۔ امام شعبہ بن حجاج ان کو کہنے لگے: آپ کے پاس ایک حدیث ہے، وہ مجھے بیان کردیں، خالد نے جواب دیا: میں بیمار ہوں شعبہ نے کہا: صرف ایک حدیث کی تو بات ہے! لہٰذا خالد نے ان کو بیان کردی، جب فارغ ہوئے تو شعبہ ان کو کہنے لگے: اب مرنا بھی چاہتے ہیں، تو بے شک مرجائیے۔ شرف أصحاب الحديث(١١٦)

[1] جامع بيان العلم: ١٠٣١/٢ (١٩٧٧) یہ اثر ایاس بن معاویہ کی بجائے " مغيرة الضبي " سے مروی ہے، اس کی سند میں إسحاق بن إبراهيم بن نعمان کا ترجمہ وتوثیق نہیں مل سکی۔ واللہ أعلم

مطلب نہیں کہ وہ پڑھنے یا پڑھانے کو برا سمجھ رہے ہیں، اگر ایسا ہوتا، تو حدیث کا مشغلہ ہی چھوڑ دیتے۔

امام داؤد طائی کا اثر:

⑲ امام داؤد طائی سے کسی نے پوچھا کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا ''میں بچوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔''

جواب:

اصل الفاظ یہ ہیں:

''قيل لداود الطائي ألا تحدث؟ قال ما راحتي في ذلك أكون مستمليا على الصبيان فيأخذون علي سقطي فإذا قاموا من عندي يقول قائل منهم أخطأ في كذا ويقول آخر غلط في كذا۔'' [1]

''یعنی داؤد طائی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حدیث نہیں سناتے؟ آپ نے فرمایا: مجھے بچوں پر حدیث پڑھنے میں کیا راحت ہے؟ وہ میری غلطیاں نکالیں گے۔ جب چلے جائیں گے،تو کوئی کہے گا کہ اس نے فلاں کلمہ میں خطا کی، دوسرا کہے گا: اس نے فلاں کلمے میں غلطی کی۔''

اس اثر میں داؤد طائی نے حدیث لکھنے یا پڑھنے پڑھانے کو منع نہیں بتایا بلکہ آپ نے ان کی درخواست نہ قبول کرنے کی معذرت بیان فرمائی ہے۔

[1] جامع بیان العلم:٢/١٠٢١ (١٩٤٨) اس کی سند میں بھی إسحاق بن إبراهيم بن نعمان ہے جس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ والله أعلم۔

فضیل بن عیاض کا اثر:

⓴ " إنكم قد ضيعتم كتاب الله ولو طلبتم كتاب الله لوجدتم فيه شفاء ثم قرأ ﴿ يا أيها الناس قد جاء تكم موعظة من ربكم وشفاءٌ لما في الصدور وهدى ورحمة للمؤمنين قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحوا هو خير مما يجمعون ﴾ " [يونس:٥٧-٥٨]

''تم لوگوں نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا ہے۔ اگر تم کتابِ الٰہی کی تلاش کرتے تو اس میں تمہیں شفاء مل جاتی ...... اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی (جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اے لوگو! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ضابطہ حیات آ چکا ہے۔ جس میں دل کی تمام بیماریوں کا علاج ہے اور جو اہل ایمان کیلئے ہدایت کلی اور رحمت ہے۔ اے رسول! مسلمانوں سے فرما دیجئے اللہ تعالیٰ کے اس فضل اور رحمت پر خوش ہو جاؤ۔ اور یہ قرآن اس چیز سے اچھا ہے، جسے وہ جمع کر رہے ہیں۔''

جواب:

أ: اس کی سند میں تین راوی ہیں:

① إسحاق بن ابراهيم۔

② محمد بن علي۔

③ أبوعبدالرحمن۔

یہ تینوں کے تینوں مجہول ہیں، لہٰذا یہ اثر سند کے لحاظ سے باطل ہے۔ [1]

---

[1] اس اثر کی سند میں یہ تینوں راوی نہیں ہیں۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ب: اس اثر میں بھی صرف قرآن کی مدح و تعریف اور جامعیت کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے فضیل کے یہ لفظ ہیں:

"ما هكذا كنا نطلب العلم ولكنا كنا نأتي المشيخة فلا نرىٰ أنفسنا أهلا للجلوس معهم فنجلس دونهم ونسترق السمع فإذا مر الحديث سألنا إعادته وقيدناه وأنتم تطلبون العلم بالجهل" (ص ١٨١) ❶

❶ جامع بيان العلم: ٢/١٠٢٣ (١٩٥٣) حافظ ابن عبدالبر نے اس اثر کی یہ سند ذکر کی ہے:

" قال ابن عبد البر أخبرنا أحمد بن محمد قال أنا أحمد بن سعيد ثنا أبو عمرو عثمان بن عبد الرحمن قال نا إبراهيم بن نصر أبو إسحاق السرقسطي ثنا أحمد بن مندوس ثنا ابن أبي الحواري قال أتينا فضيل بن عياض......" رواۃ کا ترجمہ یہ ہے:

① أحمد بن محمد بن أحمد بن الحباب بن الجسور أبو عمر القرطبي کے متعلق تفصیل گزر چکی ہے۔ دیکھیں:

② أحمد بن سعيد بن حزم بن يونس أبو عمر الصدفي الأندلسي قال ابن الفرضي: عني بالآثار والسنن و جمع الحديث" اس کے متعلق جرح و تعدیل نہیں مل سکی۔(تاريخ علماء الأندلس: ١/١٧، جذوة المقتبس: ٤٦، تأريخ الإسلام للذهبي۔

③ "عثمان بن عبد الرحمن بن عبد الحميد أبو عمروالقرطبي" قال ابن الفرضي: "كان فاضلا خيرا و قورا ضابطا لكتبه متقفا لروايته و كان حافظا للفقه مشاورًا للأحكام، سمعت محمد بن محمد بن علي و غيرهما ممن حدثنا عنه يثنون عليه و يوثقونه" (تاريخ علماء الأندلس: ١/١١٢، تاريخ الإسلام للذهبي)

④ إبراهيم بن نصر السرقسطي أبو إسحاق، قال ابن الفرضي: كان عالما بالحديث بصيراً بعلله حدث عنه عثمان بن عبد الرحمن بن أبي زيد...... و كان ثقة " (تاريخ علماء الأندلس: ١/٥، جذوة المقتبس: ٥٨

⑤ "أحمد بن مندوس" اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

⑥ أحمد بن عبد الله بن أبي الحواري أبوالحسن الدمشقي "ثقة"۔(الجرح والتعديل: ٢/٤٧، الثقات لابن حبان: ٨/٢٤، تقريب التهذيب: ٨١ (٦١)

''ہم تمہاری طرح علم نہیں طلب کرتے تھے، لیکن ہم مشائخ کے پاس آتے اور اپنے تئیں ان کے پاس بیٹھنے کا اہل خیال نہ کرتے، انّ سے ورے بیٹھ جاتے اور چھپ کر سنتے۔ جب حدیث کا ذکر آتا، تو اس کے اعادہ کی درخواست کرتے اور اس کو لکھ لیتے ...... اور تم علم کو جہالت کے ساتھ طلب کر رہے ہو۔''

یہ اثر حدیث کے لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے کا موید ہے اور ''دو اسلام'' میں قطع و برید سے کام لیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

نیز یہ اثر بلحاظ سند ''صحیح'' نہیں:

① اس کی سند میں ''عثمان بن عبدالرحمن ابو عمرو'' ہے، جس کو کتب رجال میں ''متروك الرواية'' جھوٹا لکھا گیا ہے۔

② اس کا دوسرا راوی ابراھیم اور تیسرا راوی أحمد دونوں مجہول ہیں۔ [1]

---

[1] عثمان بن عبد الرحمن أبو عمرو کی توثیق گزر چکی ہے۔ جس کو ''متروک اور جھوٹا'' کہا گیا ہے وہ ''عثمان بن عبد الرحمن بن عمر بن سعد بن أبي وقاص الوقاصي المدني'' ہے، اس اثر کی سند میں یہ راوی نہیں ہے۔

اسی طرح إبراهيم بن نصر أبو إسحاق السرقسطي ''ثقه'' ہے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

أحمد بن منذوس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ اسی طرح مؤلف رحمہ اللہ نے جو پہلے تین رواۃ ذکر کیے ہیں:

(۱) اسحاق بن إبراهيم (۲) محمد بن علي (۳) ابو عبد الرحمن یہ رواۃ اس اثر کی سند کے بجائے اس سے ماقبل فضیلؔ بن عیاض سے ہی مروی ایک دوسرے اثر کی سند کے رواۃ ہیں۔ (جامع بيان العلم: ۲/۱۰۴۲ (۱۹۵۲)

① إسحاق بن ابراهيم بن نعمان کے متعلق جرح وتعدیل نہیں مل سکی، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

② محمد بن علي، اس کا صحیح نام ''محمد بن علي بن مروان القاضي'' ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

''كان محمود السيرة شديد الهيبة سريع الفصل موصوفا بالعدل ذا تؤدة و سؤدد'' (تاريخ الاسلام)

③ ''أبو عبد الرحمن الضرير أحمد بن جعفر الوكيعي'' اسے امام دارقطني وغیرہ نے ''ثقه'' اور ''حافظ'' قرار دیا ہے۔ (تاريخ بغداد: ۴/۵۸ (۱٦٧٥)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کا اثر:

(۲۱) ”قال أبوهريرة لقد حدثتكم بأحاديث لو حدثت بها في زمن عمر بن الخطاب لضربني بالدرة“ (تذکرہ:۸)

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تم کو ایسی حدیثیں سنائی ہیں کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سناتا، تو وہ مجھے درّہ سے پیٹتے۔“

جواب:

تذکرہ (۷:) میں اس اثر کے یہ لفظ ہیں:

”وقلت له أكنت تحدث في زمان عمر هكذا فقال لو كنت أحدث في زمان عمر مثل ما أحدثكم لضربني بمخفقته“

”ابوسلمہ کہتے ہیں: میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی اس کثرت سے حدیث بیان کیا کرتے تھے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مَیں اسی طرح حدیث سناتا، تو وہ مجھے درّے سے پیٹتے۔“ [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے حدیثیں بیان نہیں کیا کرتا تھا، بلکہ کم بیان کرتا تھا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیادہ احادیث بیان کرنے سے منع فرمایا تھا کہ مبادا کہیں غلطی واقع ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس احتیاط پر عمل کرنے سے احادیث محفوظ ہو گئیں، تو بعد میں بیان کرنے سے وہ مانع مرتفع ہو گیا۔ اس واسطے اب میں زیادہ حدیثیں بیان کرتا ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ احادیث بیان کرنے کے خلاف نہ تھے، صرف احتیاط کی تاکید

---

[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ اثر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا، تفصیل گزر چکی ہے۔

کرتے تھے، چنانچہ پہلے گذر چکا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أقلوا الرواية عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم" ❶

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں کم بیان کیا کرو۔"

پھر خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ کا اثر:

۲۲ " لو كان في هذا الحديث خير لنقص كما ينقص الخير ولكنه شر فأراه يزيد كما يزيد الشر" (جامع: ۱۷۸)

"اگر حدیث کوئی اچھی چیز ہوتی، تو باقی نیکیوں کی طرح گھٹتی جاتی، لیکن یہ بڑھ رہی ہے، اس لئے شر ہے۔" ❷

❶ سنن ابن ماجه: باب التوقي في الحديث عن النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث(۲۸)، المستدرك: ۱/۱۸۳ (۳٤۷) اسے امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے "صحیح" قرار دیا ہے۔

❷ جامع بيان العلم: ۲/۱۰۱۵ (۱۹۳٦)، نیز دیکھیں: شرف أصحاب الحديث(۱۲۳)، حلية الأولياء: ٦/۳٦۹۔ حافظ ابن عبد البر کی سند میں "إسحاق بن إبراهيم بن نعمان" ہے، جس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ خطیب بغدادی نے یہ اثر دو اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پہلی سند میں الخضر بن أبان الهاشمي " ضعیف ہے۔ (لسان الميزان: ۲/۳۹۹ (۱٦۳٤)، اور دوسری سند میں "خلف بن خليفه" ہے، جو کہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔ امام أحمد بن حنبل فرماتے ہیں: جس نے اس سے اول وقت میں لکھا ہے، اس کا سماع صحیح ہے۔ (الكواكب النيرات: ۲۹ (۲۰) اس سند میں " علي بن حجر" اس سے روایت کرتے ہیں، ان کے متعلق معلوم نہیں کہ "خلف بن خليفة" سے ان کا سماع اختلاط سے پہلے تھا یا بعد میں۔ والله أعلم

حافظ ابو نعیم اصبهاني نے اس کی تیسری سند بھی ذکر کی ہے، لیکن اس میں "إبراهيم بن عبد الله بن إسحاق أبو إسحاق الأصبهاني " مستور ہے۔ (تاريخ بغداد: ٦/۱۲۷ (۳۱۵۹)، أخبار أصبهان: ۱/۲۰۱)

جواب:

یہ اثر صحیح نہیں:

1. اس کا راوی علی بن حسین "کذاب" ہے۔[1]
2. عام امت کا عمل اس کے خلاف ہے۔
3. سفیان ثوری سے صحاح ستہ میں صدہا احادیث تواتر سے ثابت ہیں۔

سفیان بن عیینہ کا اثر:

3. حدیث کی فرمائش کی گئی، تو آپ نے فرمایا:

"ما أدري الذی تطلبونه من الخير ولو كان من الخير لنقص كما ينقص الخير" [2]

---

[1] حافظ ابن عبدالبر ؒ نے اس اثر کی یہ سند ذکر کی ہے: قال ابن عبد البر أخبرنا عبد الرحمن بن يحيىٰ ثنا أحمد بن سعيد ثنا إسحاق بن إبراهيم بن نعمان ثنا أبو بكر محمد بن علي بن مروان قال حدثنا علي بن جميل قال ثنا علي بن سعيد قال ثنا شعيب بن حرب قال كنا عند سفيان......" اس کی سند میں "علي بن حسين" کی بجائے "علي بن جميل" ہے اور وہ کذاب اور وضاع ہے۔ (الكامل: ٥/٢١٥، المجروحين: ٢/١١٦، لسان الميزان: ١/١٨٥، الكشف الحثيث (١٨٥) (٥٠٠)، الضعفاء للأصبهاني: ١١٧)

[2] جامع بيان العلم: ٢/١٠١٦ (١٩٣٨) قال ابن عبد البر: أخبرنا عبد الله بن محمد بن يوسف ثنا يحي بن مالك ثنا محمد بن سليمان بن أبي شريف قال حدثني محمد بن موسىٰ قال سمعت زكريا القطان يقول رأيت سفيان بن عيينة ......"

1. عبد الله بن محمد بن يوسف أبو الوليد القاضي المعروف بابن الفرضي "، "كان حافظا متقنا عالما ذا حظ من الأدب وافر" (جذوة المقتبس :٩٠، نفح الطيب للتلمساني:٣/١٧٠) حافظ ذہبی ؒ فرماتے ہیں:"الحافظ الإمام الحجة" و قال ابن حيان : لم نر مثل ابن الفرضي بقرطبة في سعة الرواية و حفظ الحديث و معرفة الرجال" (تذكرة الحفاظ:٣/١٠٧٦) حافظ ذہبی ؒ مزید فرماتے ہیں:عبد الله بن محمد بن يوسف ←

"تم جس چیز کی تلاش میں ہو، وہ کوئی نیکی نہیں، اگر نیکی ہوتی تو باقی نیکیوں کی طرح کم ہو جاتی۔"

جواب:

اس کے متعلق حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

"یہ بات سفیان نے طلبہ سے تنگ آ کر کہی (کیونکہ طلباء نے صفا و مروہ کے درمیان چلتے چلتے ان کو حدیث سنانے پر مجبور کیا) اور اہل علم اس اثر میں کلام کرتے ہیں (یعنی یہ اثر بلحاظ سند "صحیح" نہیں) ❶

← شيخ لأبي عمر بن عبد البر، جهله ابن القطان، قلت: و هو عجيب فهو أبو الوليد بن الفرضي الحافظ الكبير و ليس هو ممن يجهل مثله۔(ميزان الاعتدال:١٣٩/٨، لسان الميزان:٣٥٥/٣)

④ يحيي بن مالك بن عائذ أبو زكريا الأندلسي: حافظ ذہبی فرماتے ہیں:" الحافظ الكبير أبو زكريا الأندلسي" له رحلة و حفظ و اشتهار" و قال ابن الفرضي: كان صحيح الكتاب صحيح القلم و كان حليمًا كريماً جوادا صواما دينا مع سلامة دينه و حسن يقينه" (تذكرة الحفاظ:١٠٠٣/٣، تاريخ الإسلام للذهبي ، تاريخ علماء الأندلس: ٢١٠، نفح الطيب ١٥١/٢)

③ محمد بن سليمان بن أبي الشريف أبو بكر المالكي، قاضي عياض رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ ذکر کیا ہے۔ لیکن جرح و تعدیل نقل نہیں کی۔ (ترتيب المدارك: ٣٥٥/١)

④ محمد بن موسیٰ۔ والله أعلم

⑤ زكريا القطان: سفيان بن عيينة سے زكريا بن يحيىٰ بن أسد المروزي روایت کرتے ہیں۔ جو کہ "صدوق" ہے۔(تاريخ بغداد:٤٦٠/٨، الثقات لابن حبان:٢٥٥/٨، لسان الميزان:٤٨٥/٢)

❶ جامع بيان العلم: ١٠١٦/٢، حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:"هذا كلام خرج على ضجر، وفيه لأولي العلم نظر"!

نیز یہ اثر باطل ہے:

① اس کی سند میں ''عبداللہ بن محمد بن یوسف'' مجروح ہے۔

② اس میں یحییٰ بن مالک ہے، یہ بھی مجروح ہے۔

③ محمد بن سلیمان بن محمد مجہول ہے۔

④ زکریا قطان، یہ بھی مجہول ہے۔

⑤ محمد بن موسیٰ بہت ہیں، بعض مجروح اور بعض غیر مجروح۔[1]

گویا عام سلسلہ ہی واہی تباہی ہے۔

بکر بن حماد کے شعر:

(۳) أری الخیر فی الدنیا یقل کثیره
وینقص نقصا والحدیث یزید
فلو کان خیرا قل کالخیر کله
و أحسب أن الخیر منه بعید

''میں دیکھ رہا ہوں، نیکی کم ہو رہی ہے، لیکن حدیث بڑھ رہی ہے۔ اگر حدیث اچھی چیز ہوتی، تو باقی نیکیوں کی طرح گھٹتی جاتی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر اس سے بعید ہے۔''[2] (توجیہ ص ۲۱)

جواب:

اس کا جواب شعروں ہی میں لیجیے، جس پر ایک جماعت کا اتفاق ہے:

---

[1] اس کی سند میں مذکور عبد اللّٰہ بن محمد بن یوسف ابن الفرضي صاحب تاریخ علماء الأندلس پر کسی نے جرح نہیں کی، عبداللہ بن محمد بن یوسف مجروح دوسرا راوی ہے۔ اس طرح یحییٰ بن مالک بن عائذ پر کوئی جرح نہیں، یحییٰ بن مالک بن أنس مجروح ہے۔ (لسان المیزان: ۲۷٤/٦)

[2] جامع بیان العلم: ۱۰۱٦/۲ (۱۹۳۹) شرف أصحاب الحدیث (۱۲۳)،

وقول رسول الله يعرف حده
فليس له عند الرواة مزيد
ولولم يقم أهل الحديث بدیننا
فمن كان يروي علمه ويفيد

''آنحضرت ﷺ کے قول کی حد معروف ہے، راویوں نے اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا۔ اگر اہل حدیث ہمارے دین کے لیے کوشش نہ کرتے تو آنحضرت ﷺ کا علم کون بیان کرتا اور کیونکر ہمارے لئے مفید ہوتا؟'' ❶

(مختصر جامع ابن عبدالبر: ۱۷۰)

سفیان ثوری کا ایک اثر:

⓴ ''میں گذشتہ ساٹھ برس سے حدیث میں ہوں، چاہتا ہوں کہ اس سے نکل جاؤں، نہ مجھے نفع ہو، نہ نقصان!'' ❷

جواب:

یہ اثر بھی بلحاظ سند باطل ہے:

① ایک راوی قطبہ بن علاء بن منہال غنوی ''كثير الخطا'' غیر معتبر ہے۔

---

❶ جامع بیان العلم: ۲/ ۱۰۱۸

❷ جامع بیان العلم: ۲/ ۱۰۲۵ (۱۹۵۷) نیز دیکھیں: تقدمة الجرح و التعديل: ٦١، حلية الأولیا: ٦/ ٣٦٣، ٧/ ٥٧، ٦٣، شرف أصحاب الحديث (١١٦) یہ اثر امام سفیان ثوری سے کئی اسانید سے مروی ہے، امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

''حدثنا عبد الله بن محمد بن عمرو الغزي قال سمعت الفريابي و قال ابن أبي حاتم حدثني أبي نا أبو عمر عيسى بن محمد النحاس الرحلي قال قال ضمرة سمعت سفيان الثوري......'' یہ سند ''صحیح'' ہے۔

② احمد بن زہیر مجہول ہے۔

③ احمد بن صالح بھی مجہول ہے۔

④ ابن منادی، یہ بھی مجہول ہے۔

⑤ احمد بن محمد بن عبدالخالق مجہول نامقبول ہے۔ ❶

اس کے علاوہ اس کی باقی سندیں بھی صحیح نہیں۔ ایک سند میں ''علی بن قادم'' "منکر الحدیث" ہے۔ دوسری میں "خضر بن أبان هاشمي" مجروح ثقہ نہیں۔

---

❶ ① قطبة بن علاء بن منهال أبو سفيان الغنوي الكوفي " یہ ''ضعیف'' ہے۔(التاريخ الكبير:٧/١٩١، الضعفاء للبخاري:٩٦، الجرح والتعديل:٧/١٤١، الكامل في الضعفاء: ٦/٥٣، لسان الميزان:٤/٤٧٣)

لیکن اس کی فریابی، قبيصة ،ضمرة بن ربيعه" اور دیگر کئی رواۃ نے متابعت کی ہے۔ لہٰذا اس پر جرح سے مذکور اثر کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

② أحمد بن زهير بن حرب بن شداد أبو بكر النسائي البغدادي المعروف بابن أبي خيثمة، صاحب التاريخ یہ ''ثقہ حافظ'' ہیں، ان پر کوئی جرح نہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ گزر چکا ہے۔

③ أحمد بن صالح بن عمر أبو بكر المقري البغدادي :"كان ثقة ضابطا مشهورا" (تاريخ الإسلام للذهبي)

④ أحمد بن جعفر بن محمد بن عبيد الله بن المنادي أبو الحسين ۔خطیب بغدادی فرماتے ہیں:"كان ثقة أمينا ثبتا صدوقاً و رِعا حجة و رِعا فيما يرويه محصلا لما غليه صنف كتبا كثيرة و جمع علوما جمة۔ قال الداني: غاية في الإتقان ثقة مأمون صاحب سنة" (تاريخ بغداد: ٤/٦٩(١٦٩٠)، معرفة القراء الكبار للذهبي: ١/٢٨٥ (١٩٨)

⑤ "أحمد بن محمد بن عبد الخالق أبو بكر الوراق" قال الخطيب: كان ثقة معروفا بالخير والصلاح و قال الأنلوني: لا بأس به ، و قال الأزدي : صدوق (تاريخ بغداد: ٥/٥٦(٢٤٢٢) مذکورہ بالا پانچ راوی ایک سند کے نہیں بلکہ دو اسانید کے ہیں۔

محمد بن حسین بن فضل قطان، یہ بھی نامقبول ہیں۔ ❶

سفیان کی طرف منسوب ایک اثر:

Ⓐ سفیان نے ایک دفعہ کہا: خدا کرے، دشمن کو محدث بنا دے۔" ❷

---

❶ ① علي بن قادم اسے اُبو حاتم نے " محله الصدق" ابن حبان، عجلي، یعقوب بن سفیان اور ابن خلفون نے "ثقه" قرار دیا ہے۔ ابن قانع نے کہا ہے: "کوفي صالح" زکریا ساجی نے "صدوق و فیه ضعف" کہا ہے۔ قال ابن سعد: كان ممتنعاء منكر الحديث شديد التشيع و قال ابن معين "ضعيف" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صدوق يتشيع" امام ابن عدی فرماتے ہیں: و نقم علي علي بن قادم أحاديث رواها عن الثوري غير محفوظة و هو ممن يكتب حديثه" اور مذکورہ بالا اثر سفیان ثوري سے ہی مروی ہے، (الثقات لابن حبان:۴۵۹/۸، الثقات للعجلي:۱۵۲/۲، المعرفة والتاريخ:۴۳۶/۲، الكامل لابن عدي:۲۰۱/۵، تهذيب التهذيب:۳۲۷/۷، تقريب التهذيب: ۴۰۴ (۴۷۸۵)

② خضر بن أبان الهاشمي "ضعيف" ہے۔ (لسان الميزان:۳۹۹/۲)

③ محمد بن حسين بن محمد بن الفضل أبو الحسين الأزرق القطان" خطیب بغدادي فرماتے ہیں: "كتبنا عنه و كان ثقة" ان کی أبو سعيد الصيرفي نے متابعت کی ہے۔ (شرف أصحاب الحديث (۱۱۶)

❷ جامع بيان العلم:۱۰۲۷/۲ (۱۹۶۵)، حلية الأولياء: ۲۱۶/۷) سفیان بن عیینہ نے یہ اثر مسعر بن کدام سے نقل کیا ہے۔ قال ابن عبد البر: حدثنا خلف بن القاسم نا الحسن بن رشيق نا علي بن سعيد نا محمد بن خلاد الباهلي نا سفيان بن عيينة قال سمعت مسعرًا ...... رواۃ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

① خلف بن القاسم بن سهل ۔ قال الذهبي: الحافظ الإمام المتقن، كان من بحور الرواية" (سير أعلام النبلاء:۱۱۳/۱۷، تذكرة الحفاظ:۱۰۲۵/۳) نیز دیکھیں: تاريخ علماء الأندلس: ۱۳۶/۱، جذوة المقتبس: ۲۰۹، تاريخ دمشق:۱۳/۱۷)

② "الحسن بن رشيق العسكري" یہ ثقہ ہے۔ (لسان الميزان:۲۰۷/۲، تذكرة الحفاظ: ۹۵۹/۳)

←

جواب:

① یہ سفیان کا کلام نہیں اور سند کے اعتبار سے یہ بھی اثر باطل ہے۔ (یہ کلام مسعر کا ہے)

② اس میں ایک راوی خلف بن قاسم مجہول ہے۔

③ علی بن سعید بن بشیر رازی مجروح ہے۔ ❶

سفیان کا ایک اور اثر:

٤٧ ''اگر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) ہوتے، تو تم کو درے لگاتے۔'' ❷

جواب:

یہ بھی باعتبار سند باطل ہے۔ اس میں مسلمہ بن قاسم، احمد بن عیسیٰ اور ابراہیم بن سعید تینوں مجروح ہیں۔

← ③ ''علي بن سعيد'' اس کی ''أبو القاسم البغوي'' نے متابعت کی ہے۔(حلية الأولياء: ٢١٦/٧)

④ محمد بن خلاد بن كثير الباهلي البصري '' اسے مسدد، ابن حبان اور مسلمة بن قاسم نے ''ثقہ'' قرار دیا ہے۔(الثقات لابن حبان: ٨٧/٩، تهذيب التهذيب: ١٣٣/٩)

❶ خلف بن قاسم ''ثقہ'' ہے، جیسا کہ گزرا ہے۔علي بن سعيد بن بشير الرازي ''مختلف فيه'' ہے، لیکن أبو القاسم البغوي نے اس کی متابعت کی ہے۔

❷ جامع بيان العلم: ١٠٢٨/٢، (١٩٦٦) قال ابن عبد البر: أخبرنا أحمد بن عبد الله نا مسلمة بن قاسم نا أحمد بن عيسي نا إبراهيم بن أحمد نا إبراهيم بن سعيد قال سمعت سفيان بن عيينة...... '' اس کی سند میں '' مسلمة بن قاسم ''ضعیف ہے۔(لسان الميزان : ٣٥/٦) إبراهيم بن سعيد أبو إسحاق الجوهري ''ثقة'' ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' ثقة حافظ تكلم فيه بلا حجة'' دیکھیں: تهذيب الكمال: ٩٥/٢، تقريب التهذيب: ٨٩(١٧٩)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر:

۴۸ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں، لیکن علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ رحلت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔

جواب:

اس سے لازم نہیں آتا کہ سب کی سب ان کی مسموع ہیں، بلکہ دوسرے صحابہ سے سب سن کر بیان کرتے ہیں۔[1] اور تیرہ برس کا لڑکا ہوشیار ہوتا ہے۔ بعض افراد

---

[1] اس بات کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس اثر سے بھی ہوتی ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، تو میں نے قبیلہ انصار کے ایک آدمی سے کہا: آج صحابہ کرام کی کثیر تعداد ہم میں موجود ہے، چلو آؤ ان سے علم حاصل کرتے ہیں! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: وہ آدمی میری بات سن کر تعجب سے کہنے لگا: تم سمجھتے ہو کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں لوگ تمہارے علم کے محتاج ہوں گے!! لہٰذا وہ انصاری دوست تو یہ کہہ کر چلا گیا اور میں طلب علم میں مگن ہو گیا، کسی آدمی کی طرف سے مجھے کوئی حدیث پہنچتی، تو بسا اوقات میں اس وقت آتا، جب وہ آدمی سو رہا ہوتا، میں بھی اس آدمی کے دروازے پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا جبکہ تیز ہوا میرے چہرے پر دھول اور گرد و غبار ڈالتی رہتی۔

جب وہ آدمی باہر نکل کر مجھے دیکھتا، تو کہتا: اے رسول خدا کے چچا زاد! آپ نے کیوں آنے کی تکلیف کی، مجھے پیغام بھیج دیا ہوتا، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا؟ میں جواب دیتا: نہیں! آپ کے پاس میرا آنا ہی ضروری تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

تو ایک وقت آیا، جب وہ انصاری آدمی میرے پاس سے گزرا اور لوگ میرے اردگرد بیٹھ کر مجھ سے سوالات کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ انصاری دوست کہنے لگا: یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقل مند تھا۔

امام حاکم اس اثر کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: یہ حدیث بخاری کی شرط پر ''صحیح'' اور طلب حدیث اور محدث کی توقیر و تعظیم میں اصل بنیاد ہے، نیز اس اثر کو امام ذہبی نے بھی "صحیح" قرار دیا ہے۔(سنن الدارمي: ١/١٥٠، (٥٧٠) المستدرك: ١/١٨٨ (٣٦٣)، المعجم الكبير: ١٠/٢٤٤(١٠٥٩٢)، فضائل الصحابة للإمام أحمد: ٢/٩٧٦ (١٩٢٥)، الإصابة: ٤/١٤٥

عقل وتمیز میں بالغوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ❶

محدثین پر الزام تراشی:

﴿۹﴾ ”ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص تھا کہ وہ کسی کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے، ہمیشہ حسن ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔ اس وقت ”تذكرة الحفاظ“ میرے سامنے پڑا ہے، جس میں ہزار ہا راویان اور حفاظ حدیث کے حالات مرقوم ہیں۔ میں ایک ہی دور کے چند راوی لے کر ان کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں، جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہمارے بزرگوں کا اندازِ کردار نویسی کیا تھا؟

مثلاً ”علي بن الحسين بن علي بن أبي طالب“ کے متعلق لکھتے ہیں: آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگر سونے، کھانے، ضروری حاجات اور وضو کیلئے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لئے جائیں، تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں۔ اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں، تو یہ تینتیس گھنٹے اور ۲۰ منٹ بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں میں

---

❶ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ سوال کرنے والی زبان اور عقل وتمیز کرنے والے دل کا مالک ہے۔ (تاريخ جرجان: ٤٨٣، الاستيعاب: ٢٨٤/١، البداية والنهاية: ٢٩٩/٨) اسی طرح جب حضرت عبد اللہ بن عباس سے یہ پوچھا جاتا کہ آپ نے کیسے یہ علم حاصل کیا تو فرمایا کرتے تھے: سوال کرنے والی زبان اور سمجھنے والے دل کے ساتھ (فضائل الصحابة: ٩٧٠/٢ (١٩٠٣)، البداية والنهاية: (٢٩٩/٨) حضرت ابن عباس کے طلب علم میں شوق و جذبہ اور شدت حرص کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ہیں: بسا اوقات ایک ہی بات کے متعلق میں تیس صحابہ کرام سے سوال کیا کرتا تھا۔ (البداية والنهاية: ٢٩٩/٨)

تینتیس گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔"

جواب:

اس کا جواب لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ ایک رکعت ایک منٹ میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور کھانے سونے اور دیگر ضروریات کیلئے بجائے آٹھ گھنٹوں کے چھ گھنٹے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ نیند کی طبعی مقدار ہر شخص کیلئے الگ الگ ہے۔ بعض آدمی صرف دو گھنٹہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم نے ایک آدمی دیکھا، جس کی نیند طبعی اس سے بھی کم ہے۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہے اور اس کی صحت بھی بالکل ٹھیک ہے۔ پھر اس میں ذہبی رحمہ اللہ کا کیا قصور ہے۔ وہ تو ناقل ہے، امام مالک سے نقل کر رہا ہے۔ امام مالک نے بھی "بَلَغَنِي" سے بیان کیا ہے۔ [1] اور محدثین کے طریق پر یہ اثر "صحیح" نہیں۔ اگرچہ جو کچھ بیان کیا ہے، عقلاً ممکن ہے۔

الزام تراشی کی حقیقت:

۴۰ "اس سے آگے" دواسلام" میں آٹھ آدمیوں کا ذکر ہے، جن کے متعلق ذہبی نے نقل کیا ہے، وہ اعلیٰ درجے کے عالم تھے، ہم نے ان کو جدول میں بیان کر دیا ہے۔

نام	عربی عبارت	ترجمہ
مطرف بن عبداللہ۔ (وفات ۹۵ھ)	كان رأسا في العلم والعمل	علم وعمل میں سردار تھے [2]

---

[1] دیکھیں: تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۷۵

[2] تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۶۴

محمد بن سیرین وفات (۱۱۰ھ)	عزیز العلم ثقة راس في الورع	علم میں بے مثال، قابل اعتماد اور عمل یعنی تقویٰ میں سردار ❶

اعتراض یہ ہے کہ دونوں ہم عصر اور دونوں علم و عمل میں سردار ...... یہ کیسے ممکن ہے؟

جواب:

بالکل فضول اعتراض ہے کہ دو آدمی علم اور عمل میں سردار نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ یہ کوئی مستبعد نہیں۔ علم میں سردار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مرتبہ علم میں بلند تھا۔ ایک سے زیادہ آدمیوں کا مرتبہ علم میں بلند ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿و جعلنا هم أئمة﴾ ❷

''ہم نے ان کو امام بنایا۔''

دونوں کی وفات میں بھی فرق ہے، سرداری کی نوعیت میں بھی اختلاف ہے۔ مطرف کے متعلق علم و عمل میں سردار لکھا ہے۔ محمد بن سیرین کے متعلق پرہیزگاری میں سردار لکھا ہے وغیرہ وغیرہ

ج: طاؤس بن کیسان وفات ۱۰۸ھ	كان رأسا في العلم والورع	علم اور پرہیزگاری میں سردار تھے۔ ❸
د: ابو صالح ذکوان	من أجلّ الناس	سب سے زیادہ

❶ تذکرة الحفاظ: ۱/۷۸

❷ الأنبياء: ۷۳

❸ تذکرة الحفاظ (۱/۹۰)، حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:" فاتفق موته بمكة قبل التروية بيوم سنة ست و مائة"

	وفات ۱۱۰ھ	وأوثقهم	بزرگ اور بڑا قابل اعتماد ❶
ر:	شعبی	ما رأيت أعلم و أفقه من الشعبي	شعبی سے بڑا عالم اور فقیہ میں نے نہیں دیکھا۔ ❷
س:	عکرمہ وفات ۱۰۷ھ	مابقي أحد أعلم بكتاب اللّٰه من عكرمة (یہ شعبی کا قول ہے)	عکرمہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا عالم باقی نہیں رہا۔ ❸
ح:	قاسم بن محمد بن ابی بکر وفات ۱۰۶ھ	ما رأيت فقيها أعلم من القاسم	میں نے قاسم سے کوئی فقیہ بڑا عالم نہیں دیکھا۔ ❹
و:	عطاء بن ابی رباح وفات ۱۱۴ھ	ما رأيت أفضل من عطاء	میں نے عطاء سے افضل کوئی نہیں دیکھا۔ ❺

---

1. تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۸۹۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''توفي سنة إحدى و مائة رحمه اللّٰه'' ،مذکورہ بالا قول امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے۔
2. تذکرۃ الحفاظ(۱/ ۸۱) اس میں دو اقوال کو جمع کیا گیا ہے پہلا قول: "ما رأيت أعلم من الشعبي" امام مکحول شامی سے مروی ہے، جب کہ دوسرا قول: "ما رأيت أفقه من الشعبي" ابو حصین اور ابو مجلز بیان کرتے ہیں۔ امام عامر بن شراحیل شعبی نے ۱۰۴ھ کو وفات پائی۔(طبقات خليفة بن خياط: ۱۵۷ ، طبقات ابن سعد: ٦/ ۲۵۵)
3. تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۹٦
4. تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۹۷، یہ قول ابو الزناد سے مروی ہے۔
5. تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۹۸۔ یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

اعتراض:

''دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز، یہ سب محدثین ہم عصر تھے۔ ذہبی نے ہر ایک کو بے مثال سب سے بڑا عالم سردار قرار دے رکھا ہے۔''

جواب:

یہ ہے تنقید! آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑا عالم اور سردار کے معنی ہیں بے نظیر، اور غلط فہمی کی یہی وجہ ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ کہنے والا ایک شخص نہیں۔ ہر ایک شخص اپنے علم کے مطابق کہہ رہا ہے۔ نیز أفضل، أعلم میں فرق ہے۔ علاوہ ازیں ''بڑا عالم'' اور ''بڑا فقیہ عالم'' ان میں بھی فرق ہے۔ اسی طرح بڑا عالم، قرآن سے بڑا واقف، ان میں بھی فرق ہے، سردار اسم تفضیل نہیں، ''أعلم'' اسم تفضیل ہے، مگر اثبات اور نفی میں فرق ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی:

۲۱ رحلت حضور سے صرف تین برس پہلے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے،[1] لیکن روایتِ احادیث میں سب سے بازی لے گئے اور

---

[1] حضرت ابو ہریرہ ۷ھ میں غزوہ خیبر کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تھے۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل ہی اپنے قبیلہ میں اسلام قبول کر چکے تھے، حضرت طفیل بن عمرو دوسی نے جب مکہ میں اسلام قبول کر لیا، تو واپس جا کر اپنے قبیلہ دوس میں دعوت اسلام میں مگن ہوگئے، جس کی بناء پر ان کی قوم نے اسلام قبول کر لیا، جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ دیکھیں: المستدرك: ۲۹۰/۳، (۵۱۳۱)، الطبقات الکبری لابن سعد: ۳۵۳/۱، فتح الباري: ۱۰۲/۸

مزید برآں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چار سال سے زیادہ عرصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ صفر کے مہینہ میں غزوہ خیبر کے موقع پر تشریف لائے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاول ۱۱ھ کو وفات پائی اس لحاظ سے چار سال سے زیادہ بنتا ہے۔ (فتح الباري: ۶۰۸/۶، سیر أعلام النبلاء: ۵۹۰/۲) اسی طرح حضرت حمید بن عبد الرحمن الحمیري ←

احادیث بھی ایسی کہ سارا قرآن ایک طرف اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث دوسری طرف! یہ ایک مرتبہ پٹے بھی۔ لیکن روایت سے باز نہ آئے۔

واقعہ یوں ہے کہ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضور نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ! جا اور ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے دے، جس نے زبان سے "لا إله إلا الله" کہہ دیا ہو، اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ باہر نکلے، تو سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب سے ملاقات ہوئی اور یہ بشارت سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو زور کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ ابو ہریرہ روتے ہوئے دربار رسالت میں پہنچے، پیچھے پیچھے عمر رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اسے کیوں پیٹا ہے؟ کہا: کیا آپ نے صرف "لا إله إلا الله" کہنے پر جنت کی بشارت دی ہے؟ فرمایا: ہاں! عمر نے کہا: ازراہِ نوازش ایسا نہ کیجیے، ورنہ لوگ تمام اعمال ترک کر دیں گے۔ "فخلهم يعملون" (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

← فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چار سال کا عرصہ صحبت نبوی میں گزارا۔ (مسند أحمد: ٤/١١١ (١٧٠٥٣)، سنن أبي داود (٨١)، سنن للنسائي (٢٣٨) لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ خود بیان کرتے ہیں: میں نے تین سال کا عرصہ صحبت نبوی میں گزارا۔ صحيح البخاري (٣٣٩٦)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: گویا حضرت ابو ہریرہ نے صرف اس مدت کو شمار کیا ہے، جس میں انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید ملازمت اختیار کیے رکھی، یا انھوں نے اس مدت کو شمار نہیں کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج، عمرہ یا غزوات کے لیے سفر پر نکلتے تھے، کیونکہ سفر کے اندر ایسی شدید ملازمت باقی نہیں رہتی، جس طرح طلب حدیث میں شدت مدینہ میں قیام کے دوران ممکن ہوتی تھی۔ (فتح الباري: ٦/٦٠٨) یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس مدت کو شمار نہیں کیا، جب وہ بحرین روانہ ہوئے تھے۔ (دفاع عن أبي هريرة: ٢٦) نیز دیکھیں: الأنوار الكاشفة: ١٤٤

فرمایا: بہت اچھا لوگوں کو کہہ دو کہ کام کریں۔"[1]

(صحیح مسلم: ۲۰۵، کتاب الایمان مطبع مجتبائی)

ملاحظہ کیا کتنی دلچسپ حدیث ہے! صرف دو لفظ منہ سے نکالو اور جنت لے لو۔ نہ صوم وصلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں لہو بہانے کی حاجت، نہ صدقہ زکوٰۃ کے جھمیلے اور نہ جہاد اکبر و اصغر کے جھگڑے۔ دوسری دلچسپی یہ کہ حضرت فاروق بارگاہ رسالت کو حکم دیتے ہیں۔ "فلا تفعل فخلهم يعملون" آپ لوگوں کو ایسی احادیث نہ سنایا کیجئے۔ مطلب یہ کہ ایسی احادیث سنا کر انہیں خراب نہ کیجئے اور لوگوں کو کام کرنے دیجئے۔ یعنی مذہب کے معاملہ میں حضرت فاروق سرور کائنات کی راہنمائی فرما رہے ہیں اور لطف یہ کہ حضور اس حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتے اور فرماتے ہیں۔ "فخلهم" (بہت اچھا لوگوں کو کام کرنے دو۔)

بدیگر الفاظ رسول اکرم ﷺ نے اعتراف فرما لیا کہ ان کی حدیث "من قال لا اله الا اللّٰه" سے لوگ بے عمل ہو سکتے تھے۔ غور فرمائیے کہ اس حدیث نے حضور پرنور کی منزلت کو کتنا کم کر دیا کہ ان کا طفلِ مکتب ان کو سیدھا راستہ دکھا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس قسم کی احادیث تراشا کرتے تھے۔ بلکہ یہ ہے کہ یار لوگ گھڑ کر ان کا نام جڑ دیتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود بھی روایت میں قدرے غیر محتاط واقع ہوئے ہوں۔ (دو اسلام: ۵۶۔ ۵۸)

---

[1] صحیح مسلم: كتاب الإيمان ، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً، رقم الحديث (۳۱) معترض نے حدیث میں قطع و برید سے کام لیا ہے، جس کی تفصیل مولف رحمہ اللہ نے آگے ذکر کردی ہے۔

جواب:

ا: معترض نے حدیث میں کچھ قطع و برید سے کام لیا ہے۔

ب: آنحضرت ﷺ کے متعلق کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

ج: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب نہیں سمجھے۔

حدیث میں قطع و برید:

حدیث میں قطع و برید اس طرح کیا گیا ہے، کہتے ہیں: ''صرف دو لفظ منہ سے نکالو اور جنت لے لو، نہ صوم وصلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں جانے کی حاجت الخ''

حالانکہ حدیث میں صرف منہ سے کہنے کا ذکر نہیں، بلکہ یہ لفظ بھی ہیں: ''مستیقناً بها قلبه'' اس پر دل سے یقین کرے۔ جب دل سے یقین کرے گا، تو یقین کے لوازمات کا ہونا بھی اس میں ضروری ہے۔ یعنی جو اس امر کا دل سے یقین کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو لامحالہ غیر اللہ کی عبادت سے الگ رہے گا اور اللہ کی عبادت کرنے پر آمادہ ہوگا۔ اور جو اللہ کی عبادت پر آمادہ ہوگا، تو اس کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ ''وہ بالکل صوم وصلوٰۃ وغیرہ سے عاری ہوگا'' آپ جیسوں کا ہی کام ہے۔

دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اپنی طرف سے ''ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے'' لکھ دیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا مفہوم یہ ہے، ''جو شخص تجھے اس باغ کے آگے ملے اور صدقِ دل سے ''لا إله إلا الله'' کہتا ہو، اس کو جنت کی بشارت دو۔ غالباً یہ اشارہ انہی لوگوں کی طرف تھا، جو آنحضرت ﷺ کی ملاقات کیلئے آ رہے تھے، جن کے آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ یا آپ ﷺ کا اشارہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ہو اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بشارت دے دی، تو

آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کو سمجھ گئے کہ آنحضرت ﷺ کی مراد یہی تھی، مگر لفظ میں چونکہ کوئی قید نہ تھی، جس سے صرف وہی لوگ سمجھے جائیں، جو آرہے تھے یا صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی مراد لئے جائیں۔ اور دل سے "لا إله إلا الله" پڑھنا، اگرچہ بظاہر عملی کوتاہی سے بند کرتا ہے۔ مگر سب لوگ سمجھ میں اتنے نکتہ رس نہیں ہوتے کہ بات کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غالباً یہی سمجھا ہو گا کہ آنحضرت ﷺ کی یہ بشارت میری آزمائش کیلئے ہے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) بھی نکتہ رس ہیں یا نہیں۔ سو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی روش سے اپنی نکتہ رسی کا ثبوت دے دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ بھی کیا، نبی کریم ﷺ کے مقصد کو پا کر کیا۔

نبی کریم ﷺ کے متعلق غلط فہمی:

اگر آپ کا وہ مقصد نہ ہوتا، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، تو آپ ﷺ اس کی تردید کرتے، جیسے حدیبیہ میں کی۔ [1] نبی کریم ﷺ کی موافقت اس بناء پر نہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے سے پہلے آپ ﷺ اس مصلحت سے واقف نہ تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو موقع شناسی کی تربیت:

اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ چونکہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے

---

[1] یعنی جب صلح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صلح کو مسلمانوں کی ذلت وخواری سمجھا، تو نبی اکرم ﷺ نے انھیں فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ تعالیٰ مجھے کبھی بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا اور آپ ﷺ نے اس صلح کو "فتح" قرار دیا۔ (صحيح البخاري: أبواب الجزية والموادعة، باب إثم من عاهد ثم غدر، رقم الحديث (٣٠١١)

حدیث کے مبلغ تھے اور مبلغ کے لئے موقع شناسی بھی ضروری ہے۔ اس واقعہ سے ان کو موقع شناسی کا واقف بنایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”میں نے نبی کریم ﷺ کی دو قسم کی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک کتاب تو سنا چکا ہوں، اگر دوسری کتاب کی حدیثیں بھی سناؤں تو میری رگ کاٹ دی جائے۔“ (بخاری) ❶

یہ موقع شناسی کا ملکہ انہیں پیدا ہو گیا اور یہ سمجھ گئے کہ سامعین ان احادیث کے متحمل نہیں ہو سکتے، جو نبی کریم ﷺ نے ظالم بادشاہوں کے متعلق نام لے کر فرمائی تھیں ❷ کیونکہ خطرہ تھا کہ لوگ ان کا نام سن کر کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

حدیث کا صحیح مفہوم:

اگر بالفرض حدیث مذکور میں یہ الفاظ "مستيقنا بها قلبه" نہ ہوں، صرف یہی لفظ ہوں "من قال لا إله إلا الله" اس کا مطلب بھی یہی ہو گا کہ جو لا إله إلا الله کا قائل یعنی معتقد ہو، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ جیسے قرآن میں ہے کہ:

﴿إن الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون ○ أولئك أصحاب الجنة﴾ ❸

”جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جمے رہے، ان پر نہ ڈر ہے، نہ غم کھائیں گے، یہ لوگ جنتی ہیں۔“

اب ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا مقصد اس جگہ یہی ہے کہ جس نے یہ اعتقاد رکھا

❶ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب حفظ العلم، رقم الحديث(١٢٠)، و لفظه: "حفظت من رسول الله ﷺ و عائين فأما أحدهما فبثثته و أما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم"

❷ دیکھیں: فتح الباري: ١/٢١٦۔

❸ الأحقاف: ١٣

کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جما رہا (اور اپنے اس عقیدے کا ثبوت عملی طور پر بھی پیش کیا) وہ جنت میں داخل ہو گا۔ مذکورہ حدیث میں بھی ”لا إله إلا الله“ کہنے کا یہی مطلب ہے۔!

اگر کوئی منکر قرآن یہ کہے کہ ”عجیب آیت قرآنی ہے، صرف دو لفظ ”ربنا اللّٰہ“ منہ سے نکالو اور جنت لے لو، نہ صوم وصلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں لہو بہانے کی حاجت، نہ زکوٰۃ و صدقات کے جھمیلے، نہ جہاد اکبر و اصغر کے جھگڑے.........“ تو کیا یہ بات آپ کے نزدیک معقولیت پر مبنی ہو گی؟ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہو گا۔

اسی طرح جو منکر قرآن اس آیت کو سنے، جو قرآن مجید میں دو جگہ وارد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ [1]

”اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرتا، اس کے سوا جسے چاہے معاف کر دے!“

تو کہہ سکتا ہے کہ یہ عجیب قرآن ہے، جو ہر گناہ کی چھٹی دیتا ہے، زنا کرو، شراب پیو، سب برے کام، صرف شرک نہ کرو، تو کیا اس آیت قرآنی کی صحیح تفسیر ہو گی؟

غرض یہ ہے کہ ہر کلمہ کو عصبیت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ تحقیقی نظر سے دیکھنا چاہیے، پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ یہ اعتراض میری مسلمانی پر تو نہیں پڑتا۔ مگر جس شخص کی غرض محض تخریب ہو، اسے ان باتوں سے کیا مطلب؟!

نبی اکرم ﷺ کا اندازِ تربیت:

رسول اکرم ﷺ کبھی کبھی بطور امتحان بھی کوئی بات کہہ دیتے تھے، جس سے مقصد تعمیلِ حکم نہ ہوتا، بلکہ صحابہ کرام کی عقل و تربیت کا امتحان مقصود ہوتا۔ ایسی

[1] النساء: ١١٦

صورتوں میں صحابہ کومشورہ اوراس کی وجہ معلوم کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بسا اوقات آپ ﷺ کی رائے کے خلاف مشورہ دیتے تھے (اوراس کیلئے مشورہ دینے والے کومطعون نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مشورہ خلوص نیت سے دینا اور اپنی رائے کے مطابق دینا ضروری ہوتا ہے) اس قسم کے واقعات بہت ہیں، جہاں رسول اللہ ﷺ کی رائے کے خلاف لوگوں نے رائے دی۔ اور آنحضرت ﷺ نے ان کی رائے پر عمل بھی کیا، جیسے غزوہ احد میں آپ ﷺ کی رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر لڑنا بہتر ہے، مگر صحابہ کرام مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے حق میں تھے اور اسی پر عمل بھی ہوا تھا۔[1]

اسی طرح بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے جہاں پہلے قیام کیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے اس مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ قیام فرمایا۔[2] اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصی اجازت آپ ﷺ نے مرحمت فرمائی تھی کہ اگر میری نرمی سے کوئی فائدہ اٹھائے، تو تم اس پر سختی کرلیا کرو، جب تک میں منع نہ کروں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کی تربیت نہایت اعلیٰ اور مؤثر تھی۔

علماء پر الزام تراشی:

۳۳ اورفرماتے ہیں: ”ہمارے موجودہ علماء میں ایک دو بڑی خوبیاں موجود ہیں:

اوّل: ان کا دامن وضع احادیث کے داغ سے ملوث نہیں۔

دوم: انہیں سرورِ کائنات ﷺ سے گہری محبت ہے۔

---

1. سیرۃ ابن ھشام: ٤/٨، سیرۃ ابن کثیر: ٣/١٩، فتح الباري: ٧/٢٤٦، السیرۃ النبویة الصحیحة: ٢/٣٨٠، فقه السیرۃ: ٢٥٠
2. المستدرك: ٣/٤٨٢، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے ”منکر“ قرار دیا ہے۔ یہ حدیث عروہ بن زبیر سے مرسلاً بھی مروی ہے۔(الإصابة: ٢/١٠)

اور ایک دو خرابیاں بھی ہیں:

اوّل کہ ملکہ تنقید سے بے بہرہ ہیں، اس وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ اسلاف کی اندھی تقلید کے مرض میں مبتلا ہیں۔ چونکہ ہمارے اسلاف کہہ بیٹھے ہیں کہ صحیح بخاری کی ہر حدیث صحیح ہے، اس لئے ہمارے علماء بخاری کی کسی حدیث کو ناقدانہ نظر سے دیکھنا یا درایت کے معیار پر پرکھنا کفر سے کم نہیں سمجھتے۔ شیخ عبدالحق دہلوی لاکھ چلائیں کہ صحاح ستہ میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے، علامہ ابن حجر ہزار کہیں کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: مولانا عبیداللہ سندھی کا مضمون، رسالہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۶۸، ۲۷۶) اور شیخ حمیدالدین فراہی بیشک کہتے پھریں کہ صحاح میں بعض احادیث ایسی ہیں، جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ کلام رسول، کلام خدا کو منسوخ کر سکتا ہے (نظام القرآن) لیکن ہمارے علماء یہی کہے جائیں کہ حدیث وحی خفی ہے۔ جو شخص صحاح ستہ کے ہر شوشے پر ایمان نہیں لائے گا، وہ کافر ہے۔'' (دو اسلام :۵۹،۶۰)

جواب:

مگر اہل قرآن نے اب موضوع احادیث کے بیان کرنے کا کام شروع کر دیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ اتنا لگاؤ نہیں رہا، جس کی بناء پر وہ آنحضرت ﷺ کے کلام کی قدر کرتے۔ اور اسلاف کے اتنے مخالف ہوئے کہ ان کی خدمت کے صلہ میں ان کو کوسنا شروع کر دیا اور درایت پر حدیثوں کو پرکھنے کیلئے میدان میں آ گئے۔

پھر تحقیق کے دعویٰ کے باوجود نہ اصل کتابیں پڑھیں، نہ قرآن کو دیکھا، جو کسی رسالہ میں گپ شپ دیکھی، اسی کو دستاویزات بنا کر اعتراضات شروع کر دیئے۔ نہ شیخ عبدالحق کی عبارت کو سمجھے، نہ اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے کلام کو حجت قرار دیا اور شیخ حمیدالدین فراہی کے کلام سے بے سوچے سمجھے استدلال کرنا شروع کر دیا۔

احادیث کی شرعی حیثیت:

امت میں سے کسی محدث یا مجتہد یا فقیہ کا یہ مسلک نہیں کہ صحاح کے ہر شوشہ پر ایمان لانا فرض ہے، بلکہ وہی احادیث ان کے نزدیک قابل عمل ہیں، جو صحیح غیر منسوخ ہوں اور صحاح کی بعض احادیث غیر صحیح اور بعض منسوخ ہیں۔ اور ایمان کا تعلق تو یقینیات سے ہوتا ہے۔ ہاں دلیل کا علم کے لحاظ سے جو مرتبہ ہوگا، اس کے مطابق اس کا اعتقاد ضروری ہے۔ جو احادیث متواتر ہیں یا ان کی صحت پر اجماع ہے، ان پر ایمان لانا فرض ہے اور ان پر اعتراض کرنا کفر ہے۔ اور صحیح حدیث کو بہ نظر حقارت دیکھنا گمراہی اور بے ایمانی ہے۔

وحی خفی کا یہ مطلب ہے کہ دین کے بارہ میں جو حدیث پایہ ثبوت کو پہنچ جائے، وہ ہمارے لئے حجت ہے، اگرچہ وہ حدیث استنباطی ہو یا وحی کی شکل میں آئی ہو۔ کیونکہ اللہ کی رضا اس کے متعلق ثابت ہو چکی ہے۔ یہی معنی وحی خفی کا ہے۔ ہاں جو مشورے اپنی اپنی رائے سے دیئے ہوں اور ان کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو، اس صورت میں ہم اپنی رائے پر عمل کرنے کے مجاز ہیں۔

دوسرا باب:

تدوین حدیث

تدوین حدیث کے مراحل:

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شریعت کے مسائل گاہے بگاہے مکاتیب کی صورت میں لکھائے تھے اور وہ لوگوں کے پاس محفوظ تھے۔ اور بعض صحابہ نے احادیث کو قلمبند کیا اور جو صحابہ قلمبند نہیں کرتے تھے، ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ یہی حال جمہور کا ہے، بعض احادیث لکھتے تھے، جو نہیں لکھتے تھے، ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ مگر پھر بھی وہ اخیر عمر میں کتابت کو ترجیح دینے لگے تھے۔ صغار تابعین کے زمانہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم سے دفتروں کے دفتر قلمبند کئے گئے ● اور دوسری صدی میں تدوین کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا، یعنی پہلے مجموعوں کو ایک ترتیب دیدی، اور بعض احادیث جو دماغوں میں محفوظ تھیں، ان کو بھی قلمبند کیا۔ اس میں اتنی توسیع ہوئی کہ عام دارالاسلام کے مجموعوں کو قلمبند کر لیا گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صرف ان مجموعوں سے ایک ایسی کتاب لکھی، جو بالاتفاق تسلیم کر لی گئی۔ صرف ۱۰ احدیثوں پر بعض علماء نے تنقید کی، ان کے جوابات دیئے گئے، اب جو احادیث بخاری میں ہیں، چند شاذ الفاظ کے سوائے ان کی صحت قطعی تسلیم کی جاتی ہے۔

● جامع بیان العلم: ۱/۳۳۱ (۴۳۸) نیز دیکھیں: صحیح البخاري: کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم: ۱/۴۹

منکرین کتابتِ حدیث کے دلائل اور ان کی حقیقت:

اور جس حدیث میں کتابت کی مخالفت وارد ہوئی ہے، وہ اتنی صحیح نہیں، جتنی اجازت کی حدیثیں صحیح ہیں، پھر ممانعت والی حدیث کا یہ مطلب ہے کہ قرآن میں ملا کر نہ لکھو، جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو بعض لکھی احادیث کے مٹانے یا جلانے کی روایات وارد ہوئی ہیں، بلحاظ سند قابل اعتبار نہیں، بلکہ انھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے جوازِ کتابت کی روایات صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔ بعض صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حدیثیں لکھا کرتے تھے، اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حدیثیں لکھوائی تھیں یا خود لکھی تھیں۔[1] اس کے پہلے دو مجموعے تھے، پھر تین، پھر پانچ۔

برق صاحب کی غلطی:

برق صاحب جابجا "عبداللّٰہ بن عمر" لکھتے ہیں اور یہ ان کی غلطی ہے بلکہ "عبداللّٰہ بن عمرو" ہے

> اور پھر کہتے ہیں: "ابو داود میں یہ حدیث ملتی ہے، "عبداللہ بن عمر" لکھا کرتے تھے[2] اور مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت سے منع فرمایا۔"[3]

حالانکہ مطلق کتابت سے منع نہیں فرمایا۔ بلکہ قرآن میں لکھنے سے منع فرمایا اور

---

[1] جامع بيان العلم: ١/٣٢٤ (٤٢٢) نیز دیکھیں: فتح الباري: ١/٢٠٧

[2] سنن أبي داود: كتاب العلم، باب في كتاب العلم، رقم الحديث(٣٦٤٦) نیز دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب العلم، باب كتابة العلم، رقم الحديث(١١٣)

[3] صحيح مسلم: كتاب الزهد والرقائق، باب التثبت في الحديث و حكم كتابة العلم، رقم الحديث(٣٠٠٤)

عبداللہ بن عمرو کے لکھنے کا ذکر بخاری میں بھی ہے۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی:

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق کہتے ہیں:

''اندازہ لگائیے کہ کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس تک کی عمر میں کسی قسم کی کوئی ذمہ داری محسوس کرتا ہے! ممکن ہے ارشاد بالفاظہ نہ یاد رہا ہو، اور بعض دیگر کا خاکہ مکمل کر لیا ہو۔ بہرحال جو احادیث آپ سے مروی ہیں، ان کی تعداد (۱۲۸۶) ہے، [2] جن میں (۱۶۸) کی صحت پر آئمہ کا اتفاق ہے اور باقی (۱۱۱۸) کو ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے۔ امام بخاری نے ان متفقہ روایات سے صرف (۸۳) نقل کی ہیں۔ مسلم نے (۷۱) اور باقی کو مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔''

حقیقت حال:

یہ اندازِ تحقیق جس کی بناء پر علماء کو اندھے مقلد کہہ رہے ہیں، نہ ''متفق علیہ'' کا معنی سمجھا، نہ بخاری کی تعداد صحیح لکھی، نہ مسلم کی۔ ''متفق علیہ'' کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر آئمہ حدیث کا اتفاق ہے، بلکہ بخاری اور مسلم دونوں کتابوں میں جو احادیث ہیں، ان کی تعداد یہ (۱۶۸) ہے۔ اور جو صرف بخاری میں ہیں اور مسلم میں نہیں، ان کی تعداد (۸۰) ہے۔ اور جو صرف مسلم میں ہیں اور بخاری میں نہیں ان کی تعداد

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب كتابة العلم، رقم الحديث(١١٣)

[2] برق صاحب نے اپنی کتاب میں یہی تعداد لکھی ہے، جب کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث کی تعداد دو ہزار دو سو چھیاسی (۲۲۸۶) ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی احادیث کی تعداد تین سو اٹھارہ (۳۱۸) ہے۔

(۷۰) ہے۔ اور بخاری میں جو انس کی حدیثیں ہیں، ان کی تعداد (۲۷۰) ہے۔ اور جو دونوں کتابوں میں مشترک ہیں، ان کی تعداد (۱۴۸) ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی احادیث صحیح ہیں۔

"متفق علیہ" کا معنی:

"متفق علیہ" ان احادیث کو کہتے ہیں، جو بخاری اور مسلم دونوں میں ہوں، کیونکہ ان کی صحت پر امت کا اتفاق ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کے علاوہ باقی احادیث صحیح نہیں یا ان کی صحت پر اتفاق نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بعض احادیث پر اعتراض:

پھر اس کے بعد دوسری تنقید پڑھئے اور ناقد کی قدر کیجئے کہ کیسے کیسے بے سوچے سمجھے نکتے بیان فرما رہے ہیں، کہتے ہیں:

"اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی آپ کی بعض احادیث بدستور محل نظر ہیں۔ مثلاً عتبان بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے التماس کی کہ وہ میرے گھر میں آ کر نماز پڑھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ التجا قبول فرما لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ چند صحابہ بھی تشریف لائے، صحابہ نے منافقین کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے، کتنا اچھا ہو، اگر حضور مالک بن دخشم کی ہلاکت کی دعا کریں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کلمہ نہیں پڑھتا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: زبان سے تو پڑھتا ہے، لیکن اس کا دل بے ایمان ہے۔ فرمایا: جو شخص کلمہ پڑھتا ہے، وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عجیب معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ

لکھ لے اور اس نے لکھ لی۔" ❶ (صحیح مسلم کتاب الایمان)

اگر ابن دخشم واقعی منافق تھا اور اتنے صحابہ کی شہادت غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور خود حضور ﷺ نے بھی اس کی تردید نہیں فرمائی، تو پھر اس کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ منافقین کے متعلق صریح ارشاد ہے:

﴿ وإن تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم ﴾ (التوبة: ۸۰)

"اے رسول! اگر تو ان منافقین کیلئے ستر مرتبہ بھی مغفرت طلب کرے، پھر بھی ہم ان کی بدکاریوں کو معاف نہیں کریں گے۔"

جواب:

حدیث میں یہ لفظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو لا إله إلا الله کہے اور اس کا مقصد رضائے الٰہی ہو، تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ● جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا، تو صحابہ نے شہادت تسلیم کی اور اپنی شہادت کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ منافقین کی خیر خواہی کرتا ہے۔ صحابہ کے پاس اس کے منافق ہونے کی یہی شہادت تھی اور اس کی توجیہ ظاہر ہے کہ بعض آدمی مومن ہوتے ہیں، مگر رشتہ کی وجہ سے بعض منافقوں کے ساتھ ان کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کی بناء پر وہ چاہتے ہیں کہ ان کا خاتمہ ٹھیک ہو جائے اور اس لئے وہ ان کی خیر خواہی کرتے ہیں۔ پس آنحضرت ﷺ

● صحیح مسلم: کتاب الإیمان : باب الدلیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنة قطعاً، رقم الحدیث(۳۳)

● دیکھیں: صحیح البخاري: أبواب المساجد في البیوت، رقم الحدیث(٤١٥)، و کتاب الأطعمة، باب الخزیرة، رقم الحدیث(٥٠٨٦)

کی شہادت کی بناء پر ان کو اپنی بات واپس لینا پڑی۔ اور اگر یہ لفظ جو میں نے ذکر کئے ہیں، نہ ہوں، تب بھی اس کی مراد وہی ہے، جو میں نے بیان کی ہے اور قرآن مجید سے اس کی شہادت ذکر کی ہے۔ قرآن مجید نے منافقوں کے اس قول کی تردید کی ہے، جو وہ کہتے تھے:

﴿ نشهد إنك لرسول الله ﴾

فرمایا:

﴿ والله يعلم إنك لرسوله والله يشهد إن المنافقين لكذبون ﴾ [1]

یعنی "اللہ جانتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی شہادت یہ ہے کہ منافق (اپنے اس قول میں کہ ہم دل سے اقرار کرتے ہیں) جھوٹے ہیں۔"

شقِ صدر والی حدیث:

پھر کہتے ہیں: ایک اور حدیث ملاحظہ ہو:

"انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول کریم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ آپ کے پاس جبرائیل آیا، آپ کو پکڑا، زمین پر گرایا، سینہ چیر کر دل نکالا، پھر دل کو چیرا اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا کہ یہ شیطان والا حصہ ہے، اس حصہ کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا، پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا اور اس زخم کا نشان تادم آخریں باقی رہا۔" [2] (صحيح مسلم: ٣٢٣)

---

[1] المنافقون: ١

[2] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الإسراء، رقم الحديث(١٦٢)

یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے:

☆ **اول**: جب بچپن میں حضور بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، تو حضرت انس کہاں تھے؟

☆ **دوم**: دل کے دو حصے ہیں: دایاں حصہ خون کو پھیپھڑوں میں بھیجتا ہے، جو وہاں سے صاف ہو کر دل کے بائیں حصے میں داخل ہوتا ہے۔ پھر جسم میں چلا جاتا ہے۔ دل ایک پمپ ہے، جو ہاتھ اور پاؤں کی طرح لذت و الم کا احساس نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ خیر و شر کا محرک ہے۔ تمام افکار و جذبات، خیالات، تصورات کا مرکز دماغ ہے۔ خیر و شر کی تحریک بھی یہیں پیدا ہوتی ہے اور ارادے یہیں بندھتے ہیں۔ اگر جبریل کا مقصد منبع شر کو مٹانا تھا، تو دماغ کو چیرتا، نہ دل کو۔ اس میں کلام نہیں کہ بیچارے صوفیاء شعراء دل ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جذبات کا مرکز دل ہے، لیکن غلط فہمی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ دماغ کو مجازاً دل کہہ دیں۔ بہرحال آپ دماغ کو دماغ کہیں یا دل، حقیقت یہی ہے کہ خیر و شر کی تمام تحریکات دماغ سے ابھرتی ہیں اور دماغ کا مسکن کھوپڑی ہے نہ کہ سینہ۔ چونکہ اس کا واضع دل ہی کو سمجھتا تھا، اس لئے اس نے یہ حدیث گھڑتے وقت قطعاً نہ سوچا کہ جب علم ترقی کر جائے گا، تو اس وقت لوگ اس حدیث کو پڑھ کر خدا، رسول، جبرائیل کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ یہی کہ خاکم بدہن ہر سہ دل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے ناآشنا تھے۔

☆ **سوم**: گناہ کی دنیا حسین بھی ہے اور لذیذ بھی۔ انسان اسی صورت میں کامل بن سکتا ہے کہ وہ گناہ کی تمام ترغیبات کو جھٹک کر نیکی کی اجاڑ راہوں پر بڑھتا چلا جائے۔ ایک حسین نوجوان کا تیز نگاہ سے بچ جانا، اس کا کمال ہے، لیکن اگر

کوئی پیر صد سالہ یہ کہے میں عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا، نگاہ کی توہین سمجھتا ہوں، تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس لئے ہمیں اس رسول پر ناز ہے، جو بشر ہوتے ہوئے بھی ہر ترغیب، ہر کشش اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا۔ نہ اس رسول پر جسے آپریشن کرکے خطا کاری کی استعداد ہی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

☆ **چھارم**: اگر اللہ کی منشا یہی تھی کہ ہر نبی معصوم ہو، تو وہ ماں کے پیٹ میں ان کے دماغ کی ویسی ساخت بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ بھی پیدا نہ ہو سکتا اور بعد میں جبرائیل سے آپریشن (اور وہ بھی غلط مقام پر) کرانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

☆ **پنجم**: یہ زمزم کے پانی سے دھونے کی بھی خوب کہی۔ اگر کوئی شخص بجلی کی تاروں کو پانی سے دھونا شروع کر دے اور کہے میں ان تاروں سے بجلی ختم کر کے رہوں گا، تو اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ دل یا دماغ میں نیکی یا گناہ کا صرف ارادہ پیدا ہو گا۔ اگر ہم دماغ سے بھیجا نکال کر اسے پانی سے دھونا شروع کر دیں اور کہیں کہ آج ارادوں کا تمام مواد ختم کر کے ہی دم لیں گے، تو ہر شخص ہمیں دیوانہ سمجھے گا۔'' (دو اسلام: ۷۵، ۷۶، ۷۷)

جواب:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عام روایات کو غیر معتبر قرار دینے کیلئے آپ نے اس روایت کا انتخاب کیا ہے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ انس رضی اللہ عنہ عینی شاہد نہیں اور یہ اعتراض نہایت ہی کمزور ہے، کیونکہ انس رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ عینی شاہد کی بناء پر ذکر نہیں کیا، بلکہ اس واقعہ کو جیسے سنا، بیان کر دیا۔ ایسی روایات کو ''مراسیل صحابہ'' کہتے

ہیں اور محدثین ان کو "صحیح" سمجھتے ہیں [1] کیونکہ یہاں جو واسطہ محذوف ہے، وہ معتبر ہے، کیونکہ وہ واسطہ یا تو حضور ﷺ خود ہیں، یا کوئی صحابی ہے۔ [2]

افکار و جذبات کا محل:

دوسرا اعتراض محاورات اور حقیقت سے غفلت پر مبنی ہے۔ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ اس واقعہ میں دل کو محل افکار و جذبات وغیرہ تصور کیا گیا ہے اور یہ نفس الامر کے خلاف ہے۔ یہ اعتراض محاورات سے غفلت پر مبنی ہے۔ عرف میں چونکہ محل ارادہ دل کو ہی خیال کیا جاتا ہے، اگرچہ واقعہ میں اس کے خلاف ہو، مگر کلام عرف پر ہی کی جائے گی۔ یعنی یہی کہا جائے گا، میرا دل کرتا ہے، میرا جی چاہتا ہے، میرے دل میں تیری محبت ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ میرا دماغ چاہتا ہے، میرے دماغ میں تیری محبت ہے۔ قرآن مجید نے بھی جذبات کی نسبت دل ہی کی طرف کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لا تعمى الأبصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور﴾ [3]

---

1. الكفاية: ٣٨٥، مقدمة ابن الصلاح: ٣١، توضيح الأفكار: ١/٢٩٥

2. حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! جو احادیث ہم تم سے بیان کرتے ہیں، وہ ساری احادیث ہم نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنی ہوتی، لیکن ہم ایک دوسرے کو احادیث سناتے وقت جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ (المعجم الكبير: ١/٢٤٦) و قال الهيثمي: "رجاله رجال الصحيح" مجمع الزوائد: ١/٣٨٣، المستدرك: ٣/٦٦٥) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی، تو ان سے ایک آدمی نے پوچھا: کیا آپ نے خود یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! مجھے یہ حدیث ایسے شخص نے بیان کی ہے، جو جھوٹ نہیں بولتا، خدا کی قسم! ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے، بلکہ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جھوٹ ہوتی کیا چیز ہے؟! (مفتاح الجنة للسيوطي: ٧٧)

3. الحج: ٤٦

''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں، جو سینوں میں ہیں۔''

﴿ فعلم ما في قلوبهم ﴾ ❶

''اللہ نے ان کے دلی افکار و جذبات کو جانا۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ ختم الله على قلوبهم ﴾ ❷

''اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔''

اور بھی بہت سی آیات ایسی ہیں، جن میں دل کا محل افکار ہونا بتایا گیا ہے۔ پھر سینے کا بھی ذکر ہے۔ اصل میں یہ محاورات جب مستعمل ہو جاتے ہیں، پھر متکلم کی کلام ان کے تابع ہوتی ہیں۔

شقِ صدر کی حقیقت:

رہی بات آپریشن کی کہ آپریشن بے محل ہوا، اس کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ جب عرف میں دل اور سینہ ہی محل افکار ہے، تو شق اور شرح کی نسبت بھی سینے کی طرف ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں جابجا شرح کی نسبت سینے ہی کی طرف کی گئی ہے:

﴿ ألم نشرح لك صدرك ﴾ ❸

''کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھولا؟''

یہاں بھی دماغ کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

---

❶ الفتح: ١٨

❷ البقرة: ٧

❸ الإنشراح: ١

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کہا تھا:

﴿ رب اشرح لي صدري ﴾ ❶

"اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے۔"

یہ نہیں کہا کہ میرا دماغ کھولا جائے۔

اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

﴿ أفمن شرح اللّٰه صدرهٗ ﴾ ❷

"کیا پس جس کا اللہ سینہ کھول دے۔"

یہ نہیں کہا کہ جس کا اللہ دماغ کھول دے۔ پھر پاک کرنے کی نسبت بھی دل ہی کی طرف کی گئی:

﴿ أولٰئك الذين لم يرد اللّٰه أن يطهر قلوبهم ﴾ ❸

"اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ ان کے دل پاک کرے۔"

﴿ كتب في قلوبهم الإيمان ﴾ ❹

"ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا۔"

﴿ ولما يدخل الإيمان في قلوبكم ﴾ ❺

"ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں!"

غالباً اتنی بات تو سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ عرف کے مطابق ہی بات کی جاتی ہے،

---

❶ طٰہٰ:٢٥

❷ الزمر:٢٢

❸ المائدة:٤١

❹ المجادلة:٢٢

❺ الحجرات:١٤

حقیقت کی طرف بول چال اور محاورہ میں التفات نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں یہ آپریشن کا معاملہ عالم شہادت کا نہیں، بلکہ عالم مثال کا ہے، جو نفس الامر ہونے کے باوجود کشف اور خواب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اصل مقصد اس سے معنوی شرح صدر ہے، جس کا قرآن نے بار بار ذکر کیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ پر یہ جو واقعہ گذرا، یہ ایک نفس الامری مثالی واقعہ ہے اور مثالی واقعات میں عرف اور اعتقاد کا لحاظ ہوتا ہے، کیونکہ اس سے مقصود صاحب واقعہ نہیں، تاثیر پیدا کرنا ہوتا ہے اور ایک قسم کی تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے۔ جیسے کسی شخص کو خواب میں یہ محسوس ہو کہ میرا سینہ چیرا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو معنوی وسعت صدر حاصل ہوگی، خواہ یہ وسعت صدر بعض ظاہری اسباب کی بناء پر ہو۔ اسی طرح اس واقعہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بچپن میں جیسے اور بچوں کے دل میں کھیل کود کی الفت ہوتی ہے، آپ ﷺ میں نہیں رہے گی۔

تیسرا اعتراض بھی لغو ہے، کیونکہ یہ واقعہ آپ ﷺ کے اخلاق کی ایک تصویر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ کی فطرت سے جذبات کو نکال دیا گیا تھا، جیسا کہ معترض نے سمجھا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ کے جذبات پر آپ ﷺ کی عقل اور آپ ﷺ کا ایمان غالب ہوگا۔

چوتھا اعتراض بھی اسی قسم کا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ شاید آپ ﷺ سے جذبات کو نکالا گیا ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ اس واقعہ میں یہ اشارہ ہے کہ آپ ضبط نفس کا ملکہ رکھتے ہیں۔

پانچواں اعتراض بھی اسی قسم کا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد بھی اس بات پر ہے کہ یہ واقعہ عالم شہادت کا ہے۔ حالانکہ واقعہ مثالی نفس الامری ہے اور پانی کی طرف نسبت

اسی طرح ہے، جیسے کوئی خواب میں اپنا دل دھلتا ہوا دیکھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واقعی اس کا دل عالم شہادت میں دھویا گیا ہے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس کا دل صاف ہوگیا

یہ جواب تو آپ لوگوں کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

شقِ صدر کا صحیح مفہوم:

اب سنئے کہ اس واقعہ کو ظاہر پر محمول کرنے سے بھی کوئی خرابی لازم نہیں آتی، کیونکہ یہاں آپریشن کرنے والے جبرائیل علیہ السلام ہیں، کوئی ابن آدم نہیں۔ وہ اس چیز سے واقف ہیں کہ کس مقام کی اصلاح سے جذبات پر اثر پڑیگا۔ قرآن مجید نے بھی جبرائیل علیہ السلام کے نازل کرنے کے ذکر میں دل کا ہی بیان فرمایا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿فإنه نزله علی قلبك بإذن الله﴾ ❶

''جبرائیل علیہ السلام نے اس (قرآن) کو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے۔''

لو! اب اللہ بھی اس امر میں شریک ہو گئے کہ دل ہی محل نزول ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ دماغ منبع ہے۔ مظہر نہیں، تو پھر بھی اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ دل کی اصلاح کو دماغی اصلاح میں دخل ہو۔ بعض اعضاء ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا بہ ظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہوتا، مگر تجربہ سے ان کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مویشی کے تھن اگر پک جائیں، تو ان کے سینگ پر مالش کرنے سے آرام آجاتا ہے۔ جب مویشیوں کو اپھارہ ہوتا ہے، تو ان کا کان

❶ البقرۃ: ۹۷

چیرا جاتا ہے۔ اسی طرح مراق کے مرض میں، جس کا تعلق جگر اور پیٹ کے پردے سے ہوتا ہے، مگر دماغ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ مالی خولیا میں جس کا تعلق دماغ سے ہے، دل کا بھی علاج کیا جاتا ہے۔

طبی نقطہ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دل ایک پمپ ہے، جو خون صاف کرتا ہے، جس قدر یہ آلہ قوی ہو گا اسی قدر خون کی صفائی میں مدد ملے گی اور خون کی صفائی کا اثر دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ بلکہ تمام بدن کے اجزاء ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ طبیب نبض دیکھ کر، جس کا تعلق براہ راست صرف دل سے ہے، تمام اعضاء کی کیفیت اس سے معلوم کر لیتے ہیں۔ چوتڑ پر ٹیکہ لگانے سے دماغ ٹھیک ہو جاتا ہے اور باسلیق کے فصد سے خاص اعضاء متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلیم کے فصد سے طحال پر اثر پڑتا ہے۔ پس دل کے آپریشن سے دماغ پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ اور مرکزی حصہ جو حرکات پر کنٹرول رکھتا ہے، وہ بھی دل کے پیچھے وسط میں واقع ہے۔

اور پانی اگرچہ فی نفسہ دل کی اندرونی صفائی کیلئے کافی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ اس جہان کی چیزوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ استعمال کرنے والے کی لیاقت کے ساتھ ایک ادنیٰ چیز بھی اعلیٰ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ استبعاد اسی وقت ہے، جب تک کہ اپنے مشاہدہ یا علم میں نہیں ہیں۔ پھر آج کل کے حکماء کی تحقیق کو انتہائی تحقیق خیال کرنا، کہاں کی دانشمندی ہے؟

آج کل کی تحقیق کی بنیاد تجربہ پر ہے اور تجربہ سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حس، خیال، حافظہ اور واہمہ کا مظہر دماغ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دل کو بھی ان قویٰ کے منشا ہونے میں دخل ہے؟ اب تک اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی۔

احادیث کی تعداد کے متعلق غلط فہمی:

اس کے بعد (صفحہ: ۷۸) پر لکھتے ہیں:

ابن حنبل نے چالیس ہزار احادیث جمع کیں، ان کے راویوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان احادیث کو روایت و درایت کے معیار پر پرکھنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ امام بخاری پہلے محقق ہیں، جنہوں نے ٦ لاکھ احادیث (امام بخاری تک صرف چھ لاکھ پہنچی تھیں، ورنہ یحییٰ بن معین کو ۱۴ لاکھ احادیث کا علم تھا) میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کرنے کے لئے انتہائی کوشش کی۔ بعض اوقات ایک ایک حدیث کیلئے کئی کئی استخارے کئے۔ یعنی جو کچھ انسانی طاقت میں تھا، انہوں نے کیا۔ لیکن جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروق و صدیق رضی اللہ عنہم جلا رہے تھے، وہ اڑھائی سو برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں۔"

جواب:

یہ جو کچھ ذکر کیا ہے، جھوٹ کا پلندہ ہے۔ امام احمد بن حنبل نے جو روایات لکھی تھیں، ان کو ان کی صحت وسقم کا حال معلوم تھا۔

اسی لئے فرماتے ہیں: میں نے اس کتاب کو بطور معیار لکھا ہے۔ [1] ان کے مجموعہ کی یہ اصح حدیثیں تھیں اور ان کا مجموعہ بھی لاکھوں سے متجاوز تھا۔

باقی رہی یہ بات کہ "یحییٰ بن معین کے نزدیک ۱۴ لاکھ احادیث تھیں اور بخاری کو صرف چھ لاکھ معلوم ہوئیں۔" اس کا رد پہلے ہو چکا ہے اور صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم کے

---

[1] خصائص مسند أحمد لأبي موسى المديني: ۱۳

احادیث جلانے کی بھی تردید ہو چکی ہے۔

وضع احادیث کا فتنہ:

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ:

''احادیث وضع کرنے والے بہت ہوئے اور ہزاروں احادیث وضع کی گئیں''

جواب:

مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ اگر واضعین اپنی جگہ احادیث کو وضع کرتے تھے، تو ان کے مقابل محدثین کا ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے، جو کسی واضع کی دال نہیں گلنے دیتے تھے۔ کیونکہ معروفین اساتذہ کے شاگردوں کی احادیث مرویہ کی گنتی منضبط ہو چکی تھی۔ اسی واسطے دارقطنی نے اپنے زمانہ میں بغداد میں اعلان کیا تھا کہ کوئی شخص ذخیرہ حدیث میں وضعی حدیث داخل نہیں کرسکتا۔ ❶

کیونکہ وضعی حدیث بنانے والے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی سند بنائے اور جب سند بیان کرے گا، تو اس کا کذب ظاہر ہو جائیگا۔

حفاظتِ حدیث کے اسباب:

① حدیث چونکہ ایک دینی بات تھی

② نیز آنحضرت ﷺ کے وقت سے لیکر اصحابِ کتب تک اکثر تحریریں منضبط ہو چکی تھیں۔

③ خلفاء اس کی سرپرستی کرتے تھے۔

④ اسلامی حکومت کے دفعات میں اس سے مدد لی جاتی تھی۔

---

❶ الموضوعات لابن الجوزي: ١/٤٥، فتح المغيث: ١/٢٦٠، اللآلي المصنوعة: ٢/٤٧٢، تنزيه الشريعة: ١/١٦

۵ محدثین کا حافظہ انتہائی درجہ کا تھا۔
۶ ایک ایک حدیث پر مکمل بحث ہوتی تھی۔

ان وجوہ اور دیگر وجوہ کی بناء پر وضع کرنے والا دین میں ان کو داخل نہیں کر سکا۔ جن احادیث کو امت نے بالاتفاق ''صحیح'' کہا ہے۔ ان میں سے بعض میں بعض کلمات شاذہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی سب مضامین قطعی ہیں۔ ان کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف اسی طرح ہے، جیسے قرآن کی آنحضرت ﷺ کی طرف۔

قرآن وحدیث دونوں محفوظ ہیں:

امت میں بعض لوگ ایسے گذرے ہیں، جو قرآن کو بھی محرف مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کچھ حصہ قرآن کا ضائع ہو گیا اور آپ نے لکھ مارا ہے کہ عراق کا قرآن حجاز کے قرآن سے الگ ہو گیا تھا۔ مگر باوجود اس کے صحیح بات یہی ہے کہ قرآن میں تغیر وتبدل نہیں ہوا۔ آج مدارس میں ہزاروں بچے قرآن پڑھتے ہیں اور بہت سے غلطیاں کرتے ہیں اور بہت سے واعظ بہت سے مسائل قرآن کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن میں نہیں ہوتے۔ ان واعظوں اور غلط قرآن پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں سے متجاوز ہے، مگر پھر بھی قرآن جوں کا توں ہے۔ اسی طرح جو حدیث بالاتفاق محدثین صحیح ہو، اس کے متعلق محض اس بناء پر کہ واضعین بہت ہوئے ہیں اور انہوں نے بہت سی احادیث وضع کی ہیں، یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ بھی وضعی ہو گی۔

احادیث کی شرعی حیثیت:

صحاح کی ہر حدیث کے متعلق ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے۔ صرف انہی احادیث کے متعلق کہہ سکتے ہیں جن کی صحت پر امت کا اجماع

ہے، جیسے بخاری و مسلم کی غیر تنقید شدہ روایات یا ان کے علاوہ متواتر اور اجماعی الصحت روایات۔ ان کے علاوہ باقی احادیث جن کی صحت پر اتفاق نہیں، بلکہ اختلاف ہے، ان کو قواعد قرآن کے مطابق جن کا محدثین نے ذکر کیا ہے، پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔

جن کی صحت کا ہمیں علم ہو، ان پر عمل کرنا فرض ہے، بلکہ قرآن کا یہی حال ہے۔

قرآن اور تواتر:

قرآن اصل میں اگرچہ متواتر ہے، مگر قرآن کی سب آیات سب کے علم میں تواتر سے نہیں آئیں۔ قرآن کے بہت سے مسائل جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے، ان کے ہاں وہ مسائل متواتر نہیں، اگر کوئی صاحب علم جس پر ان کو اعتماد ہو، قرآن کے وہ مسائل سنائے، تو لامحالہ ان پر عمل کرنا فرض ہوگا۔ اگرچہ وہ مسائل خبر واحد کے حکم میں ہیں۔ ضروری نہیں قرآن کے احکام پر اس وقت عمل کیا جائے، جب ان احکام کو بیان کرنے والے حد تواتر کو پہنچ جائیں۔ خبر واحد کا دروازہ بند کرنے سے سلسلہ تبلیغ بالکل بند ہو جاتا ہے۔ پس اس صورت میں لازم ہو جاتا ہے کہ ایک ایک آدمی کے پاس قرآن کا ہر مسئلہ بیان کرنے کیلئے اتنے مبلغ پہنچیں کہ متواتر کی تعریف ان پر صادق آئے۔

صرف یہ کہہ دینا کہ یہ قرآن کا مسئلہ ہے اور قرآن کی فلاں سورت فلاں رکوع میں ہے، ایک شخص کیلئے متواتر نہیں بنا دیتا۔ اس طرح تو جو بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی جائے اور آنحضرت ﷺ چونکہ معصوم تھے، اسلئے وہ بات یقینی ہو جانی چاہئے۔

محدثین کی مساعی جمیلہ کی ناقدری:

آگے لکھا ہے کہ فلاں کی حدیث جھوٹی ہیں، فلاں کی جھوٹی ہیں۔

مگر یہ بھی جاننا چاہیے کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی کہ فلاں حدیث جھوٹی ہے، ظاہر ہے بتانے والے محدثین ہی ہیں، پس محدثین کی قدر کرو اور ان کے مجموعوں کو بہ نظرِ عزت دیکھو۔

تیسرا باب

چند عجیب راوی وصحابہ

تیسرے باب میں ''چند عجیب راوی وصحابہ'' کا ذکر کیا ہے۔
راوی وہی جن کو محدثین نے کذاب کہا ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ محدثین کی مدح اور حدیث کی حفاظت میں ان کا ذکر کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ مصنف نے حدیث اور محدثین کی توہین میں ان کا ذکر کیا ہے۔

موضوع احادیث کا تذکرہ:

1. ایک حدیث بیان کی ہے، جو کسی دشمنِ اسلام نے غسلِ جنابت کی فضیلت میں گھڑی ہے۔[1]
2. اس کے بعد ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک واعظ نے امام احمد اور یحییٰ بن معین کے واسطہ سے ایک جعلی حدیث بیان کی۔ جب ان دونوں اماموں نے واعظ سے اس حدیث کے بارہ میں لاعلمی کا اظہار کیا، تو اس نے کہا: ''اس وقت سترہ احمد بن حنبل اور سترہ یحییٰ بن معین ہیں، تم کیا ہو!''[2]

---

[1] حدیث یہ ہے کہ'' جو شخص مباشرت کے بعد غسل جنابت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بہشت میں اس کے لیے سفید موتیوں کے ایک سو محل تیار کر دیتا ہے اور پانی کے جتنے قطرے اس کے جسم سے ٹپکتے ہیں، ہر قطرے پر اسے ایک ہزار شہید کا اجر ملتا ہے۔'' یہ حدیث: ''موضوع'' ہے۔ (كشف الخفا(٢٣٨٧)، الموضوعات:٣١٧(٤٦٠) الفوائد المجموعة:٩،تذكرة الموضوعات:٣٢)

[2] الضعفاء لابن حبان: ١/٧٥، الموضوعات لابن الجوزي:١/٤٦، یہ قصہ بھی ''سخت ضعیف'' ہے۔ اس کی سند میں ''إبراهيم بن عبد الواحد الطبري'' مجہول ہے، حافظ ذہبی نے اس قصہ کو ''منکر'' قرار دیا ہے۔ اور فرماتے ہیں: ڈر ہے کہ یہ قصہ اس (ابراہیم) کا وضع کردہ نہ ہو۔(لسان الميزان: ١/٧٩، الكشف الحثيث(٣٩)

③ قیس بن تمیم گیلانی چھٹی صدی ہجری کے راوی تھے۔ آپ کی پیشانی پر ایک داغ تھا، جس کے متعلق آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خچر نے آپ کی پیشانی پر لات رسید کی تھی۔ [1]

توجیہ: مطلب یہ کہ آپ سوا پانچ سو برس پہلے موجود تھے۔

④ اسحاق بن ابراہیم طوسی کہتا ہے کہ میں ہندوستان گیا۔ وہاں قنوج میں ہندوستان کے بادشاہ سرباتک سے ملا، اس وقت اس کی عمر سات سو ستر برس تھی۔ (الخ) [2]

⑤ ابوسعید مظفر کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہزار سربانک سے ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ میں تین مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا، دو دفعہ مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ میں، اس کی عمر ۸۹۴ برس تھی۔ [3] (تذكرة الموضوعات: ١٠٧)

⑥ علامہ ابن عسقلانی "لسان المیزان" میں مندرجہ ذیل داستان نقل فرماتے ہیں:

"۵۷۳ھ میں عبدالکریم بن نصر کسی جنگل میں شکار کے لئے گئے اور

---

[1] الإصابة:٥/٥٥٦، لسان الميزان: ٤/٤٧٦، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے " من بابة رتن" اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے " من نمط رتن الهندي" کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ یہ ان کذاب لوگوں میں سے ہے، جنھوں نے کئی صدیاں بعد میں آ کر صحبتِ نبوی کا دعویٰ کیا تھا اور جھوٹی روایات لوگوں کو سناتے رہے۔

[2] أسد الغابة:١/٤٢٢، الإصابة:٣/٢٧٩، لسان الميزان: ٣/١٠، تذكرة الموضوعات :١٠٢، حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ واضح جھوٹ ہے۔" علامہ پٹنی نے بھی اس کو ایسے لوگوں میں ذکر کیا ہے، جنھوں نے کذبا صحبت نبوی کا دعویٰ کیا تھا۔ جب تمام علماء اس واقعہ کو جھوٹ اور غلط قرار دے رہے ہیں، تو اس کو بنیاد بنا کر اعتراض کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟!

[3] معترض نے یہ واقعہ "تذكرة الموضوعات" سے نقل کیا ہے جس کے مؤلف نے خود اس کو جھوٹ قرار دیا ہے۔

پھرتے پھراتے ایک جنگل میں جا پہنچے، جس کے تمام باشندے اپنے آپ کو جبیر بن حرب کی اولاد بتلاتے تھے اور لطف یہ کہ جبیر بدستور زندہ تھا اور کہتا تھا کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ جنگ خندق میں شامل تھا۔" [1]

⑦ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص ابوعبداللہ محمد صقلی کو ملا، اس نے مجھے بتایا کہ میرے استاد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور یہ کہ اس کی عمر ۴۰۰ برس سے کچھ زیادہ تھی۔" [2] (تذکرۃ الموضوعات: ۱۷)

تعجب ہے کہ شاگرد صاحب ابن حجر کو یہ واقعہ سنانے کیلئے نویں صدی ہجری تک جیتے رہے۔

⑧ علامہ ذہبی "میزان" میں لکھتے ہیں کہ بابارتن ہندی کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی تھی۔ [3] لیکن محدثین کی ایک خاص تعداد ان کو صحابی سمجھ کر اس سے احادیث بیان کرتی تھی۔ جب علامہ ذہبی نے بابارتن کی روایات کو جھوٹا قرار دیا، تو قاموس کے مصنف علامہ مجد الدین فیروز آبادی (وفات ۸۱۴ھ) کو اس قدر

---

[1] لسان المیزان: ۲/۹۷، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۲، علامہ طاہر پٹنی نے اپنی کتاب میں بایں عنوان ایک باب قائم کیا ہے: " باب فیمن ادعی الصحبۃ کذبا من المعمّرین" پھر اس باب کے تحت ایسے تمام جھوٹے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے کئی صدیاں بعد میں آ کر صحبت نبوی کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ جزاہ اللہ خیراً! اب انہی کذاب لوگوں کو لے کر برق صاحب محدثین پر اعتراض کر رہے ہیں، جن کو برسوں پہلے محدثین کرام رحمہم اللہ کذاب و دجال قرار دے چکے ہیں۔

[2] لسان المیزان: ۶/۶۸، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۷، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس سے ملا، بلکہ فرماتے ہیں: مغرب میں ایک ایسا آدمی گزرا ہے، جو کہتا ہے میں نے اپنے استاد سے مصافحہ کیا تھا، جس نے نبی اکرم ﷺ سے مصافحہ کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: "کوئی بھی عقلمند آدمی ایسے واقعہ سے خوش نہیں ہو سکتا۔" جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خود ہی اسے کم عقلی کی بات کہہ رہے ہیں، تو پھر اعتراض چہ معنی دارد!

[3] میزان الاعتدال: ۲/۴۵، لسان المیزان: ۲/۴۵۱

صدمہ پہنچا کہ انہوں نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے۔ بابارتن تین سو احادیث کے راوی ہیں۔

⑨ ایک اور حدیث نماز باجماعت کی فضیلت میں بیان کی ہے۔

⑩ ایک اور حدیث اس مضمون کی بیان کی ہے، جو غنی کی غنا کی وجہ سے عزت کرتا ہے، فقیر کی فقر کی بناء پر توہین کرتا ہے، اللہ کی لعنت میں ہمیشہ رہتا ہے۔

⑪ جو آلِ محمد سے بغض کرتا ہوا مرا، وہ کافر مرا۔ ❶

پھر کہتے ہیں، بابارتن کی احادیث بیشک جھوٹی ہیں، مگر مضمون اچھا ہے۔

امام ذہبی کا خیال ہے کہ بابارتن کی تمام روایات موسیٰ بن مجلی نے ۶۰۰ھ کے قریب وضع کی ہیں۔

پھر خود ہی لکھتے ہیں: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ أبوالطفیل عامر بن واثلة آخری صحابی تھا، جس کی وفات ۱۰۲ھ میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ ❷

---

❶ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ''رتن هندي دجال'' کے رد میں مستقل رسالہ لکھا تھا، مذکورہ بالا تینوں حدیثیں اسی ''رتن ھندی'' کی روایت کردہ ہیں، جنھیں حافظ ذہبی نے موضوع قرار دیا ہے۔(لسان للمیزان: ۲/ ٤٥٠، تذكرة الموضوعات: ١٠٣)

❷ الإصابة: ۷/ ۲۳۰۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی اور فرمایا: آج کی رات میں جو لوگ زندہ ہیں، ایک سو سال کے بعد ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔(صحيح البخاري: كتاب العلم، باب السمر في العلم، رقم الحديث(١١٦)، صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب قوله صلى الله عليه وسلم لا تأتي مائة سنة و على الأرض نفس، رقم الحديث(٢٥٣٧) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان افراد قیس بن تمیم، سرباتک، جبیر بن حرب، أبوعبد اللہ معمر، رتن ھندی کے متعلق درازیٔ عمر کے جو اقوال گزرے ہیں، وہ اس حدیث کے صریح مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہیں۔

جواب:

اس باب میں جو کچھ بھی ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت حدیث کا کتنا بڑا انتظام کیا کہ جب کسی نے جھوٹ کہا، اس کے جھوٹ کو ظاہر کرنے کیلئے محدثین کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اور جن محدثین نے یہ داستانیں اور موضوعات لکھی ہیں، صحیح سمجھ کر نہیں لکھیں، بلکہ بطور معرفت لکھی ہیں۔ بعض وقت محدثین بعض واقعات کو جن کا جھوٹ عیاں ہوتا ہے، قلمبند کرتے ہیں اور اس کی سند بھی ساتھ لکھ دیتے ہیں، تاکہ ضرورت کے وقت ان کی اسانید سے ان کا جعلی ہونا ثابت کیا جائے، استدلال کے لئے نہیں لکھتے۔ انہی اسانید کی بناء پر جو ان واقعات کے ساتھ لکھی جاتی ہیں، محدثین ان پر وضع اور جعل کا حکم لگاتے ہیں اور بعض غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اور اگر کوئی محدث کسی جعل ساز سے کسی وقت متاثر بھی ہوا ہے، تو اس سے فن حدیث کا متاثر ہونا لازم نہیں آتا، خصوصاً وہ محدثین جن کا زمانہ باقاعدہ تدوین حدیث کے بعد کا ہے۔

چوتھا باب

أئمہ حدیث اور راویوں کے متعلق

چوتھے باب میں وہ باتیں بیان کی ہیں، جو علماء نے ایک دوسرے کے بارہ میں کہی ہیں۔

ان اقوال کے اسباب:

ان باتوں کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

بعض وقت ایک عالم دوسرے عالم کو اپنے سے کم علم پا کر اس کے علم کی نفی کرتا ہے، اس سے حقیقت مراد نہیں ہوتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول:

جیسے مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''انس اور ابوسعید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا علم نہیں، وہ دونوں چھوٹے بچے تھے۔''[1] (مختصر جامع: ۱۹۷)

یعنی جتنا ہمیں علم ہے، اتنا ان کو علم نہیں تھا، یا جتنا اور کبار صحابہ کو علم ہے، اتنا ان کو علم نہیں۔

اور کبھی کبھی ایک عالم دوسرے عالم پر اس لئے طعن کرتا ہے کہ اس نے کوئی

[1] جامع بيان العلم: ۲/۱۱۰۰ (۲۱٤٦) ، تاريخ دمشق: ۲۰/۳۹٤، اس کی سند میں علي بن الهيثم ''مقبول'' ہے۔(تقريب التهذيب: ٤٠٦) لہٰذا اس کی سند ''ضعیف'' ہے۔

مسئلہ غلط کہا ہوتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول:

جیسے ذکر ہے کہ جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث (کہ وتر حتمی چیز نہیں) عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے آگے ذکر ہوئی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابو ہریرہ نے غلطی کی ہے، اور اس کیلئے "کذب" کے الفاظ استعمال کیے۔ [1] کذب عربی زبان میں کبھی غلطی کو کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے، یہ کوئی طعن نہیں۔ (جامع: ۱۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دوسرا قول:

اور یہی مطلب مندرجہ ذیل واقعہ میں مائی صاحبہ کا ہے، جب ان کے آگے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث پڑھی گئی:

"صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ وإذا خشیت الصبح فواحدۃ" [2]

"رات کی نماز دو دو رکعت ہے اور جب صبح قریب آجائے، تو ایک رکعت وتر کرو۔"

تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"کذب ابن عمر" (جامع: ۱۹۷)

"ابن عمر نے غلطی کی ہے۔" [3]

---

[1] جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰۱ (۲۱٤۸) اس کی سند میں حبیب بن ابی ثابت کا "عنعنہ" ہے اور وہ "کثیر الإرسال والتدلیس" ہیں۔ (تقریب التھذیب: ۱۵۰، جامع التحصیل: ۱۵۸)

[2] السنن الکبریٰ للنسائي: ۱/۱۷۰ (٤۳۸) نیز دیکھیں: صحیح البخاري (٤٦۰)، صحیح مسلم (۷٤۹)

[3] یہ واقعہ مجھے "جامع بیان العلم" میں نہیں مل سکا۔ واللہ اعلم!

یہاں بھی "کذب" کے معنے غلطی کرنے کے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تیسرا قول:

اسی طرح جب ان کے آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ:

" إن الميت يعذب ببكاء أهله عليه"

"میت کو اس پر رونے سے سزا ملتی ہے۔"

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بیان کی گئی، تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

اللہ عمر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے! کیا اس نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی:

﴿وَلا تزر وازرة وزر أخرىٰ﴾ [1]

"کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" [2]

اس میں بھی مائی صاحبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کرنے میں تغلیط کی ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔ مگر قرآن اور اس حدیث میں موافقت اس طرح ہو سکتی ہے کہ حدیث سے مراد وہ صورت لی جائے، جب مرنے والا اپنا فرض نہی عن المنکر نہ ادا کرتا ہو، یا نوحہ کی وصیت کر جائے۔ اس صورت میں اس گناہ میں اس کی شرکت ہوگی۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ومن أوزار الذين يضلونهم بغير علم﴾ [3]

---

[1] الأنعام: ١٦٥

[2] جامع بيان العلم: ٢/١١٠٢ (٢١٤٩)، نیز دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب قول النبي ﷺ يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه، رقم الحديث(١٢٢٦)، صحيح مسلم: كتاب الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء أهله عليه، رقم الحديث(٩٢٩)

[3] النحل: ٢٥

’’ان لوگوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، جن کو گمراہ کرتے ہیں۔‘‘

کیونکہ قرآن مجید کا حکم ہے:

﴿قوا أنفسكم وأهليكم ناراً﴾ ❶

’’اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔‘‘

یعنی ان کو برے کام سے روکو، اگر نہ روکے گا، تو فرض میں کوتاہی کی بناء پر قابل سزا ٹھہرے گا۔ ❷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا چوتھا قول:

اسی طرح جب مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث بیان کی گئی:

" اطلع النبي صلى الله عليه وسلم على أهل القليب فقال هل وجدتم ماوعد ربكم حقا فقيل له أتدعو أمواتا فقال ما أنتم بأسمع منهم ولكن لا يجيبون"

’’مقتولین بدر کی لاشیں جو ایک گڑھے میں ڈالی گئی تھیں، ان کو خطاب کر کے فرمایا: کیا تم نے اللہ کے وعدے کو صحیح پایا؟ کسی نے کہا: کیا آپ مردوں کو پکار رہے ہیں؟ فرمایا: تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، مگر وہ جواب نہیں دیتے!‘‘

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ فرمایا تھا:

---

❶ التحريم: ٦

❷ دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه إذا كان النوح من سنته......قبل الحديث(١٢٢٦)

" إنهم ليعلمون الآن أن ما كنت أقول حق "

"وہ اب جانتے ہیں کہ جو میں نے انہیں کہا تھا، حق ہے۔"

اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی:

﴿ إنك لا تسمع الموتىٰ ﴾ [النحل: ۸۰]

"تم مردوں کو نہیں سناتے۔" (صحیح بخاری) ❶

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مطلب یہ تھا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کے ضبط میں غلطی کی ہے۔ اصل یہ تھا کہ "وہ جانتے ہیں" اس نے کہا "سنتے ہیں۔" کیونکہ "سننے" کا لفظ قرآن کے خلاف ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "سننے" کا لفظ بھی قرآن کے خلاف نہیں، صرف خاص و عام کا فرق ہوگا، عام اور خاص میں تناقص نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بہت سے احکام بعض جگہ عام الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں اور دوسری جگہ ان کی تخصیص موجود ہے۔ جیسے بیوہ کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ ❷ اور حاملہ کی عدت، خواہ بیوہ ہی ہو، وضع حمل ہے۔ ❸

اسی طرح سورۃ بقرۃ میں مطلقہ کی عدت تین حیض ہے۔ ❹ مگر سورۃ احزاب میں جس مطلقہ کے ساتھ خاوند کا تعلق مرد و عورت والا نہ ہو، اس پر کوئی عدت نہیں۔ ❺

---

❶ مولف رحمہ اللہ نے دو روایات کے الفاظ کو جمع کر کے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر، رقم الحديث (١٣٠٤)، و كتاب المغازي: باب قتل أبي جهل، رقم الحديث (٣٧٦٠)

❷ البقرة: ٢٣٤

❸ الطلاق: ٤

❹ البقرة: ٢٢٨

❺ الأحزاب: ٤٩

اس قسم کی بہت سی آیات قرآن مجید میں ہیں۔

اسی طرح قرآن کی آیت عام، مگر حدیث اہل قلیب کے ساتھ خاص ہے کہ اللہ نے ان کو سنا دیا، جیسے قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ (بخاری) ❶

عروۃ بن زبیر رحمہ اللہ کا قول:

عروہ بن زبیر سے کسی نے کہا کہ بقول ابن عباس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے تھے۔ وہ بولے ''کذب'' یعنی غلط کہا۔ ❷ ''کذب'' اس قول کو بھی کہتے ہیں، جو واقعہ کے خلاف ہو، ہر جگہ اس کے معنے ''جھوٹ'' کرنا مناسب نہیں۔

اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ابن عباس نے ایک شاعر سے یہ بات لی ہے۔ محققین نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کو ہی صحیح قرار دیا ہے۔ عروہ تابعی ہے، صحابی نہیں۔ صحابہ کی فہرست میں اس کا ذکر مناسب نہیں، شاید ''دو اسلام'' والے عروہ کو صحابی سمجھ رہے ہیں۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا قول:

حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے کسی نے ﴿شَاهِدٍ وَّ مَشْهُودٍ﴾ (البروج:۳) کی تفسیر پوچھی، جب آپ بیان کر چکے، تو کہا کہ ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے غلطی کی ہے۔ ❸

---

❶ صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب قتل أبي جهل، رقم الحديث (۳۷۵۷)

❷ جامع بيان العلم: ۲/۱۱۰۳ (۲۱۵٤) نیز دیکھیں: صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب كم أقام النبي ﷺ بمكة والمدينة، رقم الحديث (۲۳۵۰)، (اس روایت میں " كذب" کی بجائے "أخطأ غفر الله له " کے الفاظ ہیں) المستدرك: ۲/۶۸۳ (٤۲۵۵) مصنف عبد الرزاق: ۳/۵۹۹، (۶۷۸۷) الاستيعاب: ۱/۱۱، الإصابة: ۳/٤۲۲۔

❸ جامع بيان العلم: ۲/۱۱۰۳، (۲۱۵۷) حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اس واقعہ کی سند ذکر نہیں کی۔

اس جگہ بھی ''کذبا'' کے معنے غلطی کرنے کے ہیں۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کے خیال میں ان کی تفسیر صحیح نہ تھی۔ اس میں کسی حدیث کی تردید نہیں، بلکہ ان کے قول کی تردید ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی معصوم نہیں، ان کے علاوہ ہر شخص سے خطا کا صدور ممکن ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ مغیرہ بن شعبہ، عبادۃ بن صامت، ابو محمد مسعود بن اوس انصاری بدری رضی اللہ عنہم کی سب روایات جھوٹی ہیں۔''

(دو اسلام: ۹۷)

اس جگہ مصنف نے سخت غلطی کی ہے۔ ''جامع'' میں یہ لفظ نہیں، بلکہ یہ لفظ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کذب المغیرۃ'' [1] (جامع: ۱۸۹)

یعنی مغیرہ نے غلطی کی ہے، صرف مغیرہ کا نام ہے، عبادہ اور ابو محمد کا نام نہیں۔ یہ واقعہ الگ ہے جب ابو محمد نے کہا کہ وتر واجب ہیں، تو عبادہ بن صامت نے کہا:

''کذب أبو محمد''

''ابو محمد نے وتر کو واجب کہنے میں غلطی کی ہے۔'' [2]

---

[1] جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰٤ (۲۱۵۸) حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اس قول کی سند ذکر نہیں کی، مزید برآں ''سب روایات جھوٹی ہیں'' یہ معترض کا خود ساختہ قول ہے، کتاب مذکور میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، اسی طرح حضرت عبادہ بن صامت کا نام بھی نہیں ہے، وہ صرف اس قول کے بعد ایک دوسرے قول کے راوی ہیں، معترض نے ان کا نام بھی مذکور بالا قول میں جڑ دیا ہے!!

[2] جامع بیان العلم: ۲/۱۲۰٤ (۲۱۵۹) نیز دیکھیں: سنن أبي داود(٤۲٥)، مسند أحمد (۳۲۷٤٥) امام ابن حبان فرماتے ہیں: عبادہ بن صامت کی اپنے اس قول ''کذب'' سے مراد ''أخطأ'' [یعنی غلطی کی] ہے۔ (الثقات لابن حبان: ۳/۳۹۷، نیز دیکھیں: تدریب الراوي: ۱/۳۰٦، توجیۃ النظر: ۱/۲٦٥۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول:

''محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ میں نے امیر معاویہ کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث سنائی، جس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سخت غصہ آیا اور لوگوں کو جمع کر کے کہا:

"بلغني أن رجالاً منكم يتحدثون أحاديث ليست في كتاب الله ولا تؤثر عن رسول الله ﷺ فأولٓئك جهالكم فإيا كم والأماني التي تضل أهلها "(بخاری) [1]

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ایسی احادیث بیان کرتے ہیں جو نہ تو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں اور نہ ہی تعلیمات قرآنی کے مطابق ہیں، خبردار، تم ان جاہلوں سے بچو اور گمراہ کن آرزوؤں سے دور رہو۔'' (دو اسلام :۹۸)

اس واقعہ میں بھی مصنف نے ''عبداللہ بن عمرؓ'' ہی کا نام لیا ہے، حالانکہ یہ ''عبداللہ بن عمروؓ'' ہے، خیر یہ تو علمی بات ہے، ان کو اس سے کیا تعلق!

اب سنئے! عبداللہ بن عمرو نے ایک حدیث بیان کی تھی، جس میں ایک قحطانی کی امارت کا ذکر تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات پہلی دفعہ سنی اور ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المناقب، باب مناقب قريش، رقم الحديث (۳۳۰۹) اس حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں: ''میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو حدیث سنائی'' بلکہ اصل الفاظ ہیں: "أنه بلغ معاوية و هو عنده في وفد من قريش" کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو حدیث پہنچی اور وہ (محمد بن جبیر) قریش کے ایک وفد کے ساتھ ان کے پاس موجود تھے۔ یعنی حدیث سنانے والا کوئی دوسرا شخص تھا، اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے حدیث پہنچانے والے کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ (فتح الباري: ۱۳/ ۱۱٤) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري: ۱۳/ ۱۱۵.

امارت قریش میں رہے گی، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے۔ عبداللہ بن عمرو کی حدیث آپ نے اس حدیث کے معارض پائی، جو ان کی اپنی سنی ہوئی تھی۔ اور یہ فطری امر ہے کہ انسان اپنی سنی ہوئی بات کو زیادہ قوی سمجھتا ہے اور عبداللہ بن عمرو کی حدیث کے بیان میں ایک سیاسی نقصان بھی تھا کہ سننے والے اگر قحطانی ہوں گے، تو ان کے دل میں بھی امارت کا خیال پیدا ہونا شروع ہو جائے گا۔ قریش اور قحطان میں لڑائی شروع ہو جائے گی۔ اس مصلحت کی بناء پر بیان کرنے والے کو ناعاقبت اندیش کہا، یعنی ایک تو بات غلط کہی، دوسرا اس امر کا خیال نہ کیا کہ اس پر کیا مفسدہ مرتب ہو گا۔ مگر عبداللہ بن عمرو کی حدیث ٹھیک ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے معارض نہیں، کیونکہ قریش کی امارت مؤقت امارت ہے، ابدی امارت نہیں۔ کیونکہ اس میں یہ شرط ہے، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں۔ جب یہ شرط نہ رہے گی، تو امارت بھی ان سے جاتی رہے گی۔ اس کے بعد قحطانی کی نوبت آ سکتی ہے۔ اس واقعہ میں صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطا اجتہادی ہے اور نبی کے بعد کوئی معصوم نہیں، ہر ایک سے خطا ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حدیث جھوٹی تھی یا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے جھوٹ بولا اور امیر معاویہ نے عبداللہ بن عمرو کا نام نہیں لیا، بلکہ "رجالا" کہا ہے، جس کا مطلب ہے، چند مرد، کیونکہ نام لینے میں توہین ہوتی ہے، تعریض سے کام لیا۔ ایسے خطابات میں جمع مفرد کی طرف خیال نہیں ہوتا۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا قول:

"جب سمرہ کی یہ حدیث:

"كانت للنبي سكتتان عند قرأته في الصلوٰة"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرأت نماز میں دو مرتبہ سکتہ (ٹھہرنا، وقفہ کرنا) فرمایا

کرتے تھے۔"

حضرت عمران بن حصین (وفات ۵۲ھ) نے سنی، تو کہا:

"کذب سمرة" کہ "سمرہ جھوٹا ہے۔"[1]

جواب:

اس میں دو غلطیاں ہیں:

ایک یہ کہ دو سکتہ سے مراد ایک سکتہ قرأت سے پہلے کا اور دوسرا قرأت کے بعد یا فاتحہ کے بعد کا ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ "کذب" کا ترجمہ "جھوٹا" کیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "اس نے غلطی کی ہے۔" مگر ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ دونوں نے ابی بن کعب کو حکم بنایا، آپ نے فیصلہ کیا کہ سمرہ کی یادداشت درست ہے۔ (بخاري)[2]

آگے لکھتے ہیں کہ "یہ تو تھے صحابہ کرام .... الخ" (دو اسلام: ۹۸)

مگر آپ نے جو کچھ بھی ذکر کیا، ہماری تائید میں ہے کہ حدیث کو اندھا دھند قبول نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ اس پر بہت بحث ہوتی تھی۔ جب پایہ ثبوت کو پہنچ جائے، تو قبول کر لیا کرتے تھے۔ قرآن کے معارضہ کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا قول:

اس کے بعد کہتے ہیں:

"اب ذرا آیئے اور دیکھئے کہ بڑے بڑے آئمہ حدیث ایک دوسرے کو کیا سمجھتے تھے۔

---

[1] جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰۱ (۲۱٤۷)

[2] جزء القراءة للإمام البخاري: ۲۳۔ أبو داود (۷۷۹) یہ حدیث "صحیح البخاری" میں نہیں ہے۔ اس حدیث کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے دیکھیں: إرواء الغلیل: ۲/۲۸۵ (۵۰۵)

حضرت امام مالک بن انس کے متعلق محمد بن اسحاق کہا کرتے تھے، وہ جھوٹا ہے اور امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ ابن اسحاق دجال ہے۔'' [1]

(جامع: ۹۸، دو اسلام : ۹۹)

جواب:

اس میں ایک جھوٹ ہے، یعنی محمد بن اسحاق اور امام مالک کی اس ترشروئی کی

---

[1] امام مالک نے ابن اسحاق پر دو وجہ سے کلام کیا ہے: (ا) امام ابن اسحاق نے کہا: میرے پاس مالک کا علم (موطا) لاؤ، میں اس کا علاج کرتا ہوں، یہ سن کر امام مالک نے فرمایا: وہ ''دجال'' ہے۔ (۲) امام محمد بن اسحاق نے امام مالک کے نسب کے متعلق کلام کیا تھا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کلام محمد بن اسحاق کے صدق و عدالت اور حدیث میں حفظ و ضبط کے متعلق نہیں تھا، بلکہ زیادہ سے زیادہ اسے معاصرانہ چشمک ہی کہا جا سکتا ہے، جس کا فن روایت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں: ''جہاں تک صدق و حفظ کی بات ہے، تو محمد بن اسحاق صدوق اور حافظ ہیں، ابن شہاب نے ان کی تعریف کی ہے اور شعبہ، ثوری، ابن عیینہ اور ایک بڑی جماعت نے ان کو ''ثقہ'' قرار دیا ہے۔ (جامع بيان العلم: ۱۱۰۵/۲ (۲۱٦۲)

امام مالک سے ابن اسحاق کے متعلق ''کذاب'' کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ جب امام مالک سے اس کا سبب دریافت کیا گیا، تو انھوں نے کہا: میں نے ہشام بن عروہ کو کہتے ہوئے سنا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: یہ نری تقلید ہے، جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جب ہشام بن عروہ سے اس قول کا سبب دریافت کیا گیا، تو کہنے لگے وہ (ابن اسحاق) میری بیوی سے روایت کرتا ہے، حالانکہ اس نے میری بیوی کو کبھی نہیں دیکھا!

امام علی بن مدینی اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ہشام کی بات اگر درست بھی ہو، تب بھی ابن اسحاق کو صرف اس وجہ سے ''کذاب'' نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ممکن ہے فاطمہ (ہشام کی بیوی) نے احادیث لکھ کر ابن اسحاق کو بھیجی ہوں، یا پردہ کے پیچھے سے یا پھر بچپن میں سنا ہو، (تهذيب التهذيب: ۳۷/۹) اسی طرح امام احمد نے بھی ہشام بن عروہ کے قول کا یہی جواب دیا ہے۔ (جامع بيان العلم: ۱۱۰٦/۲، تهذيب التهذيب: ۳٦/۹)

وجہ یہ ہے کہ محمد بن اسحاق نے یہ کہا تھا: ''مالک کا علم میرے آگے پیش کرو، میں اس کا معالج ہوں'' یہ بات چیت جب امام مالک کو پہنچی، تو انہوں نے غصہ میں کہا: معالج دجال ہے۔ اور امام مالک نے ''کذاب'' کہا ہے۔ محمد بن اسحاق نے امام مالک کو ''کذاب'' نہیں کہا، اس قسم کی جذباتی بات کا اعتبار نہیں ہوتا، پھر امام مالک نے محمد بن اسحاق کے ساتھ مصالحت کی اور اس کو تحفہ بھیجا۔ ❶

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول:

''امام ابوحنیفہ سے کسی نے پوچھا: جابر جعفی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: ''هو كذاب''(وہ بڑا جھوٹا ہے) ❷ (جامع : ۱۹۵، دو اسلام :۹۸)

جواب:

امام ابوحنیفہ کی کلام کا یہ مطلب ہے کہ اس کی کلام حقیقت کے خلاف ہوتی ہے اور مقدمة مسلم میں بھی جابر پر جرح موجود ہے۔ ❸ یہ ایسی جرح نہیں جو ایک

❶ دیکھیں: الثقات لابن حبان: ۳۸۲/۷ (۱۰۵۳٤) جامع بیان العلم: ۱۰۹٦/۲ (۲۱۳٦)

❷ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: ولا رأيت أحدا أكذب من جابر الجعفي'' نیز دیکھیں: تاريخ ابن معين رواية الدوري :۲۹٦/۳ (۱۳۹۸) ، المجروحين لابن حبان:۲۰۹/۱، الضعفاء للعقيلي:۱۹۵/۱، الكامل في الضعفاء: ۱۱۳/۲، امام ابوحنیفہ جابر الجعفي پر جرح کرنے میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ کئی دیگر محدثین جیسے زائدہ، ابن معین نے بھی اسے ''کذاب'' کہا ہے اور کئی محدثین نے جابر پر ان الفاظ: ''متروك الحديث، ذاهب الحديث، ليس بثقة، اتهم بالكذب'' کے ساتھ جرح کی ہے۔ دیکھیں: (تهذيب الكمال: ٤٧٨/٤) مزید برآں ایسی جرح کو محدثین کی خدمتِ حدیث میں مخلصانہ جدوجہد کے خلاف دلیل نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ ایسی جرح تو حفاظت حدیث کی زبردست دلیل ہے کہ انھوں نے کسی جھوٹے شخص کا بس نہیں چلنے دیا اور اس کی کذب بیانی کا پردہ چاک کردیا ہے۔ رحمهم الله و تقبل منهم و حشرنا في زمرتهم!

❸ صحيح مسلم، المقدمة: ۱۲/۱

عادل، عادل پر کرتا ہے، بلکہ ایک عادل کی مجروح پر جرح ہے۔

امام اعمش رحمہ اللہ کا قول:

''ایک دفعہ اعمش بیمار پڑ گئے، تو فضل اور امام ابوحنیفہ ان کی عیادت کو گئے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر میرا آنا آپ کو ناگوار نہ گذرتا، تو میں ہر روز آتا۔ اعمش نے جھٹ کہا: مجھے تو تیرا اپنے گھر میں بھی رہنا گوارا نہیں۔ ❶

(جامع: ۱۹۸، دو اسلام: ۹۸)

جواب:

اس کا مطلب تو صرف اتنا ہی ہے کہ اعمش کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ کچھ اختلاف تھا۔ جیسا کہ بعض علماء کا بعض کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جگہ جو حق ہوتا ہے، بیان کرتے ہیں اور کبھی کبھی وہ حق کے مخالف سے نفرت بھی کرتے ہیں اور دوسرا عالم بھی ایک حد تک معذور ہوتا ہے۔ بعض وقت مخالفت کے بڑھنے سے کچھ دوسرے امور بھی ممد و معاون ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان چیزوں کو خطا سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول:

''اعمش کے متعلق امام ابوحنیفہ کی یہ رائے تھی کہ وہ نہ روزہ رکھتا ہے، نہ جنابت کے بعد غسل کیا کرتا ہے (یعنی ایک فاسق نجس آدمی ہے۔)

(جامع : ۱۹۹، دو اسلام : ۹۹)

جواب:

امام اعمش کا یہ مذہب تھا کہ فجر کے ظاہر ہونے کے بعد بھی کھانا کھانا جائز

---

❶ جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰۶ (۲۱۶٤) نیز دیکھیں: السنة لعبد الله بن أحمد: ۱/۱۹۰ (۲۵۷)

ہے۔ (1) اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ امام اعمش کے نزدیک جب تک انزال نہ ہو، جماع کرنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ (2) امام ابوحنیفہ کے نزدیک مجرد جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف اجتہادی تھا۔ امام ابوحنیفہ کی طعن اپنے مسلک کی بناء پر تھی، حالانکہ اجتہادی امور میں ایک دوسرے پر طعن روا نہیں، مگر امام ابوحنیفہ نے غصہ میں آ کر یہ بات کہی ہو گی۔

سعید بن میبّب، حسن بصری اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول:

"سعید بن میبّب مدنی (وفات ۱۰۵ھ) اور حسن بصری، عکرمہ (وفات ۱۰۷ھ) کو "جھوٹا" کہا کرتے تھے اور یہ ان کو "کذاب" سمجھتا تھا۔"

(جامع : ۱۹۷، ۱۹۸، دواسلام : ۹۹)

جواب:

یہ بھی جھوٹ پر مشتمل ہے۔ سعید بن میبّب نے عکرمہ کے بارے میں صرف یہ

---

(1) امام اعمش کا یہ عمل حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مطابق تھا کہ میں نے رسول اللہ کے ساتھ سحری کھائی، وہ دن تھا، لیکن سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ (نسائي (۲۱۵۲)، ابن ماجه(۱۶۹۵)، مسند أحمد : ۵/۴۰۰) اس حدیث سے مراد آخری وقت میں سحری کرنا ہے۔ (حاشيه السندي على النسائي: ۱۴۲/۴، شرح سنن ابن ماجه: ۱۲۲، طبعة قديمي كتب خانه كراتشى) والله أعلم

(2) امام سلیمان بن مہران اعمش کا یہ فتویٰ اس حدیث کے مطابق تھا کہ "إنما الماء من الماء" صحيح مسلم(۳۴۳) لیکن یہ حدیث منسوخ ہے۔ یا احتلام کے متعلق ہے۔ والله أعلم۔ حضرت ابی بن کعب نے اس حدیث کے منسوخ ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی ناسخ دوسری مرفوع حدیث ہے: ((إذا جلس بين شعبها الأربع ثم جهدها فقد وجب عليه الغسل)) و في حديث مطر: و إن لم ينزل " (صحيح مسلم: ۳۴۸) لہٰذا اس مقام پر امام اعمش کے فتاویٰ اجتہادی غلطی پر محمول ہیں، جس پر ان کو ایک گنہ اجر حاصل ہوگا۔ إن شاء الله۔ اور معترض کا اپنی طرف سے "فاسق و نجس" کے الفاظ لکھنا، بدنیتی اور کم ظرفی کی دلیل ہیں۔

کہا کہ وہ ابن عباس پر غلط بیانی کرتا ہے۔ ❶ مگر حسن بصری سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے عکرمہ کو جھوٹا کہا ہو۔ ❷

قتادہ رحمہ اللہ کا قول:

قتادہ (وفات ۱۱۸ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (وفات ۱۲۹ھ) کو جھوٹا سمجھتا تھا، اور یہ اسے۔ ❸ (جامع: ۱۹۹، دو اسلام: ۱۰۰)

جواب:

مصنف کی یہ بات غلط ہے۔ "جامع" میں یہ بات نہیں ہے، نہ قتادہ نے اسے جھوٹا کہا، نہ یحییٰ بن ابی کثیر نے اسے۔

سلیمان تیمی رحمہ اللہ کا قول:

"اصمعی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان (وفات ۱۴۳ھ) کے ہاں "ابن عروبۃ" کا ذکر ہوا، تو اصمعی نے کہا: "ابن عروبہ اور اس کا استاد دونوں جھوٹے ہیں۔" (جامع: ۲۰۰، دو اسلام: ۱۰۰)

جواب:

یہ بات ہی جھوٹ ہے۔ اول تو اصمعی کا "ابن عروبہ" کے متعلق کوئی قول

---

❶ جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰۵ (۲۱٦۱)

❷ اس طرح معترض کے مذکور مصدر میں یہ بات کہیں نہیں کہ عکرمہ رحمہ اللہ سعید بن میتب اور حسن بصری کو "کذاب" سمجھتے تھے!

❸ جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰۸ (۲۱٦۸) معترض نے عبارت ذکر کرنے میں دیانت کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اپنے ذہن سے خود ساختہ مطلب بیان کر دیا ہے، مذکورہ بالا مصدر میں "جھوٹا" کے الفاظ کہیں موجود نہیں ہیں، دونوں آئمہ نے ایک دوسری کے متعلق کلام کیا ہے، لیکن اس کی سند میں "جبیر بن دینار" کے متعلق کوئی توثیق و تجریح نہیں ہے۔ (الجرح والتعدیل: ۲/۵۱٤)

نہیں۔ سلیمان تیمی کا قول ہے۔ اس میں بھی جھوٹ کا لفظ نہیں، بلکہ یہ ذکر ہے کہ چونکہ وہ قدر کے بارہ میں کچھ باتیں کرتے تھے، اس لئے میں شہادت قبول نہیں کرتا۔ ❶

یحییٰ بن معین کا قول

''یحییٰ بن معین پہلا محدث ہے، جس نے راویوں کے حالات قلمبند کئے تھے۔ آپ امام شافعی کے متعلق فرماتے ہیں:

''هو ليس بثقة'' ❷ (جامع: ۲۰۰، دو اسلام: ۱۰۰)

''آپ کی روایات قابل اعتماد نہیں۔''

جواب:

یحییٰ بن معین کی یہ بات غلط ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض آئمہ جرح نے مبہم جرحیں بھی کی ہیں، ان کے اسباب بیان نہیں کئے۔ اس واسطے ان کی ایسی جرحیں ان راویوں میں معتبر نہیں، جن کی توثیق ہوئی ہو۔ جب امام احمد نے ابن

❶ اصل قول اس طرح ہے کہ ''سلیمان تیمی'' کے پاس سعید بن ابی عروبہ کا ذکر ہوا، تو سلیمان تیمی کہنے لگے: بخدا نہ تو میں سعید کی گواہی کو جائز قرار دیتا ہوں، اور نہ ہی اس کے استاد قتادہ کی گواہی کو درست سمجھتا ہوں، امام اصمعی نے کہا ہے کہ یہ کلام مسئلہ قدر کی وجہ سے ہے'' جھوٹ کا کوئی ذکر نہیں ۔(جامع بیان العلم: ۱۱۱۰/۲ (۲۱۷۳) لیکن اس تفصیل سے قطع نظر اس اثر کی سند ''ضعیف جدا'' ہے۔ اس کی سند میں ''عبد الله بن أحمد بن زبر أبو محمد القاضي'' ضعیف ہے۔ (تاريخ بغداد: ۳۸۶/۹، تاريخ دمشق: ۲۳/۲۷، لسان الميزان: ۲۵۳/۳) اور اسی طرح ''أحمد بن الخليل'' کذاب ہے۔(الجرح والتعديل: ۵۰/۲، لسان الميزان: ۱۶۷/۱، السير: ۵۳۲/۱۱، تقريب التهذيب: ۷۹)
اور اس کی سند میں ''زهير بن إسحاق السلولي'' بھی ضعیف ہے۔(الضعفاء للعقيلي: ۹۱/۲، تعجيل المنفعة: ۱۳۹/۱)

❷ جامع بيان العلم: ۱۱۱٤/۲

معین کو منع کیا، تو رک گئے اور بعض نے کہا ہے کہ ابن معین سے یہ قول ثابت نہیں۔ ❶ (جامع ص۲۰۱)

امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق چند اقوال:

''حضرت امام مالک پر ابراہیم بن سعد اور ابراہیم بن ابی یحییٰ نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔ساجی ''کتاب العلل'' میں لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن سلمہ، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ابن اسحاق، ابن ابی الزناد امام مالک کی حدیث کو اس لئے قابل اعتماد نہیں سمجھتے کہ آپ نے ثور بن زید اور سعد بن ابراہیم جیسے راویوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔''

(جامع، صفحہ: ۲۰۱، دو اسلام، صفحہ: ۱۰۰)

جواب:

''جامع'' میں یہ ہے: بعض نے یہ کلام کی ہے کہ مالک نے سعد بن ابراہیم کی روایت ذکر نہیں کی۔ داؤد اور ثور بن زید سے روایت لی ہے۔اس کتاب میں جھوٹے راویوں کا لفظ کوئی نہیں۔ اور یہ لفظ ''قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے''۔بھی ''جامع'' میں نہیں۔ مصنف نے جھوٹ بولا ہے۔صرف یہ لکھا ہے، بعض امور میں امام مالک پر مواخذہ کیا ہے۔ ❷

حماد بن ابی سلیمان کا قول:

''امام ابوحنیفہ کے استاد حماد سے کسی نے پوچھا کہ حجاز کے محدثین عطاء وطاؤس اور مجاہد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ تو کہا:

---

❶ جامع بیان العلم: ۲/۱۱۱۵ (۲۱۸۳)

❷ جامع بیان العلم: ۲/۱۱۱۵ (۲۱۸٤)

”وصبيانكم أعلم منهم“ (جامع: ۱۹٦)
کہ ”تمہارے نادان بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔“ ❶

جواب:

اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ کوفہ میں فقہ کا رواج تھا، جزئیاتِ مسائل سے وہ لوگ خوب واقف تھے۔ اس لئے حماد کوفہ والوں کو خوشخبری دے رہے ہیں۔ تمہارے بچے وہ مسائل جانتے ہیں، جن کو مکہ کے بڑے بڑے عالم بھی نہیں جانتے۔ بعض جزئیات کی واقفیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی علوم میں بھی کافی دسترس ہے۔ پھر یہ بات بہرحال جذباتی ہے۔

امام شعبی اور نخعی کا قول:

”امام شعبی کوفی کے ہاں امام ابراہیم نخعی کوفی (وفات ۹۵ھ) کا ذکر آیا، تو کہنے لگے: یہ یک چشم رات کے وقت ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ جاتا ہے اور دن کے وقت لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب جماتا ہے۔ نخعی کو یہ بات پہنچی، تو اس نے کہا:

”هو كذاب“ ❷

کہ ”وہ جھوٹا ہے۔“ (جامع: ۱۹٦، دواسلام: ۱۹۷)

---

❶ جامع بیان العلم: ۲/۱۰۹۵۔ مغیرہ اس قول کو حماد سے روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”یہ حماد کی سرکشی ہے!“ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”مغیرہ نے درست کہا ہے!“ حالانکہ امام ابو حنیفہ جو حماد کے خصوصی شاگرد ہیں، وہ عطاء بن ابی رباح کو حماد پر ترجیح و فوقیت دیتے تھے۔

❷ جامع بیان العلم: ۲/۱۱۰۰۔ اس کی سند میں ”قاسم بن محمد بن أبي شيبة“ ضعیف ہے۔ (الجرح والتعديل: ۷/۱۲۰، ضعفاء العقيلي: ۳/۴۸۱، لسان الميزان: ٤/٤٦٥، الكشف الحثيث (۲۱۱)

جواب:

یہ باتیں غصہ کی حالت کی ہیں، جرح و تعدیل میں ان کا اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی معصوم نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو باتیں کتب جرح و تعدیل میں ہیں، ان کا بھی اعتبار نہ ہو۔ کیونکہ غصہ کی حالت کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور جرح مبہم و مفسر میں فرق ہوتا ہے۔

جرح و تعدیل بھی ایک فن ہے، اس کے بھی ضوابط اور قواعد ہیں۔ عدم واقفیت کی بناء پر اس قسم کی باتوں سے انسان متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ سب جہالت کے کرشمے ہیں۔

جابر بن یزید کا قول:

"جابر بن یزید کا قول ہے کہ میرے پاس ستر ہزار احادیث ایسی ہیں، جن کا راوی صرف ابوجعفر ہے۔" [1] (دو اسلام: ۱۰۱)

جواب:

یہ قول تو امام مسلم نے بصورت جرح ذکر کیا ہے کہ یہ شخص قابل اعتماد نہیں۔ ایسی باتوں سے محدثین کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح کذابین کو الگ کیا ہے۔

ابوجعفر ہاشمی کا قول:

"ابوجعفر ہاشمی کی یہ رائے تھی کہ عمرو بن عبید جھوٹا ہے" [2] (دو اسلام: ۱۰۱)

---

[1] صحیح مسلم: المقدمة: ۱/ ۱۲۔ جابر بن یزید الجعفي مشہور کذاب وضعیف راوی ہے۔

[2] صحیح مسلم۔ المقدمة: ۱/ ۱۲۔ اصل الفاظ یہ ہیں کہ رقبہ کہتے ہیں: "أبو جعفر هاشمي مدائني" احادیث وضع کرتا ہے، اس کے بعد امام مسلم نے یونس بن عبید سے نقل کیا ہے کہ ←

جواب:

معلوم نہیں، اس قول سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ اگر یہ مقصد ہے کہ بعض راویوں کو محدثین نے کذاب یا جھوٹا کہا ہے، تو یہ بات کوئی نئی نہیں۔ یہی تو ان کی خدمت حدیث تھی کہ جو لوگ کذاب تھے، ان کا کذب بیان کر دیا۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعض باتیں ان سے غصہ کی حالت میں بھی صادر ہوئیں۔ سو ایسی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو اس فن سے واقف ہو، اس کیلئے تمیز کوئی مشکل نہیں۔

شعبہ بن حجاج کا قول:

''عبیداللہ بن معاذ عنبری کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) کو لکھا کہ واسط کے قاضی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ جواب میں کہا:

''لا تکتب عنه''

''اس کی کوئی حدیث نہ لکھو۔'' [1] (دو اسلام : ۱۰۱)

جواب:

یہ جو کچھ بھی انہوں نے لکھا، حق تحقیق ادا کیا۔ اپنے علم کا مقام پہچانا، اس کے

← عمرو بن عبید حدیث میں جھوٹ بولتا ہے۔'' عمرو بن عبید ''متروك الحديث'' ہے اور کئی محدثین نے کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔(تهذيب الكمال : ۱۲۷/۲۲)

[1] صحيح مسلم ۔ المقدمة: ۱۲/۱۔ مذکورہ مصدر میں یہ ہے کہ ''عبيد الله بن معاذ العنبري'' کے والد '' معاذ العنبري'' نے شعبہ کو خط لکھا۔ اور اس قاضی سے مراد أبو شيبه إبراهيم بن عثمان العبسي ہیں، جن کو کئی دیگر محدثین نے بھی ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، لہٰذا ضعیف پر جرح کرنا اور لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنا چنداں عیب نہیں ہے۔

قاضی ہونے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ یہ تو ان کی صاف گوئی تھی، جو قابل ستائش ہے۔ آپ مذمت میں ذکر کر رہے ہیں!

صالح المری کا قول:

''عفان کہتے ہیں کہ میں نے صالح المري کے سامنے حماد بن سلمہ بصری (وفات ۱٦٧ھ) کی بیان کردہ احادیث پیش کیں، تو اس نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے۔[1] (دو اسلام: ۱۰۲)

جواب:

اس میں بھی کوئی قباحت نہیں، انہوں نے جو جرح کی ہے، اپنے علم کا اظہار کیا اور حقِ علم ادا کیا۔

یزید بن ہارون کا قول:

''یزید بن ہارون کہتا ہے کہ زیاد بن میمون نے ایک ہی حدیث مجھے تین موقعوں پر سنائی اور ہر مرتبہ نئے راوی جڑ دیئے۔ چنانچہ میں نے قسم کھائی کہ آئندہ اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا۔''[2] (دو اسلام:۱۰۲)

---

[1] صحیح مسلم ، المقدمة: ۱۲/۱۔ اصل مصدر میں یہ ہے کہ عفان کہتے ہیں: ''میں نے حماد بن سلمہ کو صالح المری سے حدیث سنائی، تو انھوں نے کہا صالح نے جھوٹ بولا ہے'' اور صالح المری کو دیگر محدثین نے بھی ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، لہٰذا حماد بن سلمہ کا قول درست ہے، جو کہ محدثین کی حق گوئی اور عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

[2] صحیح مسلم ۔ المقدمة: ۱۲/۱۔ یہاں بھی جھوٹے کو جھوٹا کہنے والی بات ہے، کیونکہ زیاد بن میمون کو دیگر محدثین نے بھی واهي الحديث اور متروك قرار دیا ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان:۲/٤٩٧)

جواب:

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محدثین حدیث کے بارہ میں سخت احتیاط سے کام لیتے تھے، جو غلط بیانی کرے، اس سے حدیث نہیں لیتے تھے۔ اسی وجہ سے حدیث کی حفاظت ہوئی۔

حمزۃ الزیات کا قول:

''علی بن مسہر کوفی کہتا ہے کہ میں نے اور حمزہ نے أبان بن أبي عياش سے قریباً ایک ہزار احادیث سنی تھیں۔ حمزہ بیان کرتا ہے، ایک رات خواب میں حضور ﷺ کے دیدار نصیب ہوئے۔ میں نے وہ تمام احادیث آنحضرت ﷺ کو سنائیں۔ حضور ﷺ نے صرف پانچ چھ احادیث کو صحیح قرار دیا اور باقی کے متعلق فرمایا: میں انہیں نہیں پہچانتا۔''[1] (دو اسلام: ۱۰۲)

جواب:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹے راویوں کا جھوٹ جسے محدثین واقعات سے ثابت کرتے تھے۔ اسی طرح کچھ غیبی اشارات سے بھی ان کی تائید ہوتی تھی۔ اور ان غیبی اشارات کے بعد اپنی جستجو کو تیز کر دیتے تھے۔

ابو اسحاق الفزاری کا قول:

''ابو اسحاق فرازی فرماتے ہیں کہ صرف مشہور اور معتبر راویوں کی احادیث بیان کرو، لیکن اسماعیل بن عیاش کہتے ہیں کہ مشہور راویوں سے بھی کوئی

---

[1] صحيح مسلم۔ المقدمة: ۱/۱۲۔ یہاں بھی علی بن مسهر اور حمزه الزيات نے ضعیف آدمی کے متعلق ایسی بات کہی ہے، جس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے۔ أبان بن أبي عياش کو دیگر محدثین نے بھی متروک اور ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھیں: تهذيب الكمال (۲/۱۹)

حدیث روایت کرے تو مت مانو۔ لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اسماعیل ثقہ ہے۔''[1] (دو اسلام : ۱۰۲)

جواب:

آپ فن جرح و تعدیل جب کسی استاد سے پڑھیں گے، تو آپ کی حیرت گم ہو جائے گی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ باتیں کس بناء پر کہی گئیں۔ ایک ہی راوی کے متعلق جب اہل فن کا اختلاف ہو، تو وہاں کیا کرنا چاہیے۔ ہر ایک امام اپنے علم کی بناء پر کہتا ہے۔ پھر ایک امام ایک شے کو باعث جرح خیال کرتا ہے اور دوسرا نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں ترجیح کس کو ہو گی۔ کبھی ایک ہی امام ایک شخص کے متعلق دو باتیں کہہ جاتا ہے، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں فن کی

---

[1] صحیح مسلم۔ المقدمۃ: ۱/۱۲۔ اصل الفاظ یہ ہیں کہ امام ابو اسحاق الفزاري فرماتے ہیں: ''بقیہ سے وہ احادیث لکھو، جو معروف راویوں سے بیان کرتا ہے اور جو روایات غیر معروف لوگوں سے بیان کرے، وہ نہ لکھو اور اِسماعیل بن عیاش چاہے معروف لوگوں سے روایت کرے یا غیر معروف لوگوں سے بیان کرے، اس سے کچھ بھی نہ لکھو۔''

اسماعیل بن عیاش شامی کے متعلق راجح موقف یہ ہے کہ جب وہ اہل شام سے روایت کریں، تو ان کی روایت صحیح ہے اور جب وہ اہل شام کے علاوہ دیگر رواۃ سے بیان کریں، تو ان کی روایت ضعیف ہوتی ہے، اور امام یحییٰ بن معین نے اِسماعیل کو مطلقاً ثقہ نہیں قرار دیا۔ بلکہ ان سے مذکورہ بالا تفصیل ہی منقول ہے۔ دیکھیں: تهذيب الكمال ۳/۱۷۶۔

اور جہاں تک ابو اِسحاق الفزاري سے منقول قول کی بات ہے، تو اس کا سبب حفظ و ضبط اور صدق و عدالت میں جرح نہیں، بلکہ اس کی وجہ اور ہے، جیسا کہ ابو صالح بیان کرتے ہیں: كان الفزاري قد روى عن إسماعيل بن عياش ثم تركه، و ذلك أن رجلا جاء إلى أبي إسحاق، فقال يا أبا إسحاق! ذكرت عند إسماعيل بن عياش، فقال إسماعيل : أيما رجل لو لا أنه شكي! (تهذيب الكمال:۳/۱۷۹) لہٰذا جب ابو اسحاق کے کلام کا سبب معلوم ہو گیا، تو معلوم ہوا مذکورہ بالا تفصیل ہی راجح ہے اور ابو اسحاق کا قول مرجوح ہے۔

واقفیت کے بعد ہوتی ہیں۔

اعتراض:

''محمد بن عبدالرحمٰن کے متعلق امام مالک کی یہ رائے تھی کہ وہ ثقہ نہیں، لیکن ابوزرعہ اسے ثقہ سمجھتے ہیں۔ یہی حال مندرجہ ذیل راویوں کا ہے۔

راوی کا نام	غیر ثقہ کہنے والا	ثقہ سمجھنے والا
شعبہ مدنی	امام مالک	احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابن عدی [1]
ابوالحویرث	امام مالک	ابن حبان [2]

[1] شعبہ بن دینار الهاشمی کو امام احمد نے ''ما أرى به بأسا'' ابن معین نے ''لیس به بأس و هو أحب إلی من صالح مولی التوأمة ، لا یکتب حدیثه'' عجلی نے ''جائز الحدیث'' قرار دیا ہے۔ ابن عدی نے ''لا بأس به'' جب کہ امام مالک نے ''لیس بثقة'' امام ابو حاتم ''لیس بقوي'' اور نسائی اور جوزجانی نے ''لیس بالقوي'' أبو زرعہ اور ساجی نے ''ضعیف'' ابن حبان فرماتے ہیں: ''روى عن ابن عباس ما لا أصل له حتى كأنه ابن عباس آخر!'' ابن سعد نے ''له أحاديث كثيرة و لا يحتج به'' اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ''يتكلم فيه مالك و يحتمل منه'' ان تمام اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے شعبہ بن دینار کا ''ضعیف'' ہونا ہی راجح ہے۔ کیونکہ جارحین کی تعداد زیادہ ہے اور جرح بھی مفسر ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''صدوق سيء الحفظ'' حوالہ جات کے لیے دیکھیں: ''الكامل في الضعفاء: ٤/٢٣، الجرح والتعديل: ٤/٣٦٧، الضعفاء للنسائي: ٥٦ (٢٩١)، أحوال الرجال: ١٣٣ (٢٢٣)، المجروحين لابن حبان: ١/٣٦١ (٤٧٥) ضعفاء العقيلي: ٢/١٨٥، الطبقات الكبرى: ٥/٢٩٤، تهذيب الكمال: ١٢/ ٤٩٧، تهذيب التهذيب: ٤/٣٠٣، تقريب التهذيب: ٢٦٦۔

[2] عبد الرحمن بن معاوية أبو الحويرث الأنصاري المدني کو ابن معین نے ''ثقه'' اور ابن حبان نے ''الثقات'' میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ اس کو امام مالک نے ''ليس بثقة'' ابن معین نے ''ليس يحتج بحديثه'' نسائی نے ''ليس بثقة'' ابو حاتم نے ''ليس بقوي يكتب حديثه و لا يحتج به'' کہا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں: ''ابو الحويرث هذا ليس له كثير حديث ، مالك أعلم به لأنه ←

فرقد	ایوب۔ ابن حبان	یحییٰ بن معین [1]
شرحبیل بن سعید	ابن عدی، محمد بن سعد	سفیان بن عیینہ، ابن حبان اور یحییٰ بن معین [2]

جواب:

اس اختلاف کا جواب ہو چکا ہے کہ اس اختلاف میں فیصلہ کرنے کیلئے فن جرح وتعدیل کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں اس قسم کی نہیں کہ جہاں آدمی حیران ہو جائے۔ علماء محققین نے ایسے مقام پر یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ جرح اگر غصہ کی حالت کی نہ ہو اور جرح مفسر ہو، جرح میں ایسا سبب بیان کیا جائے، جو بالاتفاق جرح کا سبب ہے، تو جرح کو مقدم کیا جائے گا، کیونکہ ثقہ کہنے والے کے قول کی بنیاد عدم علم پر سمجھی جائے گی اور عالم کا قول غیر عالم پر مقدم ہوتا ہے۔ اگر جرح مفسر نہ ہو، یا ایسا سبب بیان کرے، جو بالاتفاق جرح کا سبب نہ ہو، یا غصہ کی حالت میں کہے، تو اس صورت میں ثقہ کہنے والے کا قول معتبر ہوگا، انسان کا علم محیط نہیں، کمی بیشی ضرور ہوتی ہے۔

اس باب میں مصنف نے جو کچھ بھی ذکر کیا ہے، اس کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں:

← مدني و لم يرو عنه شيئاً" حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "ضعف" اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "صدوق سيئ الحفظ، رمي بالإرجاء" یہاں بھی کثرت جارحین اور جرح مفسر ہونے کی بناء پر ضعف ہی راجح ہے۔

[1] فرقد بن یعقوب السبخي کو امام ایوب ،أحمد، ابن القطان، علی بن المدینی ، بخاری، یعقوب بن شیبه ، نسائی، ابو حاتم ، ابن سعد، حاکم ابو أحمد، ابو زرعه اور دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے، اسی طرح ابن معین نے بھی ایک روایت میں اسے "ليس بذاك" کہا ہے۔ لہٰذا اس کا ضعف ہی راجح ہے۔ دیکھیں: "تهذيب الكمال: ٢٣/١٦٤، تهذيب التهذيب: ٨/٢٣٦

[2] برق صاحب نے یہ اسماء "فتح الملهم شرح مسلم": ١/١٤١، سے نقل کیے ہیں۔

بعض باتیں تو وہ ہیں، جو ہم عصر علماء کی ایک دوسرے پر کسی جذباتی امر کی بناء پر چوٹ ہے، سو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور بعض باتیں وہ ہیں جو صحیح ہیں۔ واقعی وہ آدمی جن کو علماء نے مجروح قرار دیا ہے، مجروح ہیں۔ باقی اختلافی باتوں کے متعلق میں نے کچھ لکھ دیا ہے اور باقی کے لئے فن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ [1]

[1] اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

پانچواں باب

حدیث پر ایک مکالمہ

اس باب میں مصنف نے ایک مکالمہ ذکر کیا ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مکالمہ کو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ذکر کروں، جس میں مصنف کی سب باتیں قریب قریب آ جائیں۔

مصنف ''دواسلام'' نے اس مکالمہ کی بنیاد اس امر پر رکھی ہے کہ ''یہ ہمارے علماء کا خیال ہے کہ حدیث وحی خفی ہے'' مگر اس مقالہ کے متعلق جو صحیح بات ہے، لکھ چکا ہوں۔ یہاں بھی بطور تمہید ذکر کر دیتا ہوں تا کہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

وحی کی اقسام:

حدیث قولی کا کچھ حصہ تو اسی طرح وحی ہے، جس طرح قرآن مجید یعنی بذریعہ جبرئیل آنحضرت ﷺ کی طرف پہنچا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن متلو ہے اور یہ حصہ متلو نہیں۔ ان احادیث میں سے بعض میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے۔ ان کو ''احادیث قدسیہ'' کہتے ہیں۔

اور بعض احادیث وہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ پس پردہ باتیں کہیں۔ ان میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کا لفظ ہو، تو احادیث قدسیہ ہی کہتے ہیں، اور بعض وہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا فرمائیں۔

بعض وقت آنحضرت ﷺ کو بذریعہ خواب آگاہ کیا گیا اور بعض دفعہ بذریعہ کشف کچھ حالات بتائے گئے۔ ان تمام کو وحی ہی کہتے ہیں۔

بعض احادیث وہ ہیں، جو جبرائیل نے عمل کر کے دکھائیں، جیسے پانچ نمازیں۔

یہ بھی حقیقت میں وحی ہی ہیں۔

اور بعض حدیثیں ایسی ہیں، جو آنحضرت ﷺ نے قرآن سے استنباط کر کے کہی ہیں۔ اور آپ کی عملی روایات جن کا تعلق دین سے ہے، وہ سب کی سب قرآن سے ماخوذ ہیں۔ یا دوسری صورت میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے واقف ٹھہرایا ہے۔

کن امور میں آنحضرت ﷺ کی اقتداء ضروری نہیں:

اور جو تقریری حدیثیں ہیں، ان کا تعلق اگر دین سے ہو، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو ناجائز نہیں سمجھا۔

اور بعض روایات ایسی ہیں، جن کا تعلق آپ ﷺ کی قبل از بعثت کی زندگی سے ہے۔ یا اس میں آپ ﷺ کی شکل وصورت، ولادت اور تربیت کا ذکر ہے۔ ان کو وحی یا دین نہیں کہہ سکتے، یعنی ہمارے لئے وہ چیزیں دین کی نہیں ہیں۔ یعنی ہم ان امور میں آپ کی اقتداء کرنے کے مامور نہیں۔

باقی رہیں وہ باتیں، جن کا تعلق امور دنیا سے ہے، مثلاً روٹی کھانا، پانی پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، مرد وعورت کے تعلقات اور دوسرے دنیوی امور، یہ سب ایسے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی عادت اور طبیعت کے موافق کرتے تھے۔ مگر ان امور میں آپ ﷺ احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔

اس واسطے ان افعال سے جواز تو ثابت ہوتا ہے، اگرچہ ان کا وحی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس بناء پر آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد کے تمام افعال کو ہم بطور حجیت تسلیم کرتے ہیں۔ یہ معنی ہے وحی خفی کا۔ یعنی آپ ﷺ کی تمام تر زندگی اس معنی سے معصوم تھی کہ آپ ﷺ نے جو کیا، حکم الٰہی کے مطابق کیا، خدا کی نافرمانی نہیں کی۔ اگر کسی وقت آپ ﷺ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوتی، جو منشائے الٰہی کے

مطابق نہ ہوتی، تو اللہ تعالیٰ فوری طور پر آپ ﷺ کو اس سے مطلع فرما دیتے۔

مکالمہ

قائل حدیث

حدیث، قرآن کا بیان اور اس کی عملی صورت ہے، آنحضرت ﷺ نے جو فرمایا، یا تو قرآن سے سمجھایا، یا قرآن کی تفسیر میں ارشاد فرمایا، لہٰذا قرآن کی طرح حدیث بھی حجت ہے۔

منکر حدیث

قرآن کی طرح حدیث کیسے ہوسکتی ہے؟ حدیث اگر آنحضرت ﷺ کی سمجھ ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ قرآن کی طرح نہیں۔ یا تفسیر ہے، تو تفسیر بھی سمجھ ہے لہٰذا حدیث کو قرآن کی طرح خیال نہیں کر سکتے۔

قائل حدیث

آپ نے میرا مطلب نہیں سمجھا! میں حدیث کو کل الوجوہ قرآن کی طرح نہیں سمجھتا، بلکہ حجت ہونے میں قرآن کی طرح سمجھتا ہوں۔ کچھ حصہ قطعاً بذریعہ وحی ہے اور جو بذریعہ وحی نہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی اصلاحی بات نہیں کی، اس لئے اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے متعلق ہوگئی ہے۔

منکر حدیث

اگر حدیث کا کچھ حصہ بذریعہ وحی ہے، تو باقی حصہ اگرچہ بذریعہ وحی نہیں۔ مگر وحی کی طرح ہے، تو کیا وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے قرآن کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کیلئے تمام تر انسانی وسائل اختیار کئے، لیکن حدیث کو نہ صرف نظر انداز کر دیا، بلکہ حضور ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا اور صدیق و فاروق

نے احادیث کو مٹانے اور جلانے کیلئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، حدیث اللہ کا پیغام ہو اور صحابہ اسے جلاتے پھریں، کیوں؟

قائل حدیث

آپ کو بعض غلط روایات کا دھوکہ ہوا ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو اپنا رویہ یہی رکھا کہ مسائل کا قرآن اور حدیث کی رو سے فیصلہ کرتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب جس میں زکوٰۃ کا مسئلہ مفصل لکھا ہوا تھا، اس کی ایک نقل حضرت انس رضی اللہ عنہ کو لکھوا دی۔ [1] اسی طرح باقی عمال کو اس کی نقلیں بھجوا دیں۔ جیسے قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں منتشر تھا، ایک جگہ کسی مصحف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھوایا، اسی طرح احادیث کو متفرق طور پر لکھوایا، مگر وہ سب اجزاء منتشر تھے۔ احادیث کو جلانے اور مٹانے کی روایات سب غلط ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے ثابت کیا ہے۔ [2]

منکر حدیث

اللہ تعالیٰ نے یہ دو قسم کے پیغامات کا سلسلہ کیوں شروع کیا تھا، کیا اللہ کے خزانہ میں الفاظ کی کمی تھی؟ یا کوئی خاص مصلحت اس دو رنگی کی متقاضی تھی؟

قائل حدیث

قرآن مجید بمنزلہ متن کے ہے اور حدیث بمنزلہ بیان کے ہے۔ اصل اور بیان میں جو فرق ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ان کیلئے الگ الگ طریقہ ہو۔ اگرچہ بعض

---

1. اس خط کی تفصیل گزر چکی ہے۔ دیکھیں
2. تفصیل کے لیے دیکھیں:

احادیث قرآن کی طرح من جانب اللہ ہیں، مگر پھر بھی بیان کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگرچہ حدیث کے مطلع کرنے کا طریقہ الگ الگ قرآن کی حفاظت کے ساتھ ملتا جلتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

منکر حدیث

بات تو صاف ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول کریم کو جو کتاب بذریعہ وحی عطا فرمائی تھی، اس کا نام قرآن ہے، نہ کہ صحیح بخاری۔

﴿أوحينا إليك هذا القرآن﴾ ❶

''ہم نے تیری طرف اس قرآن کو وحی کیا۔''

وحی کے لفظ میں وحی کے تینوں مفہوم لازماً آ جاتے ہیں، اللہ نے سارے قرآن میں کہیں نہیں کہا کہ وحی بواسطہ جبریل ہم قرآن اتار رہے ہیں اور وحی کے باقی طریقے حدیث کے نازل کرنے کیلیے استعمال کر رہے ہیں۔

قائل حدیث

ہم بھی یہ نہیں کہتے کہ قرآن کے ساتھ ایک کتاب قرآن کی طرح بمنزلہ متن کے ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں، اصل کتاب قرآن ہی ہے، حدیث اس کا بیان اور تفسیر ہے، خواہ وہ حدیث بخاری کی کتاب میں ہو یا مسلم کی کتاب میں یا کسی دیگر کتاب میں۔ اور پہلے بیان ہو چکا ہے، بواسطہ جبریل ہی قرآن نازل ہوا ہے۔

﴿نزل به الروح الأمين﴾ ❷

''اس کو روح الامین نے نازل کیا۔''

ایک جگہ فرمایا:

---

❶ یوسف:۳

❷ الشعراء: ۱۹۳

﴿نبأني العليم الخبير﴾ ❶

''مجھے علیم وخبیر نے بتایا ہے۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثیں من جانب اللہ ہیں اور جو اجتہادی ہیں، وہ بھی حکماً من جانب اللہ ہیں۔

حدیث قرآن کی طرح حجت ہے:

آیت ﴿فردوه إلى الله والرسول﴾ ❷ (اپنے جھگڑے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول سے کراؤ) سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث قرآن کی طرح حجت ہے۔

اسی طرح یہ آیت بھی ہمارے اس دعویٰ کی موید ہے:

﴿قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني﴾ ❸

''اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو، تو میری اتباع کرو۔''

اس کے بعد فرمایا:

﴿قل أطيعوا الله والرسول فإن تولوا فإن الله لا يحب الكافرين﴾ ❹

''اللہ اور رسول کا حکم مانو، اور اگر پھر جائیں (تو کافر ہیں) اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔''

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں، جن میں آنحضرت ﷺ کی اتباع اور اطاعت کا

---

❶ التحریم: ۳

❷ النساء: ۵۹

❸ آل عمران: ۳۱

❹ آل عمران: ۳۲

حکم ہے۔

یہ آیات صراحتاً دلالت کرتی ہیں کہ حدیث کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ایمان پر موقوف ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ ''وحی کے لفظ میں وحی کے تینوں مفہوم آ جاتے ہیں'' بالکل خلاف عرف و عقل ہے۔ وحی کے مفہوم میں اگرچہ تینوں مفہوم درج ہیں، مگر ضروری نہیں کہ استعمال میں تینوں مفہوم مراد ہوں، ورنہ لازم آئے گا کہ جہاں لفظ وحی ہو، وہاں تینوں مفہوم مراد ہوں اور یہ بداہتہً باطل ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہاں وحی سے صرف ایک ہی طریقہ مراد ہو، جیسا کہ قرآن نے خود صراحت کی ہے۔ قرآن نے جب تکلم کے تین طریقوں کو بصیغہ ''أو'' بیان کیا ہے،[1] جس کا مطلب تقسیم ہے، اب ہر وحی میں ان تینوں طرق کو درج کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

منکر حدیث

قرآن سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی بصورت وحی نازل ہوا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے:

﴿ إنما أوحي إلي هذا القرآن لأنذركم به ﴾[2]

''تمہیں ڈرانے کیلئے مجھ پر قرآن نازل ہوا ہے۔''

اور آپ کہتے ہیں، حدیث بھی ساتھ اتری ہے۔ ایک اور آیت دیکھئے:

---

[1] دیکھیں: الشوریٰ: ۵۱

[2] مذکورہ بالا آیت کریمہ کے درست الفاظ یہ ہیں: ﴿ و أوحي إلي هذا القرآن لأنذركم به ﴾ (الأنعام: ۱۹) بعد والے ایڈیشن میں برق صاحب نے اپنی کتاب میں اس آیت کی اصلاح کر دی تھی۔

﴿إنا أنزلناه قرآنا عربيا﴾ ❶

”ہم نے قرآن نازل کیا، جو عربی زبان میں ہے۔“

اور اسی طرح محفوظ ہے:

﴿لا يأتيه الباطل من بين يديه و لا من خلفه﴾ ❷

”اس میں باطل کسی راستے داخل ہو ہی نہیں سکتا۔“

اور دوسری طرف حدیث کا باطل نے ایسا پلستر بگاڑا کہ لاکھوں آفتاب ماہتاب لیکر ڈھونڈو، تو حقیقت کا سراغ نہ لگ سکے، إلا ماشاء اللہ!

قائل حدیث

آپ نے پہلی آیت میں لفظ "إنما" بڑھا دیا ہے اور قرآن میں یہ نہیں۔ اس سے آپ کا یہ دعویٰ باطل ہو گیا کہ قرآن میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں: اگرچہ میں نے غلطی سے اس لفظ کو بڑھایا ہے، یا عمدًا کہا ہے، تاکہ میرا حصر والا دعویٰ درست ہو جائے، مگر پھر بھی میری چوری ظاہر ہو گئی اور حقیقت کا سراغ مل گیا۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ بنظرِ غور دیکھیں گے، تو حدیث کے متعلق بھی یقین ہو جائے گا کہ حدیث کے بارہ میں بھی اگرچہ قرآن کی طرح لوگوں نے سہواً یا عمداً اضافے کیے ہیں، مگر ان کی چوری کا پتہ بھی لگ ہی گیا۔ کیونکہ قرآن متن ہے اور حدیث اس کا بیان۔ اگر صرف متن ہی کی حفاظت ہو اور بیان کی حفاظت نہ ہو۔ اصل مقصد چونکہ مفہوم ہوتا ہے، نہ لفظ، جب مفہوم کا مطلب کچھ سے کچھ ہو گیا، تو متن (قرآن) میں بھی باطل راہ پا گیا۔ پس قرآن کی حفاظت تامہ ایسی صورت میں متصور ہوتی ہے، جب اس کے بیان کی بھی حفاظت ہو۔ سو الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس کے بیان

---

❶ یوسف:۲

❷ فصلت:۴۲

(حدیث) دونوں کی حفاظت کر کے (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) قرآن کو باطل سے بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ آپ کے خیال میں صرف لفظوں (چھلکے) کی حفاظت ہوئی ہے، نہ مفہوم کی!

منکر حدیث

آپ نے آیت ﴿أطيعوا الله وأطيعوا الرسول﴾ [1] (اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت کرو) پڑھی، مگر پوری نہیں پڑھی۔ ﴿وأولي الأمر﴾ کو چھوڑ گئے ہیں۔ ساری آیت کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ، رسول اور حاکمِ وقت (جو تم میں سے ہو) کو مانو، اگر رسول کی اطاعت کا یہی مطلب ہے کہ آپ کے تمام اقوال پر ایمان لاؤ، تو پھر حاکمِ وقت کے اقوال پر بھی ایمان لانا پڑے گا، کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا بھی ویسے ہی حکم دیا ہے، کئی بادشاہ مصنف بھی تھے، مثلاً بابر نے ''تزک بابری'' لکھی، جہانگیر نے ''تزک جہانگیری'' اور اورنگزیب کی بھی ایک آدھ کتاب موجود ہے۔ یہ اپنے زمانے میں '' أولي الامر '' تھے، تو کیا ہم تزک بابری اور جہانگیری پر بھی ایمان لاتے پھریں؟

قائل حدیث

آپ نے بے سوچے سمجھے بات کہہ دی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت اور ''أولي الامر'' کی اطاعت میں زمین آسمان کا فرق ہے:

اطاعتِ رسول کا مطلق حکم:

① اللہ کے رسول کی اطاعت مطلق ہے اور اولی الامر کی اطاعت اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اسی واسطے

---

[1] النساء: ٥٩

نزاع کی صورت میں صرف اللہ اور اس کے رسول کا ذکر کیا ہے، فرمایا:

﴿ فردوه إلى الله والرسول ﴾ ❶

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب لے آؤ۔''

② امیر کی اطاعت اس کے زمانہ کے ساتھ مختص ہے۔ رسول کی اطاعت دائمی ہے۔ مطلق اور دوام کا۔ اگر آپ فرق کرتے، تو یہ نہ کہتے کہ ''تو کیا ہم تزک بابری اور تزک جہانگیری پر ایمان لاتے پھریں۔؟'' اگر ان کے احکام قرآن وسنت کے خلاف ہیں، تو ان کی اطاعت ان کے وقت بھی منع تھی، اگر خلاف نہیں، صرف وقتی باتیں تھیں، تو بعد میں ان پر ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب آپ خود کہتے ہیں کہ اقوال رسول پر ایمان لانا بھی ٹھیک ہے، بشرطیکہ کہیں سے کوئی قول رسول مل جائے، تو پھر اقوال رسول کے قابل ایمان ہونے نہ ہونے کی بحث فضول ہے۔ آپ کو صرف حدیث کے محفوظ ہونے پر بحث کرنی چاہئے۔

اور جو احادیث تواتر سے ثابت ہیں، جیسے اذان واقامت، پنج وقتی نمازیں، ان کی تعداد وغیرہ، ان پر ایمان لے آئیں۔

باقی آپ کا یہ کہنا: اگر اقوالِ رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہوتے'' بالکل بجا، اقوال رسول واقعی قرآن کی تشریح ہیں اور جو قرآن کو مانتا ہے، اس کیلئے لازم ہے کہ اس کی تشریح کو بھی مانے۔

منکر حدیث

رسول اس لئے ہے کہ قوانین کو نافذ کرے۔ رسول خدا جب تک بقید حیات

---

❶ النساء: ٥٩

رہے، صرف انہی قوانین کی تعمیل کراتے تھے، جن کی تفصیل قرآن نے دی ہوئی تھی۔ رسول قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دینے کی جرات بھی کر سکتے تھے، انہیں تو بار بار کہا جا رہا تھا:

﴿بلغ ما أنزل إليك من ربك﴾ ❶

"اے رسول! تم وہ احکام امت تک پہنچاؤ، جو ہم تمہیں دے رہے ہیں۔"

آپ ایک چھوٹا سا نقطہ پیش نظر رکھیں کہ رسول اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں، وہ پیغمبر بھی تھے، بشر بھی، بحیثیت پیغمبر ہم ان کی اطاعت پر مامور ہیں اور بحیثیت بشر اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی تھی کہ ہم چاہیں تو کھانے پینے، چلنے پھرنے اور گفتگو میں حضور کی روش اختیار کریں یا حدود شریعت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پسند، اپنے مذاق، اپنے ملک و ماحول اور اپنے رجحان سے کام لیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ بعض اوقات صحابہ نے آپ کی بشری ہدایات یا مشوروں پر عمل نہیں کیا تھا۔ مثلاً جب آپ کے غلام زید نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی، تو آپ نے فرمایا تھا: ﴿أمسكْ عليك زوجك﴾ ❷ (طلاق مت دو) لیکن زید نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے، لیکن حضور نہ مانے اور وحی نے عمر کی تائید کر دی۔ ❸ حضور نے گیارہ نکاح کیے تھے، لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں، ❹ حضور

---

❶ المائدة: ٦٧

❷ الأحزاب: ٣٧

❸ دیکھیں: صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، رقم الحديث(١٧٦٣)

❹ دیکھیں: الأحزاب: ٥١

نے ایک اندھے سے بے التفاتی فرمائی تھی، جس پر سورۃ عبس نازل ہوئی اور ملک العرش نے اپنے محبوب کو ہلکی سی ڈانٹ پلا دی۔ ❶

اسی طرح چند اور واقعات بھی موجود ہیں، جہاں صحابہ نے حضور کے بشری رجحانات سے آزاد ہو کر اپنی راہ خود نکالی تھی اور یہی اسلام کا سب سے بڑا وصف ہے کہ قرآن کے گنے ہوئے چند سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی یا وقتی روایات کے لئے قطعاً مامور نہیں۔"

قائل حدیث:

یہ بات ہم بھی مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے احکام نافذ کرتے تھے اور ساتھ یہ بھی ہے کہ خود بھی اس پر عمل کرتے اور احکام کی تشریح بھی کرتے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی حکم دیں، آپ ﷺ وہی احکام بیان فرماتے تھے، جن کے بیان کرنے کے مامور تھے۔ اب نزاع صرف اس امر میں ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن کی کیا تشریح کی اور ان پر کس طرح عمل کیا؟

آپ کا یہ خیال ہے کہ ہمارے پاس جناب کی تشریح اور عمل کی کوئی صورت موجود نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ موجود ہے۔ مطلق حدیث کا انکار کرنا، تو بدیہیات کا انکار کرنا ہے، کیونکہ بہت سی احادیث متواتر ہیں، جن کا تعلق قرآن کی تشریح اور عملی صورت کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد آپ نے جو ایک نکتہ بیان کیا ہے اور اس نکتہ کے بیان میں حدیث سے مدد لی ہے (حالانکہ وہ حدیثیں ثبوت کے لحاظ سے ان احادیث سے زیادہ وزنی نہیں، جو نماز کے احکام بتلاتی ہیں اور جن کا آپ انکار کرتے ہیں) اور دعوے کی

---

❶ دیکھیں: سنن الترمذي: أبواب تفسير القرآن، باب من سورة عبس، رقم الحديث (٣٣٣١)
اس حدیث کو امام ابن حبان، حاکم اور ذہبی رحمہم اللہ نے "صحیح" قرار دیا ہے۔

دلیل میں ایک ایسی صورت اختیار کی ہے، جس سے دعویٰ ہی باطل ہو جاتا ہے، مگر وہ نکتہ ایسا ہے کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں، خاص کر حدیث کے ماننے والوں کو اس میں کس طرح اختلاف ہوسکتا ہے، جب کہ وہ نکتہ حدیثوں سے ہی ثابت ہے۔

مگر نکتہ کی تشریح میں ہمارا آپ کا اختلاف ہے۔ ہم ہر اس قول و فعل و تقریر کو بحیثیت پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، جس کا دین سے تعلق ہو۔ اور جس کا تعلق دنیا سے ہو، ان امور میں آپ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر کو بحیثیت بشر دیکھتے ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے کھجوروں کی تلقیح کے متعلق مشورہ دیا تھا، وہ دنیوی بات تھی۔ اس واسطے آپ ﷺ نے فرمایا:

"أنتم أعلم بأمور دنیاکم"[1]

اور جو نماز، روزے، حج، زکوٰۃ، عالم برزخ، عالم آخرت اور دیگر امور بیان فرمائے ہیں، وہ دینی امور ہیں۔ اس مسئلہ کی تشریح ذرا طویل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بریرۃ رضی اللہ عنہا کو مشورہ دیا تھا کہ خاوند کے پاس رہے۔[2] وہ دنیوی بات تھی۔ چونکہ یہ ایک مشتبہ بات تھی۔ اس واسطے بریرہ نے پوچھ لیا کہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ جہاں بات مشورہ کی ہو ظاہر ہے، وہ دنیاوی امر ہو گا۔ اس واسطے مشیر کو آنحضرت ﷺ کے خلاف مشورہ دینے کی اجازت ہے، مگر مشورہ کے بعد جب آپ ﷺ حکم دے دیں، پھر اختیار جاتا رہتا ہے، خواہ وہ حکم بحیثیت رسول ہو یا

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذكره صلى الله عليه وسلم من معايش الدنيا على سبيل الرأي، رقم الحديث (٢٣٦٣) ولفظه "أنتم أعلم بأمر دنياكم"

[2] صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب شفاعة النبي صلى الله عليه وسلم على زوج بريرة، رقم الحديث (٤٩٧٩)

بحیثیت امیر، فرق صرف یہ ہو گا کہ جو حکم بحیثیت امیر ہو گا، وہ دائمی نہیں ہو گا، اور جو بحیثیت رسول ہو گا وہ دائمی ہو گا!

دوسرا یہ فرق یہ بھی کرتے ہیں کہ جس کام میں رائے کو دخل ہو، وہ بحیثیت مجتہد یا مدبر آپ ﷺ کرتے تھے اور جس کام میں رائے کو دخل نہ ہو، وہ بحیثیت رسول کرتے تھے۔ پہلا کام دنیوی اور دوسرا کام دینی ہے۔ آپ نے مثال میں جو کھانے پینے کا ذکر کیا ہے، ان کو قائل حدیث بھی دنیوی امور خیال کرتے ہیں۔ مگر ان امور کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ امور دین میں داخل ہو جاتے ہیں اور ایک لحاظ سے دنیوی بن جاتے ہیں۔ اگر کسی دنیوی امر کے متعلق ثواب و عقاب کا ذکر ہو تو اس حیثیت سے وہ امر دینی بن جاتا ہے۔ مثلاً لباس کا پہننا، اگرچہ دنیوی امر ہے، مگر ننگا رہنا، چونکہ بے حیائی اور گناہ ہے، اس لئے یہ مسئلہ دینی بن جائے گا، کیونکہ ننگا رہنے پر عقاب کے وارد ہونے کا اندیشہ ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے جو اپنے آزاد کردہ زید کو یہ حکم دیا تھا کہ اپنی بیوی کو رکھ، کیا یہ حکم دینی ہے یا دنیوی؟ تو دراصل یہ ایک دینی حکم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فأمسكوهن بمعروف أو سرحوهن بمعروف﴾ ❶

''ان کو دستور کے مطابق روکو یا دستور کے ساتھ چھوڑ دو۔''

یہ حکم اگرچہ بظاہر مطلق ہے، مگر بیان کردہ آیت کی بناء پر مقید ہے۔ اگر تم دستور کے مطابق رکھ سکتے ہو، تو اس صورت میں یہی حکم ہے کہ اپنی بیوی کو رکھو، یہ دنیوی حکم نہیں، بلکہ دینی حکم مقید ہے اور جب قید نہ رہی، تو حکم بھی نہ رہا۔ یعنی زید رضی اللہ عنہ جب اس ناچاقی کی بناء پر جو دونوں کے مابین ہو گئی تھی، دستور کے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا، تو

---

❶ البقرة: ٢٣١

حکم کا پابند نہ رہا۔ بلکہ اگر آپ کسی کو نماز پڑھنے کا حکم بھی دیں، تب بھی قرآنی شروط کے ساتھ وہ حکم مقید ہوگا۔ مثلاً ایک عورت کو آپ کہیں، نماز پڑھے! تو اس کا مطلب یہی ہوگا، اگر تمہاری حالت حیض کی نہیں تو نماز پڑھو۔ کیونکہ حائضہ بحکم قرآن طاہرہ نہیں اور نماز کیلئے طہارت شرط ہے:

﴿ولکن یرید لیطھرکم﴾ [1]

کہ اللہ تعالیٰ وضو کے حکم سے جو اس نے تم کو دیا ہے، تم کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

پس زید کا طلاق دینا، اس بناء پر نہ تھا کہ یہ حکم آپ ﷺ کا قرآن کے علاوہ تھا، کیونکہ یہ حکم تو قرآن میں موجود ہے، بلکہ اس لئے تھا کہ یہ حکم حقیقت میں مقید تھا اور قید کے نہ ہونے سے اس کا لزوم جاتا رہا۔ پھر یہ کہنا کہ ہم ہنگامی اور وقتی ہدایت کے لیے قطعاً مامور نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ حاکم کی اطاعت کے مامور نہیں۔ پہلے اقرار اور اب انکار، وقتی اطاعت بلا شرط مامور نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی اطاعت بحیثیت رسول ہونے کے دائمی ہے۔

منکر حدیث

اگر ہم ملاّ کا مذہب قبول کرلیں، تو پھر استنجا بھی اصول دین، منڈھا ہوا سر بھی رکن اسلام، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی مذہبی فرض، منڈھی ہوئی مونچھیں اور لمبی داڑھی بھی جزو دین! مسلمان کیا ہوا، ایک اچھا خاصا جوکر بن کر رہ گیا، کیا آپ ان لایعنی قیود میں جکڑا ہوا اسلام کسی انگریز کے سامنے پیش کرنے کی جرات کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کسی نومسلم انگریز کا سر مونڈھ کر اوپر ایک موٹا سا پگڑ باندھیں، مونچھیں مونڈ ڈالیں، داڑھی ناف تک بڑھا دیں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں، پگڑ میں مسواک، ٹانگ کے ساتھ تسبیح باندھیں اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے

---

[1] المائدۃ:٦

انگلستان بھیج دیں، تو دو ہی نتیجے ہونگے۔ یا تو انگریز اسے جنّ سمجھ کر مار ڈالیں گے، یا پھر چڑیا گھر میں بند کر دیں گے۔ اسلام میں یہی تو خوبی ہے کہ وہ صرف حقائق پر نظر رکھتا ہے اور ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ ملاّ سے میرا نزاع اسی بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر جزو اسلام بنانا چاہتا ہے اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان ملاّئی قیود سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔

قائل حدیث

اب آپ نے اپنا مقصد ظاہر کیا ہے کہ حدیث کو ماننے سے یہ قیود عائد ہو جاتی ہیں، اور آزادی پسند ان قیود کو بوجھ سمجھتا ہے، بلکہ ان پر عمل کرنا، اس کیلئے موت کے مترادف ہے۔ چونکہ قرآن میں ان قیود کا ذکر نہیں، اس لئے صرف قرآن پر عمل کرنے سے آزادی حاصل ہو گی۔ نہ دانت صاف کرنے کیلئے مسواک کی ضرورت، خواہ وہ بالکل سیاہ ہی ہو جائیں، اس کے باوجود جو باتیں ذکر کی ہیں، یہ سب لوازمات سے نہیں، شلوار کے لئے صرف یہی پابندی ہے کہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، ٹخنوں سے ایک بالشت اونچا ہونا لوازمات سے نہیں۔ اسی طرح مونچھوں کا مونڈنا فرض نہیں، بلکہ اتنا کٹانا کافی ہے کہ منہ میں نہ پڑیں، آج کل تو مونچھوں کا مونڈنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے، شاید آپ نے کتاب اس فیشن بننے سے پہلے لکھی ہو گی۔ اسی طرح داڑھی کا ناف تک ہونا، کوئی ضروری نہیں، صرف چار انگل تک ہونا کافی ہے۔ پگڑی ایک بہترین لباس ہے جسے بعض انگریز بھی پسند کرتے ہیں [1] اور لمبی داڑھی ان کے ہاں پادریوں کا شعار ہے اور ان کی کتاب بائبل میں مذکور ہے۔

ٹانگ سے تسبیح باندھنا کس حدیث میں آیا ہے؟ ظاہری شعار بھی اس قسم کی چیزیں ہیں، جن کے ضائع ہونے سے قوموں کی ثقافت جاتی رہتی ہے اور اسلام نے

---

[1] بلکہ یہ سپاہیانہ لباس ہے۔ (مؤلف)

جو وضع مقرر کی ہے، اگر عقلی طور پر غور کیا جائے، تو وہی وضع اصول طب پر منطبق ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ حدیث سے صرف اس لئے دشمنی رکھتے ہیں کہ اس میں پابندی کافی ہے اور آپ زیادہ پابندی سے گھبراتے ہیں۔ قرآن میں تو صاف طور پر ختنے کا بھی ذکر نہیں۔ اسی طرح تولد کے وقت اذان کہنے کا بھی ذکر نہیں، نہ مرنے کے وقت کہیں جنازہ مروّجہ کا ذکر ہے۔ نہ نکاح اور زنا میں کوئی واضح فرق ہے، لہٰذا صرف قرآن پر عمل کرنے سے ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور جو جزوی طور پر قرآن میں پابندی ہے، وہ بھی حدیث ماننے سے ہے، ورنہ حدیث کے انکار سے تو ہر قسم کی پابندی اٹھ جاتی ہے، جو چاہیں قرآن کا مطلب بیان کریں، کتنی بڑی آزادی ہے۔ حدیث کے ماننے سے انسان ہر طرح پابند ہو جاتا ہے اور حدیث کے انکار سے بالکل آزاد۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حدیث کا انکار کیا، ورنہ اس پر کوئی دلیل پیش کرتے!

منکر حدیث

اگر احادیث میں یہ ضروری نہیں کہ الفاظ رسول کے ہوں، تو پھر آپ ہر حدیث میں یہ کیوں کہا کرتے ہیں: "قال رسول اللہ ﷺ" اگر ہر حدیث راوی کا قول ہے، تو پھر وہ "قول رسول" نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی قول راوی کا بھی ہو اور حضور کا بھی۔

قائل حدیث

آپ حدیث سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتے ہیں، چودہ برس آپ نے کیا پڑھا اور درس میں کیا پڑھتے رہے؟ آپ نے غالباً قرآن بھی نہیں پڑھا!

اب سنئے! کلام اور قول میں فرق ہے۔ کلام کی نسبت تو متکلم کی طرف ہوتی

ہے، خواہ نقل بلفظہٖ ہو یا بالمعنیٰ ہو، ناقل کی طرف نہیں ہوتی اور قول میں ناقل اور اصل متکلم دونوں کی طرف نسبت کرنی جائز ہے۔ جیسے قرآن میں قرآن کو ﴿قول رسول کریم﴾ [1] بھی کہا ہے، اور کلام اللہ بھی کہا ہے۔ پھر "رسول کریم" سے ایک جگہ جبریل مراد ہے، جیسے سورۃ تکویر میں ہے [2] اور ایک جگہ (سورۃ حاقۃ) میں آنحضرت ﷺ مراد ہیں۔ [3] پس قرآن اللہ کا قول بھی ہے اور ناقل اول جبریل کا بھی ہے۔ اور ناقل ثانی آنحضرت ﷺ کا بھی ہے۔

منکر حدیث

ہمارے بعض علماء تو عشق حدیث میں یہاں تک عقل و خرد گم کر چکے ہیں کہ اللہ کے کلام کو نہ صرف احادیث کا محتاج ٹھہراتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہوئے بھی سنے جاتے ہیں کہ اگر اللہ کا کوئی قول رسول کے قول سے متصادم ہو جائے، تو قولِ خدا کو منسوخ سمجھو۔

قائل حدیث

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلام پاک چونکہ عربی زبان میں ایک خاص ماحول میں نازل ہوئی، اس لیے اس کے سمجھنے کے لیے قواعد عربیہ اور اس کے نزول کے ماحول کی واقفیت لازمی ہے۔ پس ہم قرآن کے سمجھنے میں صرف و نحو، لغت، معانی و بیان اور حدیث رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کے محتاج ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن محتاج ہے، اور حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کرتی، یہ حدیث ہی سے ثابت

---

1. التکویر: ١٩
2. مصدر سابق
3. الحاقۃ: ٤٠

ہے۔[1] اگر کسی عالم نے ایسا کہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا، اگر کوئی صحیح حدیث ظاہر قرآن کے معارض ہو، تو یہ معارضہ اسی وقت ہو گا، جب آیت منسوخ ہو گی، اگر چہ وہ آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف حدیث سے ہی قرآن کی آیت منسوخ ہو جاتی ہے۔ جیسے قتال کے فرض ہونے سے پہلے عفو اور صفح (درگزر) کرنے کا حکم تھا:

﴿ فاعفوا واصفحوا حتىٰ يأتي الله بأمره﴾ [2]

"یہود کی ان شرارتوں کو سن دیکھ کر معاف کرو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قتال کے بارہ میں) آجائے۔"

اب ایسی بہت احادیث قتال والے حکم کے موافق ہیں اور اس آیت کے ظاہر کے خلاف ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، لیکن ان احادیث سے نہیں، بلکہ قرآن مجید کی دوسری آیات سے۔

منکر حدیث

یہ چودہ لاکھ کا طومار رسول کی طرف کس نے منسوب کیا تھا۔ یہ طریقت، رہبانیت اور جہاد اکبر کے راستے لگا کر خدائی پیغام کو کس نے مسخ کیا تھا۔ یہ مسلمانوں

---

[1] یہ مندرجہ ذیل حدیث کی طرف اشارہ ہے: " كلامي لا ينسخ كلام الله" (سنن الدارقطني: ٤/١٤٥، الكامل في الضعفاء: ٢/١٨٠، العلل المتناهية: ١/١٣٢) اس کی سند میں " جبرون بن واقد" ہے، جس کا اس حدیث کو وضع کرنے میں ہاتھ ہے۔ لہٰذا یہ حدیث موضوع و منکر ہے۔ دیکھیں: الكامل: ٣/١٨٠، ميزان الاعتدال: ١/٣٨٨، العلل المتناهية: ٢/١٣٣، لسان الميزان: ٢/٩٤، الكشف الحثيث للحلبي: ١٢١، فيض القدير: ٥/٥٧، ضعيف الجامع (٤٢٨٥)

[2] البقرة: ١٠٩

سے تلوار چھین کر اس کی جگہ تسبیح کس نے تجویز کی تھی۔ یہ دنیا کو مردار کہہ کر مسلمانوں کو دنیا سے کس نے متنفر کیا تھا۔ یہ آفاقی کائنات کی جگہ ذلت، نکبت، فلاکت، جہالت، اِدبار اور پستی پہ قانع رہنے کا سبق کس نے دیا تھا۔ یہ دس کروڑ چینی، پانچ کروڑ روسی، دو کروڑ افریقی، آٹھ کروڑ جاپانی، دو کروڑ افغانی اور چالیس لاکھ کشمیری مسلمانوں کی موجودہ پست، غلیظ اور حیوانوں سے بدتر زندگی کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب ایک ہی ہے: ملّا کا خانہ ساز اسلام!

"قال القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلي الكتاب" ❶

"جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے، اس قدر حدیث قرآن کی محتاج نہیں۔"

(جامع بيان العلم : ٢٢٤)

قائلِ حدیث

بحث تو صحیح حدیث کے متعلق ہو رہی ہے، آپ نے خلط مبحث کرتے ہوئے بات موضوع اور ضعیف کی طرف پھیر دی ہے، حدیث پر عمل کرنے والے اور حق پر چلنے والے کی تو حدیث میں یہی نشانی بتائی گئی ہے کہ وہ قتال جاری رکھیں گے، فرمایا:

"لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين لا يضرهم من خالفهم" ❷

"ایک جماعت میری امت میں سے ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی، ان کے مخالف ان کو اس سے نہیں ہٹا سکیں گے۔"

---

❶ جامع بيان العلم:٢/٣٣٢ (٢٣٥٢)، السنة للمروزي :٣٣ (١٠٤)، مستخرج الطوسي:٢/٤٦ (٤٨)، ذم الكلام: ١/٣٠، یہ الفاظ امام اوزاعی، مکحول اور یحییٰ بن ابی کثیر سے مروی ہیں اور اس کی سند "صحیح" ہے۔

❷ یہ الفاظ مختلف روایات سے مرکب ہیں، دیکھیں: صحيح مسلم (١٥٦، ١٠٣٧)

یہی وجہ ہے کہ انگریز کی ڈیڑھ صد سالہ غلامی کے دور میں بھی اہل علم کی ایک جماعت بے بضاعتی کے باوجود انگریز جیسی طاقتور قوم سے مقابلہ کرتی رہی۔ ذلت و نکبت وغیرہ کی ذمہ دار، قوم کی بدعملی اور قرآن وسنت سے بے رخی ہے۔ چودہ لاکھ احادیث میں سے صحیح احادیث کی چھانٹ محدثین نے کی ہے اور موضوع اور ضعیف کو بھی انہوں نے الگ کیا ہے۔ طریقت کا مطلب تو صرف یہی ہے کہ اخلاق کی درستی اور عقیدہ کی پختگی کیلئے قرآن وسنت کے ان احکام پر عمل کو رائج کیا جائے، جن پر عمل کرنے سے انسان جہاد و قتال کیلئے اپنے آپ کو بخوبی پیش کر سکے، جیسے سید احمد صاحب نے کیا، جو شاہ اسماعیل شہید کے پیر تھے۔ رہبانیت کی تردید تو حدیث میں ہی ہے۔ رہبانیت میں وہی لوگ پھنسے، جو حدیث سے کم واقفیت رکھتے تھے۔ کسی حدیث میں تسبیح کی فضیلت کا ذکر نہیں۔ دنیا کی مذمت کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ سورۃ ''زخرف'' میں ہے:

﴿ولولا أن يكون الناس أمة واحدة لجعلنا لمن يكفر بالرحمن لبيوتهم سقفا من فضة و معارج عليها يظهرون﴾ ❶

''اگر لوگوں میں اتنی کمزوری نہ ہوتی (جیسے اب ہے کہ وہ مال ومتاع اور دنیا کے غلام بنے ہوئے ہیں) تو ہم کافروں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں چاندی کی بنادیتے۔''

دنیا کا یہ مطلب ہے کہ ان چیزوں کو تعیش کا سامان بنایا جائے۔ دنیا کا یہ مطلب نہیں کہ تجارت نہ کی جائے۔ کسب حلال اور کاشتکاری وغیرہ کی فضیلت تو جابجا احادیث میں وارد ہے۔ حقیقت میں جو چیز خدا کے احکام سے غافل کرے، وہی دنیا ہے۔

❶ الزخرف:۳۳

پس حقیقت میں ان تمام کمزوریوں کا سبب جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں، حدیث سے غفلت ہے۔ مکحول کے قول کا صرف یہ مطلب ہے کہ حدیث چونکہ بیان ہے، اور قرآن متن، اس لئے جتنی ضرورت متن کے سمجھنے کیلئے شرح کی ہوتی ہے۔ شرح کو سمجھنے کے لئے متن کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن اصل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: قرآن کو قرآن ہی منسوخ کرتا ہے [1] جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ سنت قرآن کو منسوخ کرتی ہے، ان کا مطلب صرف تفسیر کرنے کا ہے، یعنی قرآن کے عام کے متعلق یہ بتایا جائے کہ یہ خاص ہے، یا اس سے مراد چند افراد ہیں۔ یا یہ حکم کہ قرآن مجید کا حکم ایک علت کے ساتھ معلول ہو، اور اب وہ علت اٹھ گئی ہو، حدیث اس کا بیان کر دے کہ اب وہ علت اٹھ گئی، اس لئے حکم باقی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی استاد سے حدیث نہیں پڑھی۔ [2]

---

[1] جامع بیان العلم: ٢/٣٣٣، اس مسئلہ میں تفصیل کے لیے دیکھیں: مقالات الإسلاميين: ٤٧٩، المعتمد: ١/٣٩٤، الإحكام للآمدي: ٣/١٦٩، المستصفى: ٩٩، الموافقات: ٣/١٠٦، روضة الناظر: ٨٤، مناهل العرفان: ٢/١٧٢، فتاوى ابن تيمية: ١٧/١٩٥

[2] سنت و حدیث سے قرآن مجید کا نسخ علماء امت کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ ہے، لیکن دلائل و براہین کی روشنی میں حق بات یہی ہے کہ سنت رسول سے قرآن مجید کا نسخ جائز ہے، کیونکہ قرآن و حدیث دونوں کا منبع و مرکز وحی الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اپنی وحی کو منسوخ کر سکتا ہے اور سنت سے نسخ قرآن کے منکرین نے جو دلائل ذکر کیے ہیں، وہ باعتبار قوت نہایت کمزور ہیں، ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل آیت ذیل ﴿ما ننسخ من آية أو ننسها نأتِ بخير منها أو مثلها......﴾ [البقرة: ١٠٦] ہے۔ جس میں قرآن مجید کے نسخ کے لیے قرآن سے بہتر یا اس جیسی کسی چیز کا ہونا ضروری ہے اور سنت نہ تو قرآن سے بہتر ہے اور نہ اس کی مثل ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث رسول کا کچھ حصہ باعتبار تواتر و ثبوت کے اگرچہ قرآن مجید جیسا نہیں ہے (حدیث نبوی کا بہت بڑا حصہ ہم تک قرآن مجید کی طرح متواتر پہنچا ہے) لیکن باعتبار حجیت و شریعت قرآن و حدیث ←

منکرِ حدیث

''اسی چیز نے مجھے بچا لیا، اگر میں کسی شیخ الحدیث کے اڑنگے پر چڑھ جاتا، تو وہ مجھے اقلیم حقائق سے بہت دور اوہام وظنون کی دنیا میں لے جا کر وہ پٹخنی دیتا کہ میرا سر اور نظر ہر دو آب کی طرح چکرا جاتے اور میں اس بھول بھلیاں سے کبھی نہ نکل سکتا۔''

← میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ رسول کی طاعت خدا کی اطاعت ہے ﴿من يطع الرسول فقد أطاع الله﴾ [النساء: ٨٠] اور رسول کی اطاعت مطلقاً فرض ہے ﴿وما آتاكم الرسول فخذوه و ما نهاكم عنه فانتهوا﴾ [الحشر: ٧] لہٰذا قرآن و حدیث کے درمیان کسی طرح کی تفریق اور درجہ بندی غلط ہے بلکہ دونوں چیزیں تمام مسلمانوں کے لیے اصول شریعت ہیں اور دونوں چیزوں کے درمیان باعتبار اطاعت و حجیت تفریق کرنا کفار کا شیوہ ہے، کسی مسلمان کا نظریہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إن الذين يكفرون بالله و رسله و يريدون أن يفرقوا بين الله و رسله......﴾ [النساء: ١٥٠۔١٥٢] اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے بھی قرآن و حدیث کو حجیت و شریعت میں برابر قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "ألا إني أوتيت القرآن و مثله معه" یعنی خبردار رہو! کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے مثل ایک اور چیز'' یعنی سنت نبوی۔ اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: "إن ماحرم رسول الله كما حرم الله" یعنی رسول کی حرام کردہ چیز اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کی طرح ہے۔ (دیکھیں: ابوداود (٤٦٠٤)، ترمذي (٢٦٦٤) لہٰذا ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث نبوی سے قرآن مجید کا نسخ ممکن و جائز ہے۔ اس کی مثال: قرآن مجید کی آیت ﴿كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت إن ترك خيراً الوصية......﴾ [البقرة: ١٨٠] کی ناسخ حدیث نبوی " لا وصية لوارث" [ابوداود (٢٨٧٠)، نسائي (٣٦٤١)] ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے مذکورہ بالا آیت کی ناسخ آیت میراث [النساء: ١١] کو قرار دیا ہے۔ لیکن آیت میراث سے مذکورہ بالا آیت میں وصیت کا وجوب منسوخ ہوتا ہے۔ وصیت کا جواز صرف مذکور حدیث سے ہی منسوخ ہوتا ہے۔ دیکھیں: الإحكام لابن حزم: ٤/ ٥١١، تحفة الأحوذي: ٦/ ١٨٣۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: اصلاحی اسلوب تدبر حدیث: ١/ ٢٨٦۔٣١٤

قائلِ حدیث

اصل حقیقت واضح ہوگئی ہے۔ چونکہ آپ نے کسی استاد سے تو حدیث پڑھی نہیں اور قرآن کا بھی یہی حال ہوگا۔صرف منکرین حدیث کے رسائل کی واقفیت ہی آپ کی تحقیق کا منتہا ہیں، اسی واسطے آپ نے قرآن کی آیتوں کے لکھنے میں بھی غلطی کی اور حدیث کے ترجمہ میں بھی غلط بیانی سے کام لیتے رہے، یہ مقولہ نہایت درست ہے:

"من كان شيخه الكتاب فغلطه أكثر من الصواب"

''جس کا استاد کتاب ہو، وہ غلط باتیں زیادہ کرتا ہے اور ٹھیک کم''

اب بھی وقت ہے سنبھل جائیے! کسی شیخ الحدیث سے تحقیق کر لیجئے اور اس کے اڑنگے سے نہ ڈریئے۔ اپنے آپ کو اتنا بے وقوف نہ بنایئے کہ کوئی ملاّ آپ کو پٹخنی دے کر آپ کا سر اور نظر دونوں کو چکرا دے اور آپ جس کو بھول بھلیاں سمجھ رہے ہیں، وہ حقائق و معارف نظر آنے لگیں۔

چھٹا باب:

تحریف احادیث کے اسباب

مصنف نے تحریف احادیث کے آٹھ اسباب بیان کئے ہیں:

1. کتابتِ حدیث کی ممانعت
2. آسان اسلام
3. طریقت
4. بادشاہوں کی خوشامد
5. فرقہ پرستی
6. امتیاز رنگ ونسل
7. ملا در مدح خود مے گوید
8. حقائق حیات

ان اسباب میں اکثر جگہ موضوع روایات کا ذکر کیا ہے۔ صرف پہلا باب ایسا ہے، جس میں تحریف حدیث کا ذکر کیا ہے۔ باقی تو حقیقت میں حفظ حدیث کے باب میں ذکر ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جن لوگوں نے موضوع احادیث بنائیں، محدثین نے وضع کے اسباب آپ سے زیادہ لکھے ہیں اور ان موضوع احادیث کو الگ کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفظ حدیث کا کیا ہی اچھا انتظام کیا!

اب ہم ترتیب وار سب پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

پہلا سبب: کتابت حدیث کی ممانعت

پہلا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، جو چیز لکھی نہ

جائے وہ بدل جاتی ہے۔ اور بالآ خرمٹ جاتی ہے۔

جواب

اول: تو حدیث کے لکھنے کی ممانعت کا ذکر ہی صحیح نہیں، بلکہ واقعہ کے خلاف ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے احادیث خود لکھوائیں اور لکھی گئیں، اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔

حفاظت حدیث کی صورتیں

دوم: غیر مکتوب کو تحریف سے بچانے کی اور کوشش بھی ہو سکتی ہے، جس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

1. اس کو روزمرہ کے عمل میں لایا جائے، جیسے اذان، اقامت، پانچ وقتی نماز، وضو۔
2. حکومت کیلئے قانون بنایا جائے، جیسے قصاص و دیات، نان و نفقہ، عدت، زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ، حرمتِ سود، بعض بیوع اور اجاروں کی ممانعت، حدود، تعزیرات، حرمتِ شراب و میسر، میراث، وصیت، ہبہ، کفالت، امارت، تقسیمِ غنیمت وغیرہ۔ یہ صورت اس قسم کی ہے، جس سے حدیث تحریف سے بچ جاتی ہے۔
3. حکومت کے ذمہ اس کی اشاعت و حفاظت ہو۔
4. لوگوں کییاد کرنے کی طرف توجہ ہو۔
5. متنِ احکام کو الگ لکھ کر محفوظ کر لیا جائے۔ اور حدیث کو بطور بیان لیا جائے۔ اس صورت میں چونکہ متن محفوظ ہوتا ہے، احادیث بھی تبعاً محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اگر غلطی سے کوئی بات بدل جائے گی، تو مندرجہ بالا اسباب کی بناء پر اس کا پتہ چل جائے گا۔

تحریف قرآن کی مذموم کاوش:

جیسا کہ آپ نے ''دو اسلام'' میں قرآن کی آیت ﴿وأوحي إلي هذا

القرآن﴾ کو ”إنما أوحي الي هٰذا القرآن“ لکھ دیا ہے اور ”سبوح قدوس رب الملائکة والروح“ کو قرآن کی آیت بنا دیا ہے۔ مرزا غلام احمد نے ”یاأیها الذین أنفقوا في سبیل اللّٰه“ قرآن کی آیت لکھی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں آپ کی اور مرزا غلام احمد کی کتاب طبع ہو کر لوگوں کے پاس پہنچی اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے، جو اب تک آپ کا ''دو اسلام'' دیکھ کر ان کو قرآن کی آیات سمجھتے ہوں۔ مگر اس سے قرآن میں تحریف نہیں ہو جاتی۔

حدیث محفوظ ہے:

اسی طرح اگر کوئی اپنی جگہ کوئی حدیث بنائے یا صحیح حدیث کو بدل دے، تو اس سے نفس حدیث میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کی غلطی ہوتی ہے۔ حدیثوں کو قائد اعظم کی تقریر پر قیاس نہیں کر سکتے، نہ اوائل امت کو اپنے آپ پر قیاس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ مختصر جامع باتیں کرتے تھے اور ان کو بارہا فرمایا کرتے تھے۔ ایک ایک سورت اتنی بار پڑھا کرتے کہ سننے والے صرف سننے سے یاد کر لیتے۔ اسی طرح جو کلمہ مشکل ہوتا، اس کو دہراتے، پھر اگر کسی کو پوری تقریر یاد نہ رہتی، تو جس قدر یاد ہوتی بیان کرتا۔ جیسے کسی کو اگر قرآن سارا یاد نہ ہو، تو جس قدر یاد ہو، اس کے حفظ پر متروک حصہ کا کچھ اثر نہیں پڑتا اور ہم یقین کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعض لمبے خطبات پورے کے پورے محفوظ نہیں رہے۔ مگر ہم یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں کہ سننے والوں نے عمداً کوئی بات بدلی ہو۔ اگر کسی نے سہواً کوئی بات غلط کہی ہے، تو اس غلطی کے دور کرنے کے اسباب موجود تھے۔ اور جس قدر قرآن کے بیان اور اس پر عمل کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ کے اسوہ کی ضرورت تھی، اس قدر ہمیں محفوظ شکل میں پہنچ چکا ہے۔

پھر سننے والے عرب تھے، جن کا حافظہ قدرتاً تیز تھا، ان کو اپنے آپ پر قیاس کرنا درست نہیں، پھر قائد اعظم کی تقریر کی طرح یہ ایک ہنگامی بات نہ تھی۔ بلکہ ان باتوں کو روز مرہ دہرایا جاتا تھا، اور ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ اسی طرح فراموش شدہ حصہ کو پھر سے یاد کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

دین کی باتیں ان حوادث کی طرح نہیں جو کہیں گذرا اور اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہو، بلکہ یہ ایک دستور العمل تھا، جس کا ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق تھا، جس کا مرکز خود رسول اکرم ﷺ تھے، جن کی طرف ہر سہو ونسیان کے موقع پر رجوع کیا جاتا تھا۔

اعتراض:

"دو اسلام" میں ایک عجیب بات کہی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام سے ایک بات نکلی، ہزاروں نے سنی، رفتہ رفتہ اس میں رد و بدل ہونے لگا۔ زمانہ گذرتا گیا اور بات بگڑتی گئی۔ ہزاروں سے نکل کر لاکھوں اور لاکھوں سے نکل کر کروڑوں زبانوں تک پہنچی، جہاں کوئی حصہ بھول گیا، پاس سے بڑھا لیا۔ اصل قول محفوظ نہیں تھا کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے۔ راویوں میں اچھے بھی تھے اور برے بھی۔ مؤخر الذکر نے احادیث کو اپنی اغراض کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

(دو اسلام: ۱۲۳)

جواب:

آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جب بات کروڑوں کی زبان پر چڑھ گئی، تو مختلف صورتوں میں تبدیل ہوگئی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ محدثین ہر کس و ناکس سے بات سن کر اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے، بلکہ معتبر آدمیوں سے ہی بات لی جاتی تھی۔ اس

کی اصلیت معلوم کرنے کیلئے انکے ہاں قواعد تھے، جیسے قرآن کو بہت سے لوگ غلط پڑھتے ہیں اور غلط چھپ بھی جاتا ہے، لیکن محرف نہیں ہوتا۔

اعتراض:

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ کا زمانہ تھا، خود سرور کائنات بقید حیات کہ حضرت زبیر سے ان کے بیٹے عبداللہ نے پوچھا کہ آپ روایت حدیث سے کیوں اجتناب کرتے ہیں؟ فرمایا: اللہ کی قسم احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے۔ میں نے حضور کی زبان مبارک سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی:

"من كذب علي فليتبوأ مقعده من النار" [1]

کہ ''جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کرے گا، جہنم میں جائے گا''

لیکن لوگوں نے "متعمّداً" بڑھا دیا ہے۔

جواب:

مگر اس واقعہ کی سند صحیح نہیں، بلکہ زبیر سے خود "متعمّداً" کے لفظ کے ساتھ بھی حدیث آئی ہے۔ [2] اور زیادہ صحابی اس لفظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہوسکتا

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي صلى الله عليه وسلم رقم الحديث(١٠٧) مرفوع حدیث کے الفاظ یہیں تک ہیں، اور یہ الفاظ'' لیکن لوگوں نے "متعمدًا بڑھا دیا ہے۔'' ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خود ساختہ ہیں۔ مزید برآں مؤلف رحمہ اللہ کا یہ فرمانا: مگر اس واقعہ کی سند صحیح نہیں'' ان الفاظ کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا، کیونکہ مذکورہ بالا اثر و حدیث صحیح بخاری میں مذکور ہیں۔ واللہ أعلم

[2] دیکھیں: سنن أبي داود: كتاب العلم، باب التشديد في الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث (٣٦٥١)

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی اس لفظ کے بغیر کہا ہو اور کبھی اس لفظ کے ساتھ۔

اعتراض:

آگے لکھتے ہیں:

''اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے حضرت ابوہریرۃ کی کتے والی حدیث بیان کی گئی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مویشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت کیلئے کتا پالنا جائز ہے، تو ابن عمر نے فرمایا: کیوں نہ ہو، ابوہریرۃ کھیتوں کا مالک جو ٹھہرا!''

توجیہ: چونکہ حضرت ابوہریرۃ نے اپنے کھیت کیلئے کتا پال رکھا تھا، اس لئے بقول ابن عمر آپ نے ایک حدیث تراش کر کتا پالنے کا جواز نکال لیا تھا۔'' (دو اسلام: ٢٢٤)

جواب:

یہاں مصنف نے ترجمہ غلط کر کے اس کا مطلب غلط لیا ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہ کہا تھا کہ ''ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی کھیتی ہے''[1] یہ نہیں کہا ''کیوں نہ ہو..........'' تا کہ انکار لازم آئے۔ بلکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کا چونکہ کھیت ہے، اس لئے ان کو اس مسئلہ کے متعلق تحقیق ہے۔ پھر ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ اس میں منفرد نہیں، اور صحابی بھی کھیت کا لفظ ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔[2]

آگے ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیتے ہیں:

اعتراض:

ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے، تو نماز پڑھنے کا

---

[1] صحیح مسلم: كتاب المساقاة، باب الأمر بقتل الكلاب، رقم الحديث(١٥٧٥)

[2] صحیح مسلم: كتاب المساقاة، باب الأمر بقتل الكلاب، رقم الحديث(١٥٧٦)

طریقہ کہاں سے سیکھو گے، اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے معین کرو گے؟

جواب: ''اس سوال کے تین جواب ہیں، اول اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں، تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے۔''

(دو اسلام: ١٢٤)

جواب:

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیث میں یہ لکھا ہے کہ ہر مسجد والے الگ الگ نماز پڑھیں اور جب ایک مسجد میں جمع ہوں، تو ایک ہی طرح نماز پڑھیں۔ اگر حدیثی نماز میں اختلاف ہونے کے باوجود ایک مسجد میں اتفاق ہو سکتا ہے، تو پھر دو مسجدوں میں بھی اتفاق ہو سکتا ہے۔ اور اگر دو مسجدوں میں نماز مختلف ہو سکتی ہے، تو ایک مسجد میں بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ اگر حدیث سے یہ ثابت ہو بھی جائے کہ نماز ان مختلف طریقوں سے جائز ہے، تو اس اختلاف میں کون سی قباحت ہو سکتی ہے؟ جب آپ مختلف شکلیں لے کر نماز میں داخل ہو سکتے ہیں، تو اس میں کیا حرج ہے کہ ہاتھ باندھنے یا چھوڑنے یا رفع الیدین کرنے یا نہ کرنے اور آمین بالجہر کہنے یا آہستہ کہنے کے ساتھ نماز میں سب شامل ہو جائیں!

اعتراض:

آگے دوسری وجہ لکھتے ہیں:

''دوم: رسول کریم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا، انہیں کروڑوں نے اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا، کیا ان ارب کھرب مسلمانوں کی شہادت کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان ''صحیح بخاری'' سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں؟ جس طریقہ سے ہمارے آباء واجداد نماز ادا کرتے رہے۔ ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا اور اب نئی نسل ہماری نقل کر رہی ہے۔ یہاں ''صحیح

بخاری'' کی ضرورت ہی کیا پیش آتی ہے؟ کشمیر کی ساری وادی میں ''صحیح بخاری'' کا کوئی نسخہ موجود نہ ہوگا۔ لیکن وہ پھر بھی نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں۔ (دو اسلام: ۱۲۵)

جواب:

اب سوال یہ ہے، یہ نماز جو اربوں کھربوں کی شہادت سے ثابت ہے، کیا قرآن میں اس ترتیب کو آپ اس طریقہ پر جو ہم پڑھتے ہیں، دکھا سکتے ہیں؟ اگر نہیں دکھا سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی ہم کسی چیز کو مانتے ہیں، اسی کا نام تو حدیث ہے! پھر نماز کا کچھ حصہ (قیام، رکوع، سجود، قعدہ، جلسہ، قومہ، ہاتھ اٹھانا اور باندھنا) محسوس یعنی دیکھا جاتا ہے اور کچھ حصہ (جماعت کی صوت، تکبیرات، اور سمع اللّٰه لمن حمده، السلام عليكم) سنا جاتا ہے۔ مگر کچھ نماز کا حصہ وہ بھی ہے جو نہ دیکھا جاتا ہے اور نہ سنا جاتا ہے، جیسے دعاء استفتاح، سبحان ربي العظيم، ربنا لك الحمد، التحيات، درود وغیرہ، اس لئے ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا زبانی ذکر کیا ہوگا۔ پس نماز کیلئے دو قسم کی حدیث قولی و عملی ثابت ہوگئی۔ ہاں یہ بات باقی رہ جاتی ہے، نماز میں اگرچہ اس کے بہت سے حصہ میں اتفاق ہے، مگر اس کے محسوس حصہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ مثلاً ہاتھ باندھنے اور چھوڑنے اور رفع الیدین کرنے اور نہ کرنے، آمین بالجہر کہنے اور آہستہ کہنے اور ہاتھ زیر ناف باندھنے یا اوپر باندھنے، مگر یہ امور سب کے نزدیک سنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو طرح سے نماز پڑھی ہو۔ جس طرح کسی نے دیکھا اور آگے جا کر نماز پڑھی، پھر اس کو دیکھنے والوں سے اسی طرح طریقہ چلا آیا، یہاں تک کہ یہ زمانہ آیا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے صرف ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہو، مگر دیکھنے والوں میں سے بعض نے سنت سمجھ کر غفلت کی بناء پر

چھوڑ دیا ہو، پھر وہاں سے سلسلہ چل کر اس زمانہ تک پہنچ گیا ہو۔ یہی حال دوسرے امور اختلافیہ کا ہے۔ اب ایسے مقام پر بخاری اور دوسری کتب حدیث کی ضرورت پڑتی ہے کہ آیا یہ طریقہ آنحضرت ﷺ سے بھی ثابت ہے، یا بعد کا تعامل ہے؟

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عورتوں کی نماز میں موجودہ زمانہ میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ پس یہ اختلاف اگر بعد کا پیدا شدہ نہیں، تو ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق زبانی ہدایت دی ہو۔ پس اس صورت میں بھی قولی حدیث کا ثبوت ملتا ہے اور یہ خیال ہم کو کبھی نہیں گذرتا کہ لاکھوں نمازیوں کی زبان اور عمل پر نماز گذری، شاید کتنے تغیر اور تبدل پیدا ہوئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی ہے کہ نماز میں اگر تغیر اور تبدل ہوتا، تو پڑھنے والوں میں سخت اختلاف ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں، کیونکہ بالاتفاق اس کا ایک ڈھانچہ متعین ہو چکا تھا۔ جب ایک چیز متعین ہو چکی ہو، تو اس میں خواہ کتنا ہی رد و بدل ہو، آخر اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کی تبدیل شدہ ہیئت کا کوئی بھی حامی نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات ہے، تو اسلام میں جو اجماعی مسائل ہیں، جن میں کسی فرقہ کا اختلاف نہیں، ان کے بارہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے متعلق تو یقین کر لینا چاہیے کہ ان میں رد و بدل نہیں ہوا ہوگا۔ اگر کسی وقت کسی نے رد و بدل کی کوشش کی بھی ہو، تو اس کو کسی نے بھی قبول نہ کیا ہوگا۔ باقی رہیں وہ احادیث جن کا تعلق اختلافی مسائل سے ہے، ان میں جو اجماعی الصحت یا متواتر ہیں، ان کو قبول کر لیا جائے، باقی میں تحقیق کر لی جائے، اور سارا زور آپ وہاں خرچ کریں۔

اعتراض:

اس کے بعد مصنف ''دواسلام'' کی زبان میں تیسرا جواب سنئے:

''سوم: قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے، جس طرح ہم کسی تفسیر،

تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے، اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے۔ انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے۔ جس طرح بعض انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآنی آیات و احکام کی شروح بیان کریں، اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان لوگوں نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کی کوئی ایسی تشریح کی ہے، جو قرآن کے خلاف نہیں، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ لیکن ہم ان حضرات کو اسلام میں ایسے اضافے کی اجازت نہیں دے سکتے، جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہ ہو یا وہ انسانی عقل وفطرت اور قرآن ہر سہ سے متصادم ہوتا ہو۔‘‘

(دو اسلام: ۱۲۵)

جواب:

اس جواب میں تو مصنف نے مسئلہ صاف کر دیا ہے کہ محدثین کو بھی تشریح کا حق ہے، جیسے دوسرے مصنفین کو، مگر اضافے کا حق نہیں اور حدیث اگر قرآن کے خلاف ہو یا عقل اس کو باور نہ کرے، تو وہ قابل قبول نہیں۔ حالانکہ یہ اتفاقی بات ہے کہ حدیث قرآن کا بیان اور اس کی تفسیر ہے۔ باقی مصنفین اور محدثین میں اتنا فرق ہے کہ وہ لغت وغیرہ سے تفسیر کرتے ہیں اور محدثین حدیث سے کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث میں کوئی ایسی بات ہے، جو قرآن میں نہیں، تو اس کو اضافہ نہیں کہتے، اضافہ اسے کہتے ہیں، جو اصل کے درجہ میں ہو، یعنی اس کو بھی قرآن سمجھا جائے، مگر حدیث کو کوئی قرآن نہیں سمجھتا۔

باقی آنحضرت ﷺ کی حدیث کو بے اندازہ انسانی اقوال کی آمیزش سے الگ

کرنے کا طریقہ ہم بارہا بتلا چکے ہیں۔ جیسے مصنف نے نماز کے متعلق حدیث کو تسلیم کیا ہے، اسی طرح اگر زکوٰۃ سے متعلق تسلیم کر لیتے، تو اچھا تھا۔ کیونکہ دونوں مسئلے تواترِ عملی سے ثابت ہیں، بلکہ زکوٰۃ کے متعلق تو آنحضرت ﷺ کی تحریر بھی موجود ہے۔ [1] اور اسلامی حکومت کے آئین میں اس کا داخل ہونا بھی اس کے متعین اور غیر محرف ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

اعتراض:

مگر اس کے متعلق مصنف "دو اسلام" لکھتے ہیں:

"باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ، تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے، زکوٰۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستہ میں مالی قربانی۔" (دو اسلام: ۱۲۶)

جواب:

اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں:

قرآن نے زکوٰۃ اور اللہ کے راستے میں مالی قربانی کا الگ الگ ذکر کیا ہے، فرمایا:

﴿ وآتى المال على حبه ذوي القربىٰ واليتمىٰ والمساكين وابن السبيل والسآئلين وفي الرقاب وأقام الصلوٰة وآتى الزكوٰة﴾ [2]

"بہترین مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں کی آزادی میں خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔"

اس آیت میں مالی قربانی کا الگ ذکر کیا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا الگ بیان

[1] اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

[2] البقرة: ١٧٧

فرمایا ہے۔ "سورۃ مزمل" میں فرمایا:

﴿ و أقيموا الصلوٰة واٰتوا الزكوٰة وأقرضوا الله قرضا حسنا﴾ ❶

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو اچھا قرض دو۔"

عام طور پر قرآن مجید "قتال في سبيل الله" میں خرچ کرنے کو "قرض" سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسا کہ "سورۃ بقرۃ" اور "الحدید" میں ہے۔ ❷

مالی قربانی کی اقسام:

مالی قربانی دو قسم کی ہے، ایک متعین اور دوسری غیر متعین۔ متعین کو عرف میں "زکوٰۃ" کہتے ہیں اور غیر متعین کو زکوٰۃ نہیں کہتے، اگرچہ لغت کے اعتبار سے اس پر زکوٰۃ کا اطلاق ہوسکتا ہے، پھر زکوٰۃ دائمی فریضہ ہے اور وقتی صدقات کی کوئی حد نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد وقتی ضرورت کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وقتی ضرورت اپنے ضروریات سے زائد تمام مال خرچ کرنے سے پوری ہوتی ہو، تو اس وقت یہی حکم ہے کہ سب خرچ کرو۔ قضیۂ اشتراکیت اور سرمایہ داری کا یہ حل نہیں کہ بالکل جمع کرنے سے روک دیا جائے۔ ورنہ میراث کی وصیت اور خرچ کرنے کا مقصد ہی مفقود ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے، فقراء و مساکین کی ضروریات (کھانا پینا، پہننا، سکونت، نکاح، علاج، تعلیم وغیرہ) کا پورا بندوبست کیا جائے۔ اگر زکوٰۃ سے بندوبست ہو جائے، توفبہا، ورنہ تمام زائد مال تک اس میں خرچ کر دیا جائے۔ یہی قرآن سے ثابت ہے اور یہی حدیث میں ہے۔ ❸ جب تمام زائد مال کا خرچ کرنا، وقتی ٹھہرا، تو اس کو دائمی فرض نہیں بنا سکتے اور دائمی فرض ہمیشہ متعین ہوا کرتا

---

❶ المزمل: ٢٠

❷ دیکھیں: البقرۃ: ٢٤٥، الحدید: ١١

❸ دیکھیں: البقرۃ: ٢١٩، نیز دیکھیں: صحیح مسلم (٩٩٧)

ہے، وقتی فرض متعین نہیں ہوتا، اس کا تعین حاجت کے اندازے پر ہوتا ہے۔ پس لازمی طور پر زکوٰۃ متعین ہونی چاہیے۔

تحریفِ حدیث کا دوسرا سبب: آسان اسلام

اس میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ''اسلام جہاد وقتال کو فرض قرار دیتا ہے۔ مگر حدیث سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔'' حالانکہ حدیث ''کتاب الجھاد'' میں یہ باتیں احسن طریقہ پر بیان ہو چکی ہیں۔ فقہ کی تمام کتابوں میں ''کتاب الجھاد'' موجود ہے۔ انگریز کے ساتھ علماءِ دین جہاد کرتے رہے۔

موضوع احادیث کا تذکرہ:

اب اس کے بعد موضوع حدیثیں بیان کی ہیں:

پہلی حدیث:

① بلی سے محبت ایمان۔

سخاوی نے اس کو ''موضوع'' قرار دیا ہے۔ [1]

دوسری حدیث:

② ''من تعلم بابا من العلم ليعلم الناس ابتغاء وجه الله أعطاه الله أجر سبعين نبيا''

''جو مولوی کسی طالب علم کو کسی کتاب کا ایک ہی باب فی سبیل اللہ پڑھا دے اللہ (تعالیٰ) اسے ستر نبیوں کا اجر عطا فرماتا ہے۔'' (دو اسلام: ۱۳۱)

اس حدیث کو ''تذکرۃ الموضوعات'' میں ''موضوع'' قرار دیا گیا ہے۔ [2]

---

[1] یہ حدیث ''موضوع'' ہے، دیکھیں: کشف الخفاء(۱۱۰٤)، تذکرۃ الموضوعات: ۱۱

[2] الفوائد المجموعۃ: ٤٨٤، تذکرۃ الموضوعات: ۱۸

مصنف نے اس کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''جو علم کا ایک باب پڑھے، تاکہ لوگوں کو اللہ واسطے پڑھائے، اللہ تعالیٰ اسے ستر نبیوں کا اجر عطا فرماتے ہیں۔''

تیسری حدیث:

③ آگے ایک حدیث وضو کی فضیلت میں لکھی ہے، جس کا مضمون یہ ہے:

''وضو کے ہر قطرہ سے فرشتہ پیدا ہوتا ہے، جو ستر زبانوں میں اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے، قیامت میں اس کو اس کا ثواب ملتا ہے۔''

یہ حدیث بھی موضوع ہے، دیکھو: تذکرۃ! [1]

چوتھی حدیث:

④ اس کے بعد ایک اور موضوع حدیث لکھی ہے، جس کا مضمون یہ ہے:

''جو آدمی مرنے کے بعد ایک ورقہ علم کا چھوڑ جائے، وہ ورقہ جہنم اور اس کے درمیان آڑ بن جائے گا۔''

یہ حدیث بھی موضوع ہے۔ دیکھو: میزان، تذکرہ۔ [2]

پانچویں حدیث:

⑤ اس کے بعد ایک اور حدیث موضوع لکھی ہے:

''من كتب بسم الله الرحمن الرحيم، فجوده تعظيما لله غفرله''

---

❶ المجروحين لابن حبان:٢/١٦٥، العلل المتناهية:١/٣٣٩، لسان الميزان: ٣/٢٣٠، تذكرة الموضوعات: ٣٢

❷ تذكرة الموضوعات :٢٣، مولفِ تذکرہ نے ''میزان'' کا حوالہ ایک دوسری بعد والی حدیث کے لیے دیا ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان: ٢/٦٨

''جو شخص بسم اللہ کو خوشخط لکھے، اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔'' یہ بھی موضوع ہے۔ ❶ (تذکرہ)

چھٹی حدیث:

⑥ ''جو شخص سال بھر کسی مسجد میں سچی نیت سے اذان دیتا رہے، وہ قیامت کے دن جنت کے دروازہ میں کھڑا ہو گا، اس کو اختیار دیا جائے گا، جس شخص کی چاہے، شفاعت کرے۔'' موضوع ہے (تذکرہ) ❷

ساتویں حدیث:

⑦ پھر حج کے بارہ میں ایک موضوع روایت لکھی ہے کہ:

''جو شخص فجر کی نماز باجماعت پڑھے، اس کو اتنا ثواب ملے گا، گویا اس نے پچاس حج کیے ہوں۔''

مگر یہ حدیث صحیح نہیں، تیسرے درجہ کی ضعیف بلکہ موضوع ہے۔ ❸

---

❶ الكامل لابن عدي: ٥/٤٩، لسان الميزان: ٤/٢٩٩، السلسلة الضعيفة: ١/٤٣٨۔ ملا طاہر پٹنی نے "تذکرہ" میں اس حدیث کو "موضوع" نہیں قرار دیا، بلکہ اس حدیث کے بعض شواہد کی بناء پر اس کو صحیح قرار قرار دیا (تذكرة الموضوعات: ٢٣۔٢٤) لیکن ان کا یہ قول درست نہیں۔ کیونکہ اس کی سند میں بعض متروک و کذاب راوی ہے، جن کی بناء پر یہ حدیث "موضوع" ہے اور اس کا شاہد بھی ضعیف ہے۔ اسی بناء پر امام ابن جوزی، سیوطی، البانی رحمہم اللہ اور دیگر علماء نے اس حدیث کو "موضوع" قرار دیا ہے۔

❷ الفوائد المجموعة: ٢١، تذكرة الموضوعات: ٣٦، السلسلة الضعيفة: ٢/٢٤٣۔

❸ یہ حدیث "موضوع" ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان: ٢/٤٥٤، كشف الخفاء للعجلوني (٢٥١٩)، الفوائد المجموعة: ٣٢، تذكرة الموضوعات: ٣٩

آٹھویں حدیث:

⑧ اس کے بعد ایک اور موضوع حدیث "لا إله إلا الله" کی فضیلت میں ذکر کی ہے کہ "جو شخص لا إله إلا الله.......... پڑھے، اس کے چار ہزار کبیرے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

یہ موضوع حدیث بھی "تذكرة" میں ذکر کی گئی ہے۔ ❶

نویں حدیث:

⑨ ایک اور حدیث ملاحظہ ہو:

"إن أمتي أمة مرحومة لا عذاب عليها في الآخرة"

"(آنحضرت ﷺ نے فرمایا) میری امت بخشی ہوئی ہے، اسے قیامت کے دن عذاب نہیں ہوگا۔"

موضوع ہے۔ (تذكرة) ❷

---

❶ كنز العمال: ١/٧٤، تذكرة الموضوعات: ٥٥۔

❷ یہ حدیث کئی اسانید کے ساتھ مروی ہے، بعض اسانید "صحیح" اور کچھ اسانید "ضعیف" ہیں، لہٰذا یہ حدیث قابل احتجاج ہے، مؤلف رحمہ اللہ نے جس سند کے پیش نظر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اس کی سند میں " مسلمه بن علي بن خلف الخشني" متروک ہے۔ (الجرح والتعديل: ٨/٢٦٨، الكامل في الضعفاء: ٦/٣١٣، المجروحين لابن حبان: ٣/٣٣، الكشف الحثيث: ٢٥٦) لہٰذا اس سند کی بناء پر یہ حدیث "ضعیف" ہے۔ دیکھیں: تذكرة الموضوعات: ٩٢، كنز العمال: ١٤/٣٧، الفتن للمروزي: ٢/٥٩٣، لیکن دیگر اسانید کے پیش نظر یہ حدیث "صحیح" ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود: كتاب الفتن والملاحم، باب ما يرجى في القتل، رقم الحديث (٤٢٧٨) مسند أحمد: ٤/٤٠٨، ٤١٠، ٤١٨، المستدرك: ٤/٢٨٣، ٤٩١، المعجم الصغير (الروض الداني: ١/٢٥) مسند أبي يعلى: ١١/٦٧، مسند عبد بن حميد: ١٩٠، اس حدیث کو امام حاکم، ذہبی اور البانی رحمہم اللہ نے "صحیح" قرار دیا ہے۔ ←

اب تک جس قدر حدیثیں ذکر کی ہیں، وہ سب ''موضوع'' ہیں اور محدثین نے ان کو غیر معتبر کہا ہے۔ پھر معلوم نہیں، ان کے ذکر کرنے میں تحریف کا اثبات ہوتا ہے یا نفی کا، ظاہر تو یہی ہے کہ وضع کرنے والا تو حدیث میں اضافہ کرنا چاہتا تھا، مگر محدثین نے اس کا مکر چلنے نہ دیا، پس یہ حدیث کی حفاظت ہوئی!

آگے کہتے ہیں:

تحریف حدیث کا تیسرا سبب: طریقت

''مشکل اسلام سے بھاگنے والے دو گروہ تھے، ملا اور پیر۔ پیر نے جہاد سے جان چھڑانے کیلئے اپنے ''ہُو حق'' کے نعروں کو جہاد اکبر بنا لیا اور اپنے مسلک پر احادیث گھڑنا شروع کر لیں۔

چند موضوع احادیث

پہلی حدیث:

① ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور سے پوچھا کہ علم باطن کیا چیز ہے؟

← (السلسلة الصحيحة: ٢/٦٤٨ (٩٥٩) اس کی بعض اسانید میں ''عبد الرحمن بن عبد الله المسعودی'' ہے، جو کہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، اور ان سے یزید بن ہارون، کثیر بن ہشام اور ہاشم بن قاسم روایت کرتے ہیں، جب کہ انھوں نے عبد الرحمن المسعودی سے بعد از اختلاط سنا ہے، لہٰذا اس علت کی بناء پر یہ سند ''ضعیف'' ہے۔
لیکن ''معاذ بن معاذ العنبري'' بھی مسعودی سے یہ روایت بیان کرتے ہیں، اور ان کا مسعودی سے سماع اختلاط سے پہلے کا ہے۔ الكواكب النيرات: ٥٤ (٣٥)
تنبیہ: اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر و اغلب لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے، اور کچھ لوگ جہنم میں ضرور جائیں گے، جو اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد جہنم سے نکال لیے جائیں گے، اور کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے بعد جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔
دیکھیں: (شعب الإيمان: ١/٣٤٢، السلسلة الصحيحة: ٢/٦٤٩)

حضور ﷺ نے فرمایا: یہی سوال میں نے جبریل سے پوچھا تھا، اس نے جواب دیا کہ یہ ایک راز ہے، جسے صرف اللہ اور اس کے چند اولیاء و اصفیاء جانتے ہیں، نہ کوئی فرشتہ اس راز سے آگاہ ہے اور نہ کوئی پیغمبر۔"

یہ بھی موضوع ہے۔ (تذکرۃ) ❶

دوسری حدیث:

◆ اس کے بعد ذکر اللہ اور تسبیح کے ثواب میں ایک حدیث بیان کی ہے کہ:

"اگر ایک بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ ذکرِ خدا میں کتنا لطف ہے، تو وہ سلطنت چھوڑ دے اور اگر اس کی ایک تسبیح کا ثواب عام دنیا پر تقسیم کر دیا جائے، تو ہر شخص کے حصے میں کائناتِ عالم کی تعداد سے دس گناہ زیادہ نیکیاں آئیں۔"

موضوع ہے۔ (تذکرۃ) ❷

یہاں صرف دو موضوع حدیثیں بیان کی ہیں، جن کو محدثین نے چھانٹ دیا ہے اور اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محدثین نے حدیث کی کس قدر حفاظت کی ہے!

تحریف حدیث کا چوتھا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

❶ العجالة في الأحاديث المسلسلة: ٨٩، كشف الخفاء (١٧٦٥)، الفوائد المجموعة: ٢٨٤، تذكرة الموضوعات: ١٨

❷ تذكرة الموضوعات: ٥٥، اس کی سند میں "سليمان بن عمرو النخعي" کذاب ہے۔ (التاريخ الكبير: ٢٨/٤، الجرح والتعديل: ١٣٢/٤، المجروحين: ٣٣٣/١، الكشف الحثيث: ١٣٠)

تحریف حدیث کا چوتھا سبب: بادشاہوں کی خوشامد

پہلی موضوع حدیث:

1 "يا معاوية أنت مني وأنا منك"

"اے معاویہ! تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے!" (موضوع۔ تذکرۃ) [1]

دوسری حدیث:

2 "أنا مدينة العلم وعلي بابها"

"میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ!" (موضوع۔ تذکرۃ) [2]

تیسری حدیث:

3 "لكل أمة فرعون وفرعون هذه الأمة معاوية"

"ہر امت کا ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے۔" [3]

(موضوع۔ تذکرۃ)

چوتھی حدیث:

4 "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للعباس إذا كانت خمس وثلاثين ومائة فالخلافة لك ولو لدك منهم السفاح والمنصور والمهدي"

"رسول اللہ ﷺ نے عباس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ ۱۳۵ھ میں خلافت تمہاری اولاد میں منتقل ہو جائے گی، ان سے ایک سفاح، منصور اور مہدی

---

1 العلل المتناهية: ١/٢٧٩، لسان الميزان: ٤/٢٥، تذكرة الموضوعات: ١٠٠

2 الموضوعات لابن الجوزي: ٢/١١٠، الفوائد المجموعة: ٣٤٨، تذكرة الموضوعات: ٩٦، السلسلة الضعيفة: ٦/٣٥٧،

3 العلل المتناهية: ١/٢٨٠، الفوائد المجموعة: ٤٠٧، تذكرة الموضوعات: ١٠٠

ہونگے۔ (موضوع۔ تذکرة) ❶

پانچویں حدیث:

5 ” إنّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كان يطير الحمام “

”رسول ﷺ کبوتر اڑایا کرتے تھے۔“ (موضوع۔ تذکرة) ❷

چھٹی حدیث:

6 ” إن اللعب بالحمام من عمل قوم لوط “

”کبوتر سے کھیلنا قوم لوط کا عمل ہے۔“ (موضوع۔ تذکرة) ❸

ساتویں حدیث:

7 ” أكرموا البقر فإنها سيدة البهائم مارفعت طرفها إِلى السماء منذ عبد العجل “

”گائے کی تعظیم کرو، کیونکہ وہ مویشیوں کی سردار ہے، اور جب سے یہودیوں نے گوسالہ پرستی کی، یہ بیچاری شرم سے اپنا سر آسمان کی طرف نہ اٹھا سکی۔“ (موضوع۔ تذکرة) ❹

---

❶ لسان الميزان: ١/١٧١، الكشف الحثيث: ٤٥، الفوائد المجموعة: ٤١٣، تذكرة الموضوعات: ١٠٠

❷ تاريخ بغداد: ١٣/٤٨٤، المنار المنيف: ٩٥، فتح المغيث: ١/٢٥٩، الفوائد المجموعة: ١٧٤، تذكرة الموضوعات: ١٥٤۔

❸ یہ مرفوع حدیث نہیں، بلکہ سفیان ثوری کا قول ہے دیکھیں: ذم الملاهي لابن أبي الدنيا: ٨٦ (٦٤) تذكرة الموضوعات: ١١٧٣، الطرق الحكمية: ٤٠٩

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے۔ (الكبائر للذهبي: ٥٥)۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا وہ کبوتری کے پیچھے لگا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان شیطانی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ أبوداود (٤٩٤٠)، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاویٰ ابن تيمية: ٣٢/٢٤٦

❹ الفوائد المجموعة: ١٧١، تذكرة الموضوعات: ١٥٢۔١٥٣

آٹھویں حدیث:

[8] "من لم يكن عنده صدقة فليلعن اليهود"

''جس شخص کے پاس صدقہ کے لیے کوئی چیز نہ ہو، وہ یہودیوں پر لعنت کرے۔'' (موضوع۔تذکرۃ) [1]

ان احادیث کا بھی تحریف حدیث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ موضوع ہیں۔ محدثین نے ان کو الگ کر دیا ہے۔ یہ حفاظت حدیث کی دلیل ہے نہ کہ تحریف کی۔

پھر لکھتے ہیں:

پنجم: فرقہ پرستی

پہلی موضوع حدیث:

(1) "صنفان من أمتي ليس لهما نصيب في الإسلام القدرية والمرجية" [2]

''میری امت کے دو فرقوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، قدریہ اور مرجیہ۔''

---

[1] نیز دیکھیں: الکامل لابن عدي :٤/٢٠٠٠، ٦/٣٠٣، المجروحين:٢/١١، تاريخ بغداد: ١٤/٢٦٩، الموضوعات لابن الجوزي: ٢/٤٨٩، الفوائد المجموعة:٥٠٧، كشف الخفاء:(٢٦٠٥)، تذکرۃ الموضوعات:١٦، السلسلة الضعيفة:١/٢١٩ (١٠٤)

[2] سنن الترمذي: أبواب القدر، باب ما جاء في القدر، رقم الحديث(٢١٤٩)، و قال: " هذا حديث غريب حسن صحيح" سنن ابن ماجه: باب في الإيمان ، رقم الحديث (٧٣) مسند عبد بن حميد: ٢٠١ (٥٧٩) اس کی سند میں: "علی بن نزار" اور "نزار بن حیان" ضعیف ہیں، (الجرح والتعديل:٦/٢٠٧، الكامل في الضعفاء :٥/١٩٥، المجروحين لابن حبان:٢/١١٢، ٣/٥٦، الكشف الحثيث: ٢٦٦) یہ حدیث اس کے علاوہ بھی دیگر اسانید کے ساتھ مروی ہے، لیکن ان میں شدید ضعف پایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: العلل المتناهية: ١/١٤٧، ظلال الجنة للألباني: ١٤٩

دوسری حدیث:

② "القدرية مجوس هٰذه الأمة...... الخ"

"قدریہ اس امت کے مجوس ہیں، اگر بیمار ہوں، تو ان کی عیادت نہ کرو اور اگر مر جائیں، تو جنازہ نہ پڑھو!"❶

تذکرۃ الموضوعات میں ان کو موضوع کہا گیا ہے۔❷

مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں موضوع نہیں، پہلی حدیث حسن ہے اور دوسری بھی قابل استشہاد ہے۔

---

❶ سنن أبي داود: كتاب السنة، باب في القدر، رقم الحديث (٤٦٩١)، المستدرك: ١/١٥٩ (٢٨٦)، سنن البيهقي: ١٠/٢٠٣ (٢٠٦٥٨) اس سند میں "أبو حازم سلمة بن دينار" کا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔(تهذيب الكمال: ١١/٢٧٣، جامع التحصيل: ١٨٧) نیز اس حدیث کے لیے دیکھیں: سنن ابن ماجه: باب في القدر، رقم الحديث (٩٢)، المعجم الأوسط: ٤/٣٦٨، المعجم الصغير: ١/٣٦٨، (٦١٥) یہ حدیث دیگر اسانید کے ساتھ بھی مروی ہے۔ دیکھیں :مسند أحمد: ٥/٤٠٦، المعجم الأوسط: ٣/٦٥، ٤/٢٢٦، ٧/٣٦، المعجم الصغير: ٢/٧١، سنن البيهقي: ١٠/٢٠٣، مسند الشاميين: ٣/٣٤٣، تاريخ بغداد: ١٤/١١٣، الكامل في الضعفاء: ٧/٧٧، اعتقاد أهل السنة للالكائي: ٤/٦٣٩۔ الإبانة لابن بطة: ٢/٩٥، الشريعة: ٢٠٤، امام ابن جوزی نے محولہ بالا بعض اسانید کے پیش نظر اس حدیث کو ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔(العلل المتناهية: ١/١٥١، الموضوعات: ١/٤٥١، جس پر حافظ علائی اور امام سیوطی نے ان کا تعاقب کیا، اور حافظ علائی نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔ مزید برآں علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ظلال الجنة: ١٦٢۔

❷ تذكرة الموضوعات: ١٥۔

تیسری حدیث:

③ "أول ما خلق اللّٰه العقل" (موضوع۔ تذکرة) ❶

چوتھی حدیث:

④ "القرآن کلام اللّٰه غیر مخلوق فمن قال غیر هذا فاقتلوه......" ❷

پانچویں حدیث:

⑤ "من قال القرآن مخلوق فقد کفر" (موضوع۔ تذکرة) ❸

"قرآن غیر مخلوق ہے (قدیم ہے) جو اسے مخلوق کہے، اسے مار ڈالو، جو شخص قرآن کو غیر مخلوق سمجھے، وہ کافر ہے۔" (موضوع ۔ تذکرة)

مسئلہ خلقِ قرآن:

اس حدیث کے آگے محاکمہ کرتے ہیں:

"بات سیدھی سی تھی، جس پر غور نہ کیا گیا، چیزیں دو تھیں: وصف کلام اور کلام، گفتگو کی اہلیت یا وصف الگ چیز ہے اور گفتگو کرنا الگ۔ ہر آدمی

---

❶ الفوائد المجموعة: ٤٧٧، الدرر المنتثرة: ٣٦٧، تذکرة الموضوعات: ٢٨۔٢٩

❷ تذکرة الموضوعات: ٧٧

❸ کشف الخفاء (١٨٦٩)، الفوائد المجموعة: ٣١٣، تذکرة الموضوعات: ٧٧، ایک حدیث کو علامہ طاہر پٹنی نے امام سیوطی کی کتاب سے نقل کیا ہے اور اس حدیث کے بارے میں امام سیوطی کا قول نقل کیا ہے: "لایصح" اس کے بعد علامہ طاہر پٹنی فرماتے ہیں: "قلتُ له طرق" (تذکرة الموضوعات: ٧٧) لیکن اس حدیث کی اسانید میں وضاع اور کذاب راوی ہیں، جس کی بناء پر امام بیہقی، سخاوی اور شوکانی وغیرھم نے اس کو "موضوع" قرار دیا ہے، امام شوکانی فرماتے ہیں: "و قد أورده صاحب اللآلیء فی أول کتابه و ذکر له شواهد و أطال في غیر طائل فالحدیث موضوع تجاراً علی وضعه من لا یستحي من اللّٰه تعالی......"

وصف کلام (گفتگو کی اہلیت) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ مضامین، اشعار اور کتابیں بعد میں لکھتا ہے، وصف کلام پیدائشی ہے، کلام اور نتائجِ کلام بعد کی پیداوار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وصف کلام اللہ کی طرح قدیم ہے، لیکن نتائج کلام (موسیٰ سے کلام، تورات، انجیل، قرآن وغیرہ) بعد کی پیداوار ہیں، اور اس لئے حادث ہیں۔" (دو اسلام: ۲۴۳)

غلط فہمی کا ازالہ:

اس کا مطلب یہ ہوا کہ معتزلہ جو مخلوق کہتے تھے، وہ نتائج کو مخلوق کہتے تھے، اور امام احمد رحمہ اللہ جو غیر مخلوق کہتے تھے۔ وہ وصف کلام بمعنی اہلیت کلام کے اعتبار سے کہتے تھے، یعنی دونوں کا مطلب الگ الگ تھا۔ نزاع لفظی تھا، اس کا مطلب قرآن سے کچھ اور تھا اور امام احمد رحمہ اللہ کا کچھ اور، یعنی بے وقوفوں کی منڈی تھی، جو ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھا نہ سکے۔ حالانکہ یہ بیّن بات ہے کہ نزاع ایک چیز میں تھا۔ قرآن میں تھا، نہ وصف کلام میں۔ نزاع کی وجہ یہ بات تھی کہ معتزلہ چونکہ اس قرآن کو حادث سمجھتے تھے، اس لئے وہ اللہ کے ساتھ اس کا قیام محال جانتے تھے۔ اس واسطے ان کے نزدیک قرآن اللہ تعالیٰ سے منفصل چیز سمجھا جاتا تھا اور جو اللہ تعالیٰ سے منفصل ہو، وہ مخلوق ہوتی ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ اس منطق کے قائل نہ تھے، وہ کہتے تھے، قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا وصف ہے، بس ضروری ہے کہ اس کے ساتھ قائم ہو، پس جو چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوگی، وہ ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی طرح غیر مخلوق ہو۔ کیونکہ مخلوق اس چیز کو کہتے ہیں، جو حادث اور منفصل ہو۔ گویا نزاع صرف یہ تھا کہ کلام باری، باری تعالیٰ سے منفصل ہے یا متصل۔ معتزلہ منفصل کہتے تھے اور امام احمد رحمہ اللہ متصل۔ متصل ماننے سے غیر مخلوق ہوگا اور منفصل ماننے سے مخلوق!

چھٹی موضوع حدیث:

اس کے بعد رافضیوں کے متعلق ایک حدیث کا ذکر ہے:

⑥ "الرافضة الذين رفضوا ديني"

رافضہ وہ ہیں، جنہوں نے میرے دین کو چھوڑ دیا۔ (موضوع۔ تذکرہ) [1]

ساتویں حدیث:

ایک اور حدیث:

⑦ "اتقوا اليهود والهنود"

یہود اور ہنود سے بچو! (یہ بھی "موضوع" ہے) [2]

آٹھویں حدیث:

اور ایک وضعی حدیث:

⑧ "سراج أمتي أبو حنيفة"

"ابوحنیفہ میری امت کا چراغ ہے!" (موضوع) [3]

ایک اور موضوع حدیث یہ ہے:

نویں حدیث:

⑨ "سيكون من أمتي رجل يقال لهٗ محمد بن إدريس أضر على أمتي من إبليس"

"میری امت میں ایک شخص محمد بن ادریس ہوگا، میری امت پر وہ ابلیس

---

[1] تذكرة الموضوعات: ٩٣

[2] كشف الخفاء (٩٨)، تذكرة الموضوعات: ١١٤

[3] كشف الخفاء (٥٣)، الفوائد المجموعة: ٤٢٠، تذكرة الموضوعات: ١١١، السلسلة الضعيفة: ٢/٤٢

سے بھی زیادہ مضر ہوگا۔ ❶

آگے لکھتے ہیں:

ششم: امتیاز رنگ ونسل

پہلی حدیث:

[1] "إياكم وزي الأعاجم"

کہ "تم لوگ اہل عجم کے لباس سے بچو!"

ترجمہ غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: "عجمی وضع اختیار نہ کرو۔"

(موضوع۔ تذكرة) ❷

دوسری حدیث:

ایک اور حدیث:

[2] "فارسی کلام، اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، خوزیہ شیطانی کلام ہے، بخاری دوزخیوں کی کلام ہے، جنتیوں کی کلام عربی ہے۔"

(یہ حدیث بھی "موضوع" ہے۔) ❸

آگے تحریف کا ساتواں سبب لکھتے ہیں:

---

❶ مصادرِ سابقہ

❷ یہ مرفوع حدیث نہیں، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور اس کی سند "صحیح" ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد: ۱/ ۴۳ (۳۰۱)، صحیح ابن حبان: ۱۲/ ۲۶۸ (۵۴۵۴) مسند أبي یعلی: ۱/ ۱۸۹ (۲۱۳)، شرح معاني الآثار: ۴/ ۲۷۵، سنن البیهقي: ۱۰/ ۱۴ (۱۹۵۲۲)، مسند ابن الجعد: ۱۵۶ (۹۹۵)، تذكرة الموضوعات: ۱۰۳۔

❸ المجروحین: ۱/ ۱۲۹، الموضوعات لابن الجوزي: ۱/ ۱۵۸، لسان المیزان: ۱/ ۴۰۶، تذكرة الموضوعات: ۱۱۳، اس کی سند میں اِسماعیل بن زیاد کذاب اور متروک ہے۔

ہفتم: ملا در مدح خود گوید

پہلی حدیث:

① ”جو عالم کی زیارت کرے، اس نے میری زیارت کی، جو عالم سے مصافحہ کرے، اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔“ (موضوع) ❶

دوسری حدیث:

② کسی عالم کی مجلس میں حاضری ہزار رکعات نماز، ہزار مریضوں کی عیادت، ہزار جنازوں میں شامل ہونے سے بہتر ہے۔“ (موضوع) ❷

تیسری حدیث:

③ ”علماء أمتي كأنبياء بني اسرائيل“

”میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔“ (موضوع) ❸

چوتھی حدیث:

④ ”الشيخ في قومه كالنبي في أمته“

قوم میں شیخ ایسا ہے، جیسے کہ امت میں نبی!۔ (موضوع) ❹

---

❶ تاريخ جرجان: ١٩٧، الفوائد المجموعة: ٢٨٥، كشف الخفاء (٢٤٩٤) تذكرة الموضوعات: ١٩، السلسلة الضعيفة: ٣٣٤/٧۔

❷ الموضوعات لابن الجوزي: ٣٦٢/١ (٤٤٤)، لسان الميزان: ١٩٣/١، الفوائد المجموعة: ٢٨٥، كشف الخفاء (١١٤٦)، تذكرة الموضوعات: ٢٠

❸ المقاصد الحسنة: ٤٥٩، (٧٠٢)، الدرر المنتثرة: ٣١٢، كشف الخفاء (١٧٤٤)، الفوائد المجموعة: ٢٨٦، السلسلة الضعيفة: ٦٧٩/١ (٤٦٦)

❹ تهذيب التهذيب: ٢٨٩/٥، الدرر المنتثرة: ٢٨٠، كشف الخفاء: ٥٦٢/٢، الفوائد المجموعة: ٢٨٦، تذكرة الموضوعات: ٢٠

پانچویں حدیث:

⑤ "مداد العلماء أفضل من دم الشهداء"

علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔ (موضوع) ❶

چھٹی حدیث:

⑥ "اعتبروا عقل الرجل في طول لحيته"

جتنی داڑھی لمبی ہو، اتنی ہی عقل زیادہ ہوتی ہے۔ (موضوع) ❷

ساتویں حدیث:

⑦ "السواك يزيد الرجل فصاحة"

مسواک سے فصاحت بڑھتی ہے۔ (موضوع) ❸

آٹھویں حدیث:

⑧ جن کی عقل نہیں، ان کا دین نہیں۔ (موضوع) ❹

نویں حدیث:

⑨ زکوۃ علماء کو دیا کرو!۔ (موضوع) ❺

---

❶ كشف الخفاء (٢٢٧٦)، الدرر المنتثرة: ٣٩٠، الفوائد المجموعة: ٢٨٧، تذكرة الموضوعات: ٢٣، یہ حسن بصری کا قول ہے، جسے معترض حدیث بنا کر پیش کر رہے ہیں!!

❷ كشف الخفا (١٦٧٧)، تذكرة الموضوعات: ٣٠، السلسلة الضعيفة: ١/ ٤٤١

❸ العلل المتناهية: ١/ ٣٣٦، الفوائد المجموعة: ١١، كشف الخفاء (١٤٩٤) السلسلة الضعيفة: ٦٤٢۔

❹ شعب الإيمان: ٤/ ١٥٧، لسان الميزان: ٢/ ٢٨، ضعيف الجامع الصغير: ٦٠٠ (٤١١٦)

❺ لسان الميزان: ٢/ ٢٥٥، الفوائد المجموعة: ٦٠

دسویں حدیث:

⑩ کسی بھوکے کو کھلانا سب سے بہتر ہے، جو پیٹ بھر کر کھلائے یا پانی سے سیراب کرے، اس کے اور آگ کے مابین سات گڑھے بن جائیں گے۔ ایک ایک گڑھا پانچ سو سال کا ہوگا۔ (موضوع) ❶

گیارہویں حدیث:

⑪ ”کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یحب الحلواء“ ❷

”آنحضرت ﷺ میٹھی چیز کو پسند فرماتے تھے۔“

یہ حدیث صحیح ہے، اس میں کوئی چیز خلافِ عقل، قرآن یا فطرت نہیں، لہٰذا اس کو یہاں بیان کرنا بے معنی ہے۔

اس کے آگے بیان کیا ہے:

بارہویں حدیث:

⑫ ”قلب المؤمن حلو ویحب الحلاوة ومن حرمها علیٰ نفسه

---

❶ المستدرك: ٤/١٤٤ (٧١٧٢)، المعجم الأوسط: ٦/٣٢٠، شعب الإیمان: ٣/٢١٧، اس کی سند میں ”رجاء بن أبي عطاء المصري“ ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: صاحب موضوعات“ ابن حبان بھی فرماتے ہیں: ”یروي الموضوعات“ اس کے بعد مذکورہ بالا حدیث کو بطور مثال ذکر کیا ہے۔ (المجروحین: ١/٣٠١، لسان المیزان: ٢/٤٥٦) لہٰذا یہ حدیث ”موضوع“ ہے۔ دیکھیں: الفوائد المجموعة: ٧٥، السلسلة الضعیفة: ١/١٧٠

تنبیه: اس کا یہ جملہ ”کسی بھوکے کو کھانا کھلانا سب سے بہتر ہے۔“ مذکورہ بالا ”موضوع“ حدیث کا حصہ نہیں ہے۔

❷ صحیح البخاري: کتاب الأطعمة، باب الحلواء والعسل، رقم الحدیث (٥١١٥)، صحیح مسلم: کتاب الطلاق، باب وجوب الکفارة، رقم الحدیث (١٤٧٤)

فقد عصی اللہ ورسولہ"❶

"مومن کا دل میٹھا ہے اور مٹھاس کو چاہتا ہے، جو اس کو اپنے آپ پر حرام کرے، اس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی۔"

تیرھویں حدیث:

⑬ "جو شخص اپنے بھائی کو حلوے کا ایک لقمہ کھلائے گا، اللہ اسے محشر کی گرمی سے بچائے گا۔"❷

چودہویں حدیث:

⑭ "شہد کو کھاؤ، خدا کی قسم جس گھر میں شہد ہو گا،اس گھر کے فرشتے اس کیلئے استغفار کریں گے۔ اگر شہد کھائی جائے، تو اس کے جسم کو آگ نہیں چھوئے گی۔"❸

یہ تینوں روایتیں موضوع ہیں۔ محدثین نے ان کو موضوع سمجھ کر چھوڑا، اور چھانٹ دیا۔ یہ حفاظت حدیث کی دلیل ہے!

اب مرغ کے بارے میں موضوع روایت بیان کرتے ہیں:

پندرہویں حدیث:

⑮ "سفید مرغا میرا دوست ہے اور میرا دوست جبرائیل کا دوست ہے۔"❹

---

❶ یہ حدیث "موضوع" ہے۔شعب الإیمان:٥/٩٩، تاریخ بغداد:٣/١١٣، (١١٢٢)، الموضوعات لابن الجوزي: ٣/١٦٣ (١٣٧٧) ، لسان المیزان: ٥/٢١٤، السلسلة الضعیفة (٩/٦٦)

❷ الفوائد المجموعة:١٨٢، کشف الخفاء (٢٦٠٣)

❸ تاریخ جرجان:٢٠٥، الموضوعات لابن الجوزي: ٣/١٦٥، الفوائد المجموعة (١٧٩)

❹ الموضوعات لابن الجوزي:٣/١٣٨، تذکرة الموضوعات: ١٥٣۔

⑯ جو شخص سفید مرغا رکھے گا، وہ شیطان اور کاہن کے شر سے محفوظ رہے گا۔“
(موضوع ہے) ❶

سولویں حدیث:

اس کے متعلق بھی ایک مُوضوع روایت لکھ کر، اس کا ذمہ دار حسبِ عادت ملا کو ٹھہرایا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

⑰ ”نفقة الدرهم في سبيل الله بسبع مائة درهم و نفقة درهم في خضاب بسبعة آلاف“

کہ ”فی سبیل اللہ ایک درہم (خرچ کرنا) سات سو درہم کے برابر ہے، اور خضاب کا ایک درہم سات ہزار درہم کے برابر ہے۔“ ❷

اس کے بعد حسن پرستی کے متعلق لکھتے ہیں:

سترویں حدیث:

⑱ ”النظر إلى المرأة الحسناء يزيد في البصر“

”خوش شکل عورت کی طرف دیکھنے سے نظر بڑھ جاتی ہے۔“ ❸

اٹھارویں حدیث:

⑲ ”نمکین چہروں اور سیاہ آنکھوں سے محبت کرو، اللہ کسی ملیح چہرے کو آگ سے

❶ الموضوعات لابن الجوزي:٣/١٣٥، تذكرة الموضوعات: ١٥٣

❷ تذكرة الموضوعات: ١٦٠

❸ الموضوعات لابن الجوزي: ١/٢٥٢، الفوائد المجموعة :٢١٧، ضعيف الجامع الصغير (٥٩٩١)

عذاب نہیں کرے گا۔" ❶

یہ دونوں حدیثیں موضوع ہیں۔ (تذکرہ) ❷

اس باب میں موضوع حدیثیں بیان کرنے سے تو حفاظتِ حدیث کی تائید ہوتی ہے، پھر معلوم نہیں کہ مصنف کو ان کے لکھنے میں کیا مزا آتا ہے۔ شاید وہ ان حدیثوں پر مدت تک عمل درآمد کرتے رہے ہوں!

آگے آٹھواں سبب بیان کرتے ہیں:

ہشتم: حقائق حیات

" إن الورد من عرق النبي صلى الله عليه وسلم أو من عرق البراق" (موضوع۔ تذکرة) ❸

"گلاب کا پھول آنحضرت ﷺ کے پسینہ سے یا براق کے پسینہ سے ہے۔"

گندم کے متعلق:

"شرار أمتي يأكلون الحنطة"

"میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں، جو گندم کھاتے ہیں۔" ❹

(موضوع، تذکرة)

"ہر نبی پر وحی عربی میں آتی رہی، پھر وہ ترجمہ کرکے اپنی قوم کی زبان میں

---

❶ سؤالات حمزة السهمي للدارقطني: ٢١١ (٢٨٤)، تاريخ بغداد: ٣٨٢/٧، الإرشاد للخليلي: ٥٣١/٢، الموضوعات لابن الجوزي: ٢٤٩/١، لسان الميزان: ٢٣٥/٦، الفوائد المجموعة: ٢١٨، السلسلة الضعيفة: ٢٥٦/١ (١٣١)

❷ تذكرة الموضوعات: ١٦٢

❸ كشف الخفاء (٧٩٨)، الدرر المنتثرة: ٥٠٩، الفوائد المجموعة: ١٩٦، تذكرة الموضوعات: ١٦١

❹ تذكرة الموضوعات: ١٥١

ادا کرتا رہا۔‘‘ [1]

جب محدثین نے ان احادیث کو چھانٹ دیا ہے، تو ان کا تعلق تحریف سے نہ ہوا، بلکہ حدیث کی حفاظت سے ہوا۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

سوال: ’’بعض حضرات کہتے ہیں کہ تم صحیح اور غلط کی الجھن میں کیوں پڑے ہو، جو قرآن کے مطابق ہو لے لو، جو مخالف ہو، رد کر دو۔‘‘

جواب: ’’جو مخالف ہے، وہ ہر طبقہ کے ہاں مردود ہے۔ اور جو قرآن کے موافق ہے، اس کی ضرورت ہی نہیں۔‘‘ (دو اسلام: ۱۵۸)

جواب

احادیث تین قسم پر ہیں:

اول: مخالف۔

دوم: وہ جو قرآن کی تفسیر اور بیان ہیں۔

سوم: وہ جو قرآن ہی کا مضمون بیان کرتی ہیں۔

دوسری قسم کی تو ضرورت ہے، جیسا کہ نماز کے بارہ میں آپ نے بھی اقرار فرمایا ہے۔ اور جو حدیث قرآن کے مضمون ہی کو بیان کرتی ہے، اگرچہ اس مسئلہ مذکور کے ثابت کرنے کیلئے اس کی ضرورت نہیں، مگر بعض وقت قرآن اور حدیث کے بیان میں اطلاق وتقیید وغیرہ کا فرق ہوتا ہے، جس سے بعض نکات مفید مطلب ہوتے ہیں۔

---

[1] الموضوعات لابن الجوزي: ۱/۱۵۹، امام سیوطی نے تعاقب کرتے ہوئے، اس حدیث کو موضوع کی بجائے ’’ضعیف‘‘ قرار دیا ہے۔(اللآلیء المصنوعة: ۱/۱۱) نیز دیکھیں: تذکرة الموضوعات: ۱۱۳

اس سے آگے جو کہا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ کسی حدیث کا قرآن کے موافق ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا، جو حدیث قرآن کے موافق ہو، وہ صحیح ہو۔ حالانکہ بہت سی احادیث ایسی ہیں، جن کا مضمون قرآن سے ملتا ہے، مگر علماء نے ان کو اس بناء پر موضوع قرار دیا ہے کہ یہ آنحضرت (ﷺ) کی بیان کردہ نہیں۔

چند موضوع احادیث:

اس کے بعد مندرجہ ذیل حدیثیں لکھی ہیں:

حدیث	کس نے وضعی قرار دی	حوالہ
① "الإيمان عقد بالقلب و إقرار باللسان" ایمان دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔	ابن جوزی	تذکرة [1]
② "طلب العلم فريضة على كل مسلم" علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے۔	ابن راھویہ، بخاری، أبوعلی نیشا پوری، بیہقی	تذکرة [2]

[1] سنن ابن ماجه: باب في الإيمان ، رقم الحديث (٦٥) اس کی سند میں "عبد السلام بن صالح أبو الصلت الحصروي" ہے، جس نے یہ حدیث وضع کی ہے، جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔(تهذيب الكمال: ٨١/١٨، الكشف الحثيث (١٦٧) نیز دیکھیں: الموضوعات لابن الجوزي: ١٨٥/١، تذكرة الموضوعات: ١١

[2] سنن ابن ماجه: باب فضل العلماء، رقم الحديث (٢٢٤)، المعجم الكبير: ١٩٥/١٠، ←

❸ "اطلبوا العلم ولو بالصين" ابن عدی، ابن جوزی، تذکرۃ[1]
"تلاش علم میں چین تک جاؤ۔" سیوطی، ابن حبان

❹ "من عرف نفسه عرف ربه" ابن تیمیہ تذکرۃ[2]
جو اپنے آپ کو پہچان لے، اس
نے اپنے رب کو پہچانا۔

← المعجم الأوسط:١/٧، المعجم الصغير:٣٦، مسند أبي يعلى: ٥/٢٢٣، ٥/٢٨٣، ٧/٩٦، مسند البزار:١/١٧٢، شعب الإيمان:٢/٢٥٣، الفوائد للرازي:١/٣٢، یہ حدیث کئی اسانید کے ساتھ مروی ہے، امام سیوطی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے پچاس طرق جمع کیے ہیں۔ امام مزی، ذہبی، زرکشی، سیوطی، سخاوی، البانی اور دیگر اہل علم ؒ نے اس حدیث کو صحیح اور حسن قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: المقاصد الحسنة: ٤٤٠،(٦٦٠)، الدرر المنتثرة :٢٩٩، كشف الخفاء(١٦٦٥)، تدريب الراوي :٢/١٧٤، تخريج أحاديث مشكلة الفقر:٤٨ (٨٦) ، السلسلة الضعيفة:١/٦٠٤

تنبیہ: امام سخاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے آخر میں بعض لوگ " ومسلمة" کا اضافہ کر دیتے ہیں، جب کہ کسی بھی سند میں یہ الفاظ وارد نہیں ہیں۔(المقاصد الحسنة:٦٦٢) نیز کسی امام نے اس حدیث کو موضوع قرار نہیں دیا، بلکہ امام احمد، بیہقی ،ابن راہویہ اور ابو علی نیشاپوری نے یہ کہا ہے کہ اس کی اسانید ضعیف ہیں، اور امام سخاوی کے نزدیک یہ حدیث مقبول ہے۔ لہٰذا ان کی طرف تضعیف کی نسبت غلط ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

❶ مسند البزار:١/١٧٥، المجروحين:١/٣٨٢، الكامل في الضعفاء:٤/١١٨، ضعفاء العقيلي: ٢/٢٣٠، الموضوعات لابن الجوزي:١/٣٤٧، لسان الميزان:١/١٩٣، ٦/٣٠٤، الدرر المنتثرة: ٩٠، تذكرة الموضوعات: ١٧، السلسلة الضعيفة:١/٦٠٠۔

❷ الدرر المنتثرة: ٤١٧، كشف الخفاء (٢٥٣٢)، المقاصد الحسنة:٦٥٧ (١١٤٩)، تذكرة الموضوعات:١١، السلسلة الضعيفة: ١/١٦٥ (٦٦)

⑤ "من سرّالمؤمن فقد سراللّٰہ" سیوطی تذکرة ❶

جس نے کسی مومن کو خوش کیا، اس نے اللہ کو خوش کیا۔

آئمہ فن کی تصانیف میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، حدیث کا مضمون درست ہے، تعلیم قرآن کے عین مطابق ہے اور پھر بھی غلط! اب فرمایئے حدیث کو جانچنے کے لئے پیانہ کہاں سے لائیں؟" (دو اسلام: ١٦١)

حدیث کو جانچنے کا پیانہ وہی ہے، جو محدثین نے بیان کیا ہے اور اسی پیانہ کے ساتھ حدیث کو پرکھا جا سکتا ہے، اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ حدیثیں قرآن کی کن آیات کے مطابق ہیں، صرف دعویٰ ہی دعویٰ!!

---

❶ المجروحین: ١/٢١٦، العلل المتناهية: ٢/٥١٤، لسان الميزان: ٢/١٠٦، الكشف الحثيث: ٨٤، الفوائد المجموعة: ٥٠٢، تذكرة الموضوعات: ١٤۔

ساتواں باب

''موطأ پر ایک نظر''

پہلا اعتراض:

''امام مالک بن انس (۹۳ھ۔ ۱۷۹ھ) نے جب پہلی مرتبہ مؤطا کو مدون کیا، تو اس میں دس ہزار احادیث درج کیں، بعد میں اس پر نظر ثانی کی، تو آٹھ ہزار سات سو اسی احادیث مشکوک نظر آئیں اور انہیں نکال دیا۔ صرف ایک ہزار سات سو بیس رہنے دیں۔ انہوں نے انتخاب احادیث کیلئے کون سا معیار استعمال کیا، ہم نہیں جانتے۔ اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار تمام شبہات سے وراتر تھا اور انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کیلئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے۔ لیکن پونے دوسو برس کا عرصہ گذر چکا تھا، احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں، اس ذخیرہ سے قولِ رسول کو تلاش کرنا، اگر ناممکن نہیں، تو دشوار ضرور تھا۔

ہم ''مؤطا'' کی تعظیم ضرور کرتے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے مندرجات واقعی اقوالِ رسول ہیں اور خصوصاً ان حالات میں کہ اس کی بعض روایات محلِ نظر ہیں۔ مثلاً مؤطا میں درج ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو ضروری ہے اور ''إذا قمتم

إلى الصلوٰة" کی تفسیر "أي من المضاجع" یعنی "النوم" دی ہوئی ہے۔ ❶ لیکن صحیح بخاری ❷ کتاب الوضوء میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث دی ہوئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جاگے، صلوٰۃ تہجد ادا کی۔

"ثم اضطجع فنام حتیٰ نفخ ثم أتاه المنادي فقام إلى الصلوٰة فصلى ولم يتوضأ"

''پھر بستر پر دراز ہو گئے، پھر سو گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد نماز کیلئے بلانے والا آیا، آپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیئے اور وضو کے بغیر نماز پڑھ لی۔'' (دو اسلام: ۱۶۳)

جواب:

مصنف کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ "مؤطا" میں جو قرآن کی تفسیر نیند سے اٹھنے کے ساتھ کی گئی ہے، درست نہیں۔ کیونکہ بخاری کی روایت کے خلاف ہے۔ اس اعتراض پر بچند وجوہ کلام ہے:

اول: یہ کہ امام مالک نے نیند سے وضو نہ ٹوٹنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیا ہو گا۔

دوم: یہ کہ امام مالک کے نزدیک بھی مطلق نیند ناقض نہیں، بلکہ وہ نیند ہے، جو استرخاءِ مفاصل کا باعث ہو۔ اور انبیاء علیہم السلام کی نیند چونکہ مستغرق نہیں ہوتی، جیسا

---

❶ صحيح البخاري : كتاب صفة الوضوء، باب وضوء الصبيان......، رقم الحديث (۸۲۱)

❷ الموطا: ۱/۲۱ (۳۹)، یہ زید بن اسلم تابعی کا قول ہے۔ امام مالک نے مرفوع حدیث سے تفسیر نقل نہیں کی۔ کسی تابعی کا قول مرفوع حدیث کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا!

کہ حدیث میں ہے: "تنام عينه ولا ينام قلبه" (بخاري) [1]
"آپ کی نیند آنکھ بند کرنے تک ہوتی تھی، اس میں دل پر اثر نہیں ہوتا تھا۔"
سو: یہ اعتراض بخاری کی حدیث کی وجہ سے ہوا، نہ کہ قرآن کی کسی دوسری آیت سے۔

دوسرا اعتراض:

اس کے بعد چند اور احادیث بیان کی ہیں:

"من قبل امرأته أو مسها بيده فعليه الوضوء" [2]
"جو اپنی بیوی کو بوسہ دے، یا ہاتھ سے چھوئے، تو اس پر وضو ہے۔"
(موطا: ۳۳)

لیکن اسی صفحہ پر ہے:

"عن عائشة أن النبي قبّل بعض نسائه ثم خرج إلى الصلوٰة ولم يتوضأ" [3]

---

❶ صحيح البخاري: كتاب التوحيد: باب قوله ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ رقم الحديث (٧٠٧٩)

❷ الموطا: ١/٤٣ (٩٥) یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

❸ سنن أبي داود: كتاب الطهارة، باب الوضوء من الطهارة، باب ما جاء في ترك الوضوء من القبلة، رقم الحديث(٨٦)، سنن ابن ماجه: كتاب الطهارة، باب الوضوء من القبلة، رقم الحديث(٥٠٢) سنن النسائي: كتاب الطهارة، باب ترك الوضوء من القبلة(١٧٠) مسند أحمد:٦/٢١٠ (٢٥٨٠٧)، سنن الدارقطني:١/١٣٧، سنن البيهقي:١/١٢٥، المعجم الأوسط:٥/٦٦، مصنف ابن أبي شيبة:١/٤٨، مسند إسحاق بن راهويه:٣/٩٩ (٥٦٦)، یہ حدیث "صحیح" ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الراية:١/٨٢، التلخيص الحبير:٣/١٣٦، الجوهر النقي:١/١٢٤، إنجاز الحاجة شرح سنن ابن ماجه:٣/٦٢٨،
تنبیہ: برق صاحب کا کہنا کہ "لیکن اسی صفحہ پر ہے" درست نہیں، کیونکہ حدیثِ عائشہ "موطا" میں نہیں ہے۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک بیوی کا بوسہ لیا، پھر نماز کیلئے نکلے اور وضو نہ کیا۔"

حضور کا حکم وہ اور عمل یہ!" (دو اسلام : ۱۶۳)

جواب:

مگر مصنف نے "مؤطا" کو اچھی طرح نہیں دیکھا، وضو ٹوٹنے کا جس میں ذکر ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کا حکم نہیں، بلکہ صحابی کا قول ہے، یہاں پہلا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ امت کے لئے وضوء...... [1]

تیسرا اعتراض: قرآن میں ردّ و بدل

"لو لا أن يقول الناس زاد عمر في كتاب الله لكتبتها الشيخ والشيخة إذا زنيا فارجموهما فإنا قد قرأناها" (موطا) [2]

"اگر پڑھتے رہے، تو نکالی کس نے؟ اور اگر نکال دی گئی تھی، تو اللہ کا وعدہ حفاظتِ قرآن کیا ہوا۔ اس موضوع پر ایک حدیث "بخاری" میں بھی موجود ہے:

" عن عمر بن الخطاب قال: إن الله بعث محمداً صلى الله عليه وسلم وأنزل عليه الكتاب فكان فيما أنزل آية الرجم" [3]

---

[1] یعنی امت کے لیے وضوء کا حکم ہے اور عدم وضوء کو رسول اکرم ﷺ کا خاصہ قرار دیا جائے۔

[2] الموطا: ۸۲/۲ (۱۵۰۶)

[3] صحيح البخاري: كتاب الاعتصام، باب ما ذكر النبي ﷺ و حض على اتفاق أهل العلم، رقم الحديث (٦٨٩٢)

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا اور اس پر ایک کتاب نازل کی، جس میں ''آیت رجم'' بھی موجود تھی۔''
یعنی امام بخاری نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن میں آیت رجم موجود تھی، لیکن یہ نہیں بتایا وہ کہاں گئی؟'' (دواسلام : ١٦٩)

جواب:

''مؤطا'' کی روایت کا ایک مطلب ہے کہ یہ حکم آنحضرت ﷺ نے نافذ کیا اور ہم نے بھی پڑھا۔ یعنی یہ حکم بہت اہم ہے، جس کا آپ نے عام اعلان کیا تھا اور اس پر عمل کیا، مگر یہ حکم چونکہ قرآن میں صاف طور پر مذکور نہیں، بلکہ اس سے مستنبط ہے۔ یعنی سورۃ مائدہ ''آیت محاربہ'' سے یہ حکم نکلتا ہے۔[1] اگر میں اس کو قرآن کے ساتھ لکھ دوں، تو لوگ کہیں گے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کر دیا ہے، اس لئے میں نہیں لکھتا، اگر یہ خطرہ نہ ہوتا، بلکہ لوگ اس حکم کو بدستور قرآن سے مستنبط ہی سمجھتے رہتے، تو اس کو قرآن مجید کے کنارے پہ لکھ دیتا۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کی آیت ہے، مگر میں ہی اس کو قرآن کی آیت سمجھتا ہوں۔ دوسرا کوئی شخص بھی میرے ساتھ اس کو قرآن کی آیت خیال نہیں کرتا، اگر میں اپنے خیال کے مطابق اس کو قرآن میں لکھ دوں، تو لوگ کہیں گے کہ عمر نے کتاب میں اضافہ کر دیا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس حکم کے متعلق غلط فہمی ہوئی، وہ غلطی سے اس کو قرآن کی آیت سمجھتے تھے۔ دوسرا کوئی آدمی بھی آپ کے ساتھ اس بات میں شریک نہ تھا۔ دوسرے تمام صحابہ اس کے خلاف تھے۔ لہٰذا انہی کی بات درست ہونی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، لیکن معصوم صرف پیغمبر

[1] المائدۃ: ٣٣

کی ذات ہوتی ہے۔ ''بخاری'' کی حدیث میں بھی یہی توجیہ ہے۔ پہلی توجیہ کی رو سے ''آیت رجم'' کے معنے حکم رجم کے ہوں گے اور کتاب سے مراد ''حکم'' ہوگا۔ یا کتاب سے مراد قرآن اور آیت سے مراد وہ آیت جس سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے، پس قرآن مجید میں ردو بدل کا خیال باطل ہوگیا۔

چوتھا اعتراض:

آگے ایک قرأت لکھی ہے، جو آج کل مروج نہیں۔ اس سے بھی یہی سمجھا ہے کہ اس سے قرآن میں ردو بدل ہوگیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

''ابوالدرداء نے علقمہ سے پوچھا کہ حضرت عبداللہ ''واللیل'' کی تلاوت کس طرح کرتے ہیں؟ تو علقمہ بولے: اس طرح:

" واللیل إذا یغشیٰ ٥ والذکر والأنثی "

''آپ نے فرمایا: خدا کی قسم میں نے رسول اللہ سے یہ آیات اسی طرح سنی ہیں اور میں اسی طرح پڑھوں گا۔'' (صحیح مسلم: ۳٦۲/۲) [1]

تو گویا تین جلیل القدر صحابہ نے شہادت دی کہ یہ آیات مذکورہ صورت میں نازل ہوئی تھیں، لیکن آج قرآن شریف میں یوں درج ہے:

﴿ واللیل إذا یغشیٰ ٥ والنهار إذا تجلی ٥ وما خلق الذکر والأنثیٰ ٥ ﴾ [2]

اب کس کو صحیح تسلیم کریں، ان صحابہ کو یا صحیح مسلم کو یا قرآن شریف کو؟ لازماً یہی کہنا پڑے گا کہ ہمارا قرآن صحیح ہے اور یہ حدیث غلط ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب ما یتعلق القراءات، رقم الحدیث (۸۲٤)

[2] اللیل: ۱۔۳

جواب:

"مؤطا" کا ذکر کرتے کرتے "صحیح مسلم" تک پہنچ گئے، حدیث غلط نہیں، بلکہ آپ کے فہم کی غلطی ہے۔ آج کل قرآن مجید میں ﴿ وما خلق الذكر والأنثىٰ ﴾ ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ "ما" مصدریہ ہو اور دوسرا یہ کہ "ما" موصولہ ہو۔ عبداللہ کی قرأت سے اس کے مصدریہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے یہ پڑھا۔ قرآن تو دراصل یہی ہے، جو ہمارے پاس ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے تفسیر کی قرأت سنی، تو اسی طرح یاد کر لیا۔ اس قسم کی غلطیاں آدمی سے ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود "معوّذتین" کو قرآن میں داخل نہیں کرتے تھے، [1] اور "فاتحہ" کو مصحف سے کھرچ دیا کرتے تھے۔ [2] ان کا یہ خیال تھا کہ فاتحہ کا کوئی مقام متعین نہیں، اس لئے مصحف میں لکھنا نہیں چاہیے۔ اور معوذتین کا نزول دم جھاڑ کیلئے ہے، اس واسطے ان کو بطور قرأت نہیں پڑھنا چاہیے۔ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت دراصل اس طرح ہے: "والليل إذا يغشىٰ، والنهار إذا تجلىٰ، والذكر والأنثىٰ" جیسے ترمذی: ۱۱۷/۲ میں ہے۔ آپ کا مسلم کا حوالہ تو ملا نہیں، [3] صرف ہماری قرأت اور عبداللہ کی قرأت میں "وما خلق" کے ذکر اور

---

[1] مسند أحمد: ۱۲۹/۵، نیز دیکھیں: المعجم الكبير: ۲۳۴/۹، ۲۳۵، مسند البزار: ۲۹/۵، فتح الباري: ۷۴۲/۸، الإتقان: ۲۱۲/۱۔

[2] الإتقان: ۱۷۸/۱، فتح البيان: ۳۳/۱۔ امام سیوطی نے اس کی سند کو "صحیح" قرار دیا ہے۔

[3] صحیح مسلم کا حوالہ گزشتہ صفحہ پر گزر چکا ہے، امام مسلم نے مختلف طرق کے ساتھ عبداللہ بن مسعود کی یہ دونوں قراءات نقل کی ہیں، اور امام ترمذی نے بھی یہی دونوں قراءات نقل کی ہیں۔ دیکھیں: سنن الترمذي (۲۹۳۹) نیز دیکھیں: صحيح البخاري: ۳۵۳۲

حذف کا فرق ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بھی ایک قرأت ہو۔ ❶

پھر تین جلیل القدر صحابی کی بھی خوب کہی! ابوالدرداء اور عبداللہ تو صحابی ہیں، مگر علقمہ متنازع فیہ۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ صحابی نہیں، ❷ اگر ہوں بھی تو جلیل القدر نہیں۔ بہرحال عبداللہ کے شاگرد ہیں، گو اصل صرف دو ہوئے۔

پانچواں اعتراض:

اس کے بعد ذکر کیا ہے:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو لوگ ''بیر معونہ'' میں شہید ہو گئے تھے، ان کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اتری تھی، جو بعد میں منسوخ ہوگئی:

''بلغوا قومنا أن قد لقينا ربنا فرضي عنا و رضينا عنه''

''ہماری قوم سے کہہ دو کہ ہم اللہ سے ملے، وہ ہم سے راضی ہوا اور ہم اس سے راضی ہوئے۔'' (بخاری و مسلم) ❸

اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی، تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کیلئے اس کا باقی رہنا ضروری تھا۔'' (دواسلام: ۱۷۰)

---

❶ اکثر مفسرین نے ان الفاظ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کے طور پر نقل کیا ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري: ۶۰۹/۱۲، تفسير البغوي: ۴۴۵/۱، تفسير ابن كثير: ۶۶۸/۴، تفسير القرطبي: ۷۳/۲۰، فتح القدير: ۶۰۴/۵

❷ علقمہ بن قیس تابعی ہے۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو پایا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف نہیں ہوئے، ایسے تابعی کو ''مخضرم'' کہا جاتا ہے۔ دیکھیں: الإصابة: ۱۳۶/۵۔

❸ صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب فضل قول الله تعالىٰ ﴿وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا......﴾ رقم الحديث (۲۶۵۹)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب استحباب القنوت في جميع الصلاة إذا نزلت بالمسلمين نازلة، رقم الحديث (۶۷۷)

جواب:

یہ مذکورہ الفاظ تواتر سے تھے، مگر ان کے قرآن ہونے کا آنحضرت ﷺ سے کوئی ثبوت نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جب وحی کے ذریعہ اطلاع پا کر یہ الفاظ سنائے، تو ہوسکتا ہے کہ راوی نے قرآن سمجھ لیا ہو۔

اور ہوسکتا ہے ان الفاظ کو اس لئے منسوخ کر دیا ہو کہ اس کا عوض قرآن میں موجود ہے۔ یعنی آیت:

﴿بل أحياء عند ربهم يرزقون ○ فرحين......﴾ [1]

"اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو اپنے رب کے پاس سے رزق ملتا ہے، خوش ہیں۔"

قرآن مجید میں ہے:

﴿ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها أو مثلها......﴾ [2]

"اگر ہم کوئی آیت منسوخ کر دیں، تو اس سے بہتر یا اسی قسم کی آیت اور لے آتے ہیں۔"

چھٹا اعتراض:

اسی نوعیت کی ایک اور حدیث اس کے بعد پیش کی ہے:

"عن البراء بن عازب قال نزلت هذه الآية: حافظوا على الصلوٰات وصلوٰة العصر فقرأناها ماشاء الله ثم نسخها الله فنزلت حافظوا على الصلوٰت والصلوٰة

---

[1] آل عمران: ١٦٩ - ١٧٠ -

[2] البقرة: ١٠٦

الوسطیٰ" (صحیح مسلم:۲/۲۰۵) ❶
براء بن عازب سے روایت ہے کہ پہلے یہ آیت اتری۔ "حافظوا علی الصلوٰت وصلوٰۃ العصر" ہم کچھ عرصہ تک اسے پڑھتے رہے، پھر منسوخ ہوگئی، اوراس کی جگہ یہ نازل ہوئی۔" (دو اسلام : ۱۷۲)

جواب:

اس کے متعلق بھی وہی جواب ہے، جو پہلے دیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "صلوٰۃ العصر" کا لفظ بطور تفسیر بولا۔ راوی نے یہ سمجھا کہ شاید اسی طرح یہ آیت اتری۔ پھر جب اس کے بعد سننے کا اتفاق ہوا، تو جیسے اصل آیت تھی، ویسے ہی سنی، تو یہ سمجھا کہ شاید اب یہ آیت اتری ہے اور پہلی منسوخ ہوگئی ہے۔ دوسرا جواب وہی ہے، جو پہلے بیان ہوا۔

ساتواں اعتراض:

آگے لکھتے ہیں:

"گوشت میں غذائیت بہت زیادہ ہے۔ قرآن نے بھی گوشت خوری کو بطور انعام بیان کیا ہے۔ ﴿ومنها تأكلون﴾ ❷ انہیں انسان کھاتا بھی ہے، سرور دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام گوشت کو ایک نعمت سمجھ کر کھایا کرتے تھے۔ لیکن "مؤطا" کی ایک حدیث ہمیں گوشت جیسی نعمت سے اجتناب کا حکم دیتی ہے۔

"عن عمر بن الخطاب قال: إياكم واللحم فان له ضراوة

---

❶ صحیح مسلم: كتاب المساجد، باب الدليل لمن قال الصلاة الوسطى هي صلاة العصر، رقم الحديث(٦٣٠)

❷ النحل:٥

کضراوۃ الخمر" ❶

"عمر فاروق فرماتے ہیں: "گوشت سے بچو، اس لئے کہ شراب کی طرح اس کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔"

"اگر ایک اچھی چیز کی عادت پڑ جائے، تو حرج کیا ہے؟"

(دو اسلام: ۱۷٤)

جواب:

یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ موقوف ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور مرفوع کے مقابل موقوف حجت نہیں ہوتی۔ اس واسطے یہ حدیث آپ سے گوشت نہیں چھڑا سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہ مطلب نہ تھا کہ بالکل گوشت نہ کھاؤ، بلکہ مطلب یہ تھا کہ اس کی عادت نہ ڈالو، کیونکہ جس کو گوشت کھانے کی عادت پڑ جائے، وہ سبزی

❶ الموطا: ۹۳۵/۲ (۱٦۷۳) اس کی سند منقطع ہے۔ یحییٰ بن سعید کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہے۔ لیکن دوسری اسانید کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ قول ثابت ہے۔ دیکھیں: مصنف ابن أبي شيبة: ۱٤۱/۵ (۲٤۵۳۰)، إصلاح المال لابن أبي الدنيا: ۱۰۸ (۳۷٤) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مطلب ہے کہ گوشت کو کثرت سے استعمال نہ کرو اور اس پہ مداومت نہ کرو، کیونکہ حضرت عمر کے الفاظ یہ بھی ہیں: "لا تديموا أكل اللحم" "ہمیشہ صرف گوشت نہ کھایا کرو" جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گوشت کی کثرت سے اجتناب کا مقصد سہل پسندی سے روکنا ہے، جو مؤمنانہ اور مجاہدانہ شان کے منافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا الفاظ "له ضراوة كضراوة الخمر" سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: "إياكم واللحم أي الإكثار منه فإن له ضراوة ، قال الباجي: يريد عادة يدعوا إليها و يشق تركها لمن ألفها و يقال ضرى بالشي إذا لهج به" (تنوير الحوالك: ۲۲۷/۱) اسی طرح امام مناوی لکھتے ہیں: و منه قول عمر إن للحم ضراوة كضراوة الخمر أي من اعتاده لا يصبر عنه كمن لا يصبر عن الخمر معتادها" (فيض القدير: ۸۱/٦) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ قول مروی ہے۔ (مصنف ابن أبي شيبة: ۱٤۲/۵ (۲٤۵۳۱)

ترکاری کو پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کو گوشت کے سوا دوسری دال ترکاری ہضم ہی نہیں ہوتی۔ پس وہ گوشت کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور مجاہد کیلئے موزوں نہیں کہ اپنے آپ کو ایک خاص خوراک کا پابند بنائے۔ خود حضرت عمر گوشت کھاتے اور کھلاتے تھے۔ جس کا ایک واقعہ "مؤطا" میں بھی ہے، پس آپ کو چاہئے کہ دونوں کو ملا کر مطلب اخذ کریں۔

آٹھواں باب:

صحیح بخاری پر ایک نظر

پہلا اعتراض:

''اس میں کلام نہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ (وفات ۸۷۰ء) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کیے، ہر حدیث کو پرکھنے کیلئے تمام امکانی وسائل اختیار فرمائے۔ استخارے کیے، کعبہ میں جا کر دعائیں مانگیں کہ اے اللہ! مجھے صحیح و غلط میں امتیاز کی توفیق عطا فرما۔ راویوں کا کھوج لگایا، ہر قابل ذکر محدث سے مشورہ کیا اور سالہا سال کی مسلسل جستجو و تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا۔ لیکن اس قدر محنت و احتیاط کے باوجود اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں، جو یا تو تعلیم قرآن سے متصادم ہوتی ہیں یا آپس میں ٹکراتی ہیں یا مسلمانوں کو بیکار، اپاہج اور بے عمل بناتی ہیں اور یا ان سے حضور علیہ السلام اور ان کی ازواج مطہرات کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم ''صحیح بخاری'' کے ہر لفظ کی حفاظت کریں اور قرآن و رسول پر جو گذرتی ہے، گذرنے دیں اور یا قرآن کو مقدم رکھتے ہوئے صرف ان احادیث کو قابل اعتناء سمجھیں، جو عیوب بالا سے پاک ہوں۔ ہم بخاری کی محنت و تلاش کی داد دیتے ہیں، اور انہیں بے حد قابل احترام سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا کریں کہ حضور پُر نور کی ذات والا صفات سے ہمیں اس قدر عقیدت و

محبت ہے کہ ہم ان کی شان میں کوئی ہلکی سی جسارت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

امام بخاری کی زیادہ تر نظر اسناد پر رہی۔ انہیں جس حدیث کے وضع ہونے پر کوئی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔ لیکن صفحات گذشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ احادیث کا کیا حال ہو چکا تھا، راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند کیے گئے۔

رسول اکرم ﷺ بحیثیت نبی تیئس برس زندہ رہے، اس لمبی مدت میں یقیناً آپ نے قرآن کے علاوہ بھی کوئی ارشاد فرمایا ہو گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چودہ لاکھ حدیث کے طومار پریشان میں سے کوئی اقوالِ رسول کیسے ڈھونڈے!"

اس کے بعد بخاری پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں۔

جواب:

قبل اس کے کہ ہم ان کے اعتراضات نقل کر کے جواب دیں، مناسب معلوم ہوتا ہے، ان کی اس تحریر کے قابل اعتراض پہلو کی طرف توجہ دلائیں:

اول: جو آپ نے یہ لکھا ہے کہ "امام بخاری کی نظر زیادہ تر اسناد پر تھی" بالکل غلط ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں، جو حضور والا صفات ﷺ کی تنقیص کا مواد جمع کرے یا آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں کوئی ایسی بات لکھے، جس سے ان کی توہین کا پہلو نکلتا ہو یا مسلمانوں کو اپاہج بنانے کیلئے اپنی عمر گراں مایہ کو خرچ کرے یا قرآن کے خلاف حدیثیں جمع کرنا شروع کرے یا عقل کے خلاف باتیں لکھ کر اپنے مذہب کو کمزور بنائے۔ یہ کام تو زندیقوں کا ہے یا ان لوگوں کا جو عقل و علم میں بہت کم مقام رکھتے ہوں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی

عقل کے موافق ایک حدیث کو قرآن کی مخالفت یا دوسرے عیوب سے مبرا سمجھے اور دوسرا اس کے خلاف ہو۔ مگر کسی قابل احترام ہستی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دیدہ دانستہ ایسا کرتا ہے یا احادیث جمع کرنے میں اس قدر لاپرواہی کا شکار ہوتا ہے کہ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کا احترام یا قرآن کی مخالفت و موافقت بھی اس کیلئے بے معنی ہو کر رہ جائے۔ باوجود اس کے کہ وہ کعبہ میں جا کر خدا سے صحیح و غلط میں امتیاز کی توفیق کی دعائیں مانگتا ہو، اس کے لئے دور دراز کے لمبے سفر کرتا ہو، راویوں کے کھوج لگاتا ہو، استخارے کرتا اور عمر عزیز کے سالہا سال اس جستجو و تگاپو میں صرف کر ڈالتا ہو کہ اس کے مجموعہ میں کوئی غلط بات شامل نہ ہو جائے۔

پس مذکورہ اعتراضات کے دو ہی مقام ہیں کہ یا تو اعتراضات غلط ہیں یا جس کی جمع کردہ احادیث پر اعتراض ہے، وہ کوئی عقلمند شخص نہیں اور اس دوسری بات کو تسلیم کرنے کیلئے دوسرے تو الگ رہے، شاید معترض بھی تیار نہ ہو!

دوم: آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ ”احادیث کا کیا حال ہوا، یا راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند کئے گئے“ واقعہ کے خلاف ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ واقعات کا گہری نظر سے جائزہ نہیں لیا گیا۔

سوم: یہ کہا ہے کہ ”چودہ لاکھ حدیثوں کے طومار پریشان میں سے اقوال رسول کو کون ڈھونڈے“ بالکل لغو ہے، کیونکہ محدثین نے اقوال رسول ﷺ کو حسن وصحت کے ساتھ جمع کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اور امت نے ان کی خدمت کو قبول کیا اور ان کے ساتھ موافقت کی ہے، اس لئے اب آپ کو سر دردی کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اعتراض:

اب ان کے اعتراضات سنئے:

ایک پیشین گوئی

۶ھ، ۶۲۰ء کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خسرو پرویز شاہ ایران (۵۹۰ء - ۶۲۸ء) اور ہرقل قیصر روم (۶۱۰ء - ۶۴۱ء) کی طرف خطوط بھیجے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ہرقل نے قاصد رسول ﷺ کی بڑی تعظیم کی، لیکن کسریٰ شاہ ایران نے خط پھاڑ دیا اور قاصد کو ڈانٹ ڈپٹ کر دربار سے نکال دیا۔ جب حضور کو اس سلوک کی اطلاع ملی، تو آپ نے ایک پیش گوئی کی۔ قیصر کے حسن سلوک اور کسریٰ کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضور صرف نسل کسریٰ کے خاتمہ کی پیشین گوئی فرماتے اور ہرقل کے لئے اسی طرح محبت کا اظہار کرتے، جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے، لیکن جو پیشین گوئی بخاری میں موجود ہے، وہ ہماری اس تمنا کو پوری نہیں کرتی:

"عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده وإذا هلك قيصر فلا قيصر بعده" (بخاري) [1]

"ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: کسریٰ کے تباہ ہونے کے بعد کوئی کسریٰ نہیں اور قیصر کے ہلاک ہونے کے بعد کوئی قیصر نہیں۔"

کسریٰ کے متعلق یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آنحضرت ﷺ کی رحلت کے صرف دس برس بعد ۶۴۲ء میں جنگ نہاوند نے ساسانی

[1] صحيح البخاري: كتاب الخمس، باب قول النبي ﷺ أحلت لكم الغنائم، رقم الحديث (۲۹۵۲)، صحيح مسلم: كتاب الفتن، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل، رقم الحديث (۲۹۱۹)

خاندان کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا۔ کچھ عرصہ بعد آخری کسریٰ (یزدگرد) قتل ہو گیا اور اس کے بعد آج تک کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیش گوئی اسی طرح پوری ہوتی، لیکن اے کاش کہ ایسا نہ ہوا، بلکہ یہ خاندان اس پیش گوئی کے بعد آٹھ سو تیس برس تک زندہ رہا۔" (دو اسلام : ۱۷۹)

جواب:

اس عبارت کی چند باتیں قابل غور ہیں:

① اس پیشین گوئی کا مقابلہ کسریٰ اور قیصر کے اس سلوک سے کیا گیا ہے، جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے قاصد سے کیا۔ سلوک چونکہ مختلف تھا، پیش گوئی بھی مختلف ہونی چاہئے تھی۔

② قیصر سے مراد وہ نسلی بادشاہ ہے، جس کا سلسلہ ۳۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اور جو ۱۴۵۳ء تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ نے اس سلسلہ کو ۱۴۵۳ء میں ختم کیا۔

پہلی بات کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ پیش گوئی کسریٰ اور قیصر کے اس سلوک کے جواب میں نہیں کی گئی، جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے خط کے ساتھ کیا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے کسریٰ کیلئے بد دعا کی اور قیصر کیلئے ان کے بقاء کی خبر دی۔ فتح الباري میں ہے:

"كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى كسرىٰ و قيصر، فأمّا كسرىٰ فلما قرأ الكتاب مزّقه، وأما قيصر فلما قرأ الكتاب طواه ثم رفعه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

أما هؤلاء فيمزّقون وأما هؤلاء فستكون لهم بقية، ويؤيده ما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم لما جاءه جواب كسرىٰ قال مزق الله ملكه، ولما جاءه جواب قيصر قال ثبّت الله ملكه" (ص ٣٥-٣٤) ❶

''جب آنحضرت ﷺ نے کسریٰ اور قیصر کو خط لکھا، تو کسریٰ نے خط پھاڑ دیا اور قیصر نے لپیٹ کر اس کو اٹھا رکھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ چیر دیے جائیں گے اور یہ لوگ باقی رہیں گے۔اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کسریٰ کا جواب پہنچا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو پارہ پارہ کرے اور جب ہرقل کا جواب آیا، تو فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کا ملک ثابت رکھے۔''

اور یہ پیشین گوئی ایک مستقل شے ہے۔ اس کا آپ ﷺ کے نامہ مبارک سے اور اس کے جواب سے کوئی تعلق نہیں۔ ❷ قیصر کا لفظ حدیث میں عرب کے عرف پر

❶ فتح الباري: ١/٤٤

❷ کیونکہ جب شاہ ایران نے آپ ﷺ کا نامہ مبارک چاک کیا تھا، تو آپ ﷺ نے کسریٰ کے متعلق وہ پیشین گوئی نہیں فرمائی تھی، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کے حق میں بد دعاء فرمائی تھی۔" أن يمزقوا كل ممزق" کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں۔صحيح البخاري(٦٤) برق صاحب نے غلط فہمی سے رسول اللہ ﷺ کی عام حالات میں کی جانے والی پیشین گوئی کو اس خاص واقعہ کے بعد کی جانے والی بد دعا کی جگہ نقل کر دیا ہے۔آپ ﷺ نے کسریٰ کی ہلاکت کی پیش گوئی کسی پیش آمدہ سبب کے بغیر وحی کے ذریعہ بتائی تھی، جس کا نامہ مبارک کے پھاڑنے سے کوئی تعلق نہیں اور خط پھاڑنے کے بعد جو بد دعا فرمائی تھی، وہ بالفاظ دیگر ہے، جیسا کہ اوپر ذکر گزرا اور بحمد اللہ وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔

اسی طرح برق صاحب کا کہنا کہ قیصر کے ساتھ نجاشی جیسے حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، ←

ہے۔ عرب ہرقل کا اطلاق شام کے بادشاہ پر کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا اس پیش گوئی سے یہ مطلب تھا کہ اس قیصر کے مرنے کے بعد شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گا اور یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ الحمدللہ!

یہ اعتراض جو آپ نے کیا، شرّاح حدیث نے بھی کیا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے۔ چنانچہ "فتح الباري" میں ہے:

"وقد إستشكل هذا مع بقاء مملكة الفرس، لأن آخرهم قتل في زمان عثمان واستشكل أيضاً مع بقاء مملكة الروم وأجيب عن ذلك بأن المراد لايبقى كسرىٰ بالعراق ولا قيصر بالشام، وهذا منقول عن الشافعي، قال وسبب الحديث أن قريشا كانوا يأتون الشام والعراق تجّارا فلما أسلموا خافوا انقطاع سفرهم إليهم دخولهم في الإسلام فقال النبي ﷺ ذلك تطييبا لقلوبهم وتبشيرا لهم بأن ملكهما سيزول عن الأقليمين المذكورين" (فتح الباري: ٣٧٤) ❶

اس میں ایک اشکال ہے کہ فارس کی حکومت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہی اور رومیوں کی سلطنت بھی مدت تک قائم رہی۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عراق میں کسریٰ اور شام میں قیصر باقی نہیں رہیں گے۔ اس حدیث کے کہنے کی

← یہ بھی عدم تدبر کا نتیجہ ہے، کیونکہ نجاشی ایک مسلمان حاکم تھا اور قیصر روم ایک کافر حکمران تھا، لہٰذا دونوں کے ساتھ یکساں حسن سلوک کی توقع رکھنا مضحکہ خیز بات ہے۔ ﴿أَفَمَن كَانَ مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا لَّا يَسْتَوُونَ﴾

❶ فتح الباري: ٦/٦٢٥۔

وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب قریش نے اسلام قبول کیا (اور اسلام سے قبل وہ عراق اور شام میں تجارت کیلیے سفر کیا کرتے تھے) اپنے سفر کے بند ہونے سے ڈر گئے، تو آنحضرت ﷺ نے ان کو خوش کرنے کے لیے فرمایا کہ ان کی حکومت عنقریب عراق اور شام سے زائل ہو جائے گی۔''

۲ دوسری بات کا بھی جواب آ گیا۔ کیونکہ اشکال کی وجہ دراصل یہی ہے کہ قیصر سے مراد ایک خاندان میں سے اس کا ایک فرد ہے اور اس خاندان کی حکومت مدت تک رہی۔ جب قیصر سے ہم نے شام کا حاکم مراد لیا، تو اشکال رفع ہو گیا۔ حدیث کا شانِ ورود بھی اس کی تائید میں ہے۔ جیسے امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

تیسرا اعتراض: تاریخی غلط بیانیاں

''اول یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مسجد اقصیٰ کے بانی حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ اور یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تقریباً ہزار سال قبل مسیح تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ۲۰۱۵ قبل مسیح تھا۔ پس تعمیر کعبہ اور تعمیر بیت المقدس کے درمیان ۱۰۵۹ سال کا زمانہ بنتا ہے۔ لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال کا ہے:

''عن أبي ذر قال: قلت يا رسول الله أي مسجد وضع في الأرض أول قال: المسجد الحرام، قال: قلت: ثم أي قال: المسجد الأقصى قلت كم كان بينهما؟ قال: أربعون سنة''[1]

''ابوذر کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: سب سے پہلے

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الأنبياء باب(١٠)، رقم الحديث(٣١٨٦)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، رقم الحديث(٥٢٠)

زمین پر کون سی مسجد بنائی گئی؟ فرمایا: مسجد حرام، میں نے کہا: پھر کون سی؟ فرمایا: مسجد اقصیٰ! میں نے پوچھا: ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چالیس سال کا!''

ہے کوئی محدث جو اس صریح تاریخی غلط بیانی کی تاویل کر سکے؟ علامہ قسطلانی لکھتے ہیں: ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فوراً بعد کسی نے مسجد اقصیٰ بنائی ہو، جو گر چکی ہو، اور اسے سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا ہو۔ تاریخ کے ٹھوس واقعات کو ''ممکن ہے، یہ ہو، وہ ہو'' سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ ممکن ہے، امریکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا ہو، تو کیا آپ مان لیں گے؟ (دو اسلام: ۱۸۴)

جواب:

یہ ہے اعتراض، اور اعتراض کے ضمن میں اس کا جواب بھی نقل کر دیا ہے کہ ''ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فوراً بعد کسی نے مسجد اقصیٰ بنائی ہو، جو گر چکی ہو اور اسے سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا ہو۔''

اس پہ اعتراض یہ جمایا ہے کہ ''ممکن'' سے کام نہیں چلتا، تاریخی ثبوت لائیے، مگر اس بات کو بھول گئے ہیں کہ وہ زمانہ ایسا تاریخی نہیں ہے، جس میں تمام دنیا کی باتیں نقل کی گئی ہوں۔ اگر زمانہ تاریخ کی کسی بات کا تاریخ میں ذکر نہ ہو، تو آپ اس کی نفی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا وقوع غیر تاریخی زمانہ میں ہوا ہے، تو آپ تاریخ کی روشنی میں اس کی نفی کیونکر کر سکتے ہیں؟ یا آپ غیر تاریخی زمانہ کو تاریخی زمانہ پر قیاس کیوں کر رہے ہیں کہ وہاں ''ممکن و امکان'' سے کام نہ چلے؟

قرآن مجید میں قصہ عاد موجود ہے، مگر بعض عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قوم عاد صرف فرضی قوم ہے، کیونکہ تورات اس کے بیان سے ساقط ہے۔

اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ کعبہ کی تعمیر کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف فرضی ہے، کیونکہ تورات میں اس کا ذکر نہیں، آپ کا اعتراض بھی اسی قسم کا ہے۔

جو امر آنحضرت ﷺ سے پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اور عقلاً ممکن بھی ہے، اس پر اعتراض چہ معنی دارد؟ ہاں کوئی امر خلاف قرآن یا خلاف عقل یا فطرت ہو، تو اس پر اعتراض کر سکتے ہیں۔

اس طرح تو عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے جو یہ قصہ بیان کیا ہے:

﴿ما كنت لديهم إذ يلقون أقلامهم أيهم يكفل مريم﴾ [1]

"(اے نبی ﷺ) آپ وہاں نہ تھے، جب وہ اس لئے قلمیں ڈالتے تھے کہ مریم کی کفالت کس کے سپرد ہو۔"

پہلی کتاب میں نہیں۔ تو ہم کیا اس پر اعتقاد لانا اس وقت تک چھوڑ دیں، جب تک کسی تاریخی ٹھوس دلائل سے اس کو ثابت نہ کر دیں؟ ہرگز نہیں!

کیونکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ قرآن نقل نہیں، بلکہ وحی ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کا علم سارے کا سارا لوگوں سے سنا ہوا نہیں، بلکہ وحی بھی ہے۔ اس لئے آپ ﷺ کے بیان کردہ واقعات کے لئے امکان ہی کافی ہے۔ اس واقعہ کو آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امریکہ دریافت کرنے کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ واقعہ (موسیٰ علیہ السلام کے امریکہ دیکھنے کا) کسی معتبر تاریخی کتاب میں نہیں ہے۔ آپ صرف آج کہہ رہے ہیں، اس واسطے یہ معتبر نہیں، ہاں اگر کسی تاریخ کی معتبر کتاب

[1] آل عمران: ٤٤

میں ہو، تو کولمبس کی اولیت امریکہ دیکھنے کے بارے میں غلط ٹھہرے گی۔

شارحین نے اس کا ایک اور جواب بھی دیا ہے کہ ”اس جگہ مسجد حرام کی پہلی بنیاد مراد ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت رکھی گئی، اس وقت بیت المقدس کی بنیاد چالیس سال بعد میں رکھی گئی۔“ یہ زمانہ قبل از تاریخ کا ہے۔

تیسرا جواب یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں کعبہ تعمیر ہوا، اس سے پہلے ایک دفعہ جرہم نے بنایا، اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، اس جگہ دوسری تعمیر مراد ہے، کیونکہ پہلے صرف کعبہ تھا اور مسجد حرام کا دائرہ اتنا وسیع بعد میں ہوا۔ مسجد اس وسعت اور صحن کا نام ہے جو کعبہ کے ارد گرد ہے اور جرہم کی بناء حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر سے چالیس سال قبل ہے۔ [1]

پیدائش (باب ۲۸، آیت: ۱۸، ۱۹، ۲۰) میں ہے:

”یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنے سرہانے دھرا تھا، لیکر ستون کو کھڑا کیا اور اس جگہ کا نام بیت ایل رکھا۔“

اور اس باب (آیت: ۲۲) میں ہے:

”اور یہ پتھر جو میں نے ستون میں کھڑا کیا ہے، خدا کا گھر ہوگا۔“

لو! اب یہ تاریخی حوالہ بھی مل گیا، اب تو حدیث کا مطلب جو علامہ قسطلانی نے ”ممکن“ کے لفظ سے بیان کیا ہے، ایک ٹھوس حقیقت تاریخیہ سے ثابت ہو گیا۔ [2]

---

[1] دیکھیں: فتح الباري: ٦/ ٤٠٨، عمدة القاري: ١٥/ ٢٦٢

[2] مسجد اقصیٰ کی ابتدائی تعمیر اور تاسیس حضرت یعقوب علیہ السلام نے رکھی تھی، جو خانہ کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد واقعہ ہوئی، اور بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی دوبارہ تعمیر اور تجدید کی تھی۔ لہٰذا اس حدیث میں کسی طرح کی کوئی تاریخی غلطی نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: زاد المعاد: ١/ ٤٧، البداية والنهاية: ١/ ١٦٢،

چوتھا اعتراض:

اس کے بعد ایک حدیث لکھتے ہیں:

”عن عائشة رضي الله عنها أن النبيﷺ توفي وهو ابن ثلاث وستين سنة “(بخاري) [1]

”نبی کریم ﷺ نے تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت کی۔“

لیکن حضور کے خادم حضرت انس جو (۱۲۶۸) [2] احادیث کے راوی ہیں، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عمر ساٹھ برس تھی:

”أنزل عليه وهو ابن أربعين سنة فلبث بمكة عشر سنين ينزل عليه وبالمدينة عشر سنين“ [3] (بخاري)

”چالیس برس کی عمر میں حضور پر قرآن اترنے لگا، اس کے بعد دس سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں زندہ رہے۔“

اسی صفحہ پر اس مضمون کی ایک اور حدیث بھی موجود ہے، جو انس ہی سے منقول ہے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”بعث رسول الله ﷺ لأربعين سنة فمكث بمكة ثلاث عشرة سنة يوحى إليه ثم أمر بالهجرة فهاجر عشر سنين

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المناقب، باب وفاة النبي ﷺ رقم الحديث(٣٣٤٣)، صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب كم سن النبي ﷺ يوم قبض، رقم الحديث (٢٣٤٩)

[2] صحیح تعداد (۲۲۶۸) ہے۔

[3] صحيح البخاري: كتاب المناقب ، باب صفة النبي ﷺ، رقم الحديث(٣٣٦٤)، صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب في صفة النبي ﷺ ،رقم الحديث(٢٣٤٨)

ومات وهو ابن ثلاث وستين“ ❶

”چالیس برس کی عمر میں حضور پر وحی نازل ہوئی، اس کے بعد آپ مکہ میں تیرہ برس رہے۔ اور وحی باقاعدہ جاری رہی، پھر مدینہ میں تشریف لے گئے، یہاں تک کہ تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔“

(دو اسلام:١٨٦)

جواب:

معلوم ہوتا ہے، مصنف محاوراتِ عرب سے بالکل نابلد ہے۔ عربی زبان میں دھاکوں کے اوپر کی اکائیوں کو بعض وقت حذف کر دیا کرتے ہیں۔ اس محاورہ کی بناء پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مکی زندگی بیان کرتے ہوئے بعثت کے بعد کے عرصہ سے دس کا ذکر کیا اور تین کو حذف کر دیا۔ اسی طرح مجموعہ سے ساٹھ کے اوپر تین کو حذف کر دیا۔

﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾ ❷

” اگر علم نہ ہو، تو اہل علم سے پوچھ لینا چاہیے“! قرآن مجید میں ہے:

﴿حمله وفصاله ثلاثون شهرا﴾ ❸

”حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے۔“

حالانکہ حمل کی عام مدت ۹ ماہ ہے اور دودھ پلانے کی مدت قرآن نے ۲ سال بتائی ہے۔ اس حساب سے کل ۳۳ ماہ بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

---

❶ صحيح البخاري: كتاب فضائل الصحابة، باب هجرة النبي ﷺ و أصحابه إلى المدينة، رقم الحديث(٣٦٨٩)، صحيح مسلم: كتاب الفضائل ، باب كم أقام النبي صلى الله عليه وسلم بمكة و المدينة ، رقم الحديث(٢٣٥١)

❷ النحل:٤٣

❸ الأحقاف:١٥

﴿حولین کاملین﴾ [1]

"پورے دو سال دودھ پلائیں" اور ایک جگہ فرمایا:

﴿فِي عَامَيْنِ﴾ [2]

"دودھ چھوڑنے کی مدت دو سال ہے"

مگر آیت بالا میں صرف (۳۰) بتائے ہیں، اس لئے کہ کسر یعنی اکائیوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ [3]

پانچواں اعتراض:

اب تیسری تاریخی غلطی سنئے:

"عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ کیا تورات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی آیت موجود ہے؟ کہا: کیوں نہیں! آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے:

" يأيها النبي إنا أرسلنك شاهداً ومبشراً ونذيرا ، و حرزا للأميين أنت عبدي ورسولي سميتك المتوكل ليس بفظ ولا غليظ" [4]

---

1. البقرة:۲۳۳
2. لقمان:۱٤
3. حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کا بخوبی علم تھا، کیونکہ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک تریسٹھ برس بھی مروی ہے۔(صحيح مسلم، حديث: ۲۳٤۸) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ساٹھ سال عمر بتاتے ہوئے عرب کے محاورہ کے مطابق اکائی حذف کر دی تھی۔
4. صحيح البخاري: كتاب البيوع، باب كراهية السخب في السوق، رقم الحديث(۲۰۱۸)

''اے رسول! ہم نے تمہیں شاہد، بشیر، نذیر اور ان پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے، تو میرا بندہ ہے اور رسول ہے۔ تو ترش مزاج ہے، نہ تند طبع۔''

تورات کو الف سے یاء تک پڑھ جایئے، یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے۔ ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اجی صاحب! تورات میں اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی۔ یہ آیت ملے تو کہاں سے؟ اس کے دو جواب ہیں:

اول: اگر تحریف ہو چکی ہے، تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے وہ آیت کہاں سے دیکھ لی؟ حضرت موسیٰ کا زمانہ اندازاً پندرہ سو برس قبل مسیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے عہد تک پورے دو ہزار سال گذر چکے تھے، مبینہ تحریف اس عہد میں ہو چکی ہو گی۔ خود مسیحی مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہودا (۶۹۸ق م) کے زمانہ میں تورات گم ہو گئی تھی اور ۷۵ برس کے بعد دستیاب ہوئی تھی۔ مسلم محققین اسی عہد کو تحریفِ تورات کا عہد تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں اصل تورات نہیں ملی تھی، بلکہ ایک جعلی نسخہ تیار کر لیا گیا تھا۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ تورات بخت نصر کے حملے میں ضائع ہوئی تھی۔ یہ حملہ ۶۰۶ ق م میں تاجدار بابل (بخت نصر) نے سلطنتِ یہود پہ کیا تھا۔ ہر یہودی کو قتل کر ڈالا تھا یا قیدی بنا کر ساتھ لے گیا تھا اور تورات کو جلا دیا تھا، مبینہ تحریف کا زمانہ ۶۹۸ ق م ہو یا ۶۰۶ ق م، وہ بہرحال ولادت رسول سے صدیوں پہلے ہو چکی تھی۔ اس زمانہ میں تورات کے نسخوں کی تعداد محدود تھی اور تحریف آسانی سے ہو سکتی تھی، لیکن عہد رسول میں ہزار ہا نسخے مختلف ممالک میں موجود تھے اور بعد میں ان

کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اس لئے تحریف آسان نہیں تھی۔ یہ تو ممکن تھا کہ کوئی شخص اپنے ذاتی نسخے میں رد و بدل کر دیتا۔ آخر یہودیوں میں بھی ہزار ہا شخص ایسے موجود ہوں گے، جنہیں اپنی کتاب سے اسی طرح محبت ہو گی، جس طرح ہمیں قرآن سے، اگر ہم قرآن میں تحریف کا تصور تک نہیں کر سکتے، تو یہودیوں کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا ہر فرد تحریف کیلئے تیار تھا۔

﴿ومن قوم موسىٰ أمة يهدون بالحق وبه يعدلون﴾ ❶

''موسیٰ کی قوم میں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو سچائی کا راستہ دکھاتے تھے۔''

یہ سچے یہودی تورات کی تحریف کس طرح گوارا کر سکتے تھے؟ بنابریں اگر تحریف ہوئی تھی، تو وہ یقیناً نزول قرآن سے صدیوں پہلے ہو چکی ہو گی۔

ان حالات میں کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں

ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت کہاں سے دیکھ لی تھی؟

دوم: حضرت مسیح نے اعلان کیا تھا کہ جب تک زمین آسمان نہ ٹل جائیں، ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہیں ٹلے گا۔

(انجیل متی، باب:۵ آیت:۷)

اگر تورات محرف ہو چکی تھی، تو حضرت مسیح اتنے زور سے یہ اعلان کیوں کرتے؟ صاف صاف کہہ دیتے: تورات گم ہو چکی ہے یا بگڑ چکی ہے۔ اس کے تمام احکام منسخ ہو چکے ہیں، اس لئے میں نئی کتاب لیکر آیا ہوں! تورات کی تصدیق کرنا اور ڈنکے کی چوٹ کہنا کہ تورات کا ہر شوشہ اور نقطہ

---

❶ الأعراف: ۱۵۹۔

اپنی جگہ پر قائم ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں، اس کا ایک حرف تک نہیں بدل سکتا۔ صاف صاف اعلان ہے اس حقیقت کا کہ حضرت مسیح کے عہد تک تورات اپنی اصل حالت میں باقی تھی۔ اور بخت نصر وغیرہ کی حکایات سب فرضی ہیں۔ تورات کے غیر محرف ہونے پر کچھ تاریخی شواہد بھی موجود ہیں، لیکن چونکہ ہمارے علماء الہام کے مقابلہ میں تاریخ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اسلئے ہم اس موضوع پر قرآن کا فیصلہ درج کرتے ہیں:

① سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہمیں تمام سابقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی تھیں، اور غلط سلط تھیں تو ان پر ایمان لانے کا مقصد؟

② جس طرح انجیل کے متعلق قرآن نے ہمیں بتایا کہ وہ تورات کی مصدق تھی:

﴿وآتيناه الإنجيل فيه هدىً ونور ومصدقا لما بين يديه من التوراة﴾ ❶

''کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی، جس میں نور و ہدایت ہے اور جو تورات کی تصدیق کرتی ہے۔''

اسی طرح قرآن نے تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کی:

﴿مصدقا لما بين يديه من التوراة والإنجيل﴾ ❷

''قرآن تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کرتا ہے۔''

---

❶ المائدۃ:٤٦۔

❷ المائدۃ: ٦٨

تصدیق کے معنے ہیں: سچا سمجھنا اور درست تسلیم کرنا۔ جب قرآن تورات وانجیل کی صداقت کا اعلان کر رہا ہے، تو آپ کون ہوتے ہیں، انہیں جھوٹا سمجھنے والے؟ کیا قرآن ایک محرف اور جھوٹے صحیفے کی تصدیق کر سکتا ہے؟ کیا خدا کے علم میں نہیں تھا کہ تورات میں تصرف ہو چکا ہے۔ اگر علم تھا، تو تصدیق کیوں کی؟ کیا کوئی مجسٹریٹ کسی جعلی دستاویز کی دیدہ و دانستہ تصدیق کر سکتا ہے؟

④ آپ کہیں گے کہ اللہ نے اصلی تورات کی تصدیق کی تھی، نہ کہ صحیفہ رائجہ کی۔ بہت اچھا! تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہہ دیا:

﴿قل یا أھل الکتاب لستم علی شيء حتیٰ تقیموا التوراۃ والإنجیل﴾ [1]

"اے رسول! اہل کتاب سے کہہ دو کہ جب تک وہ تورات وانجیل پر عمل نہیں کریں گے، ان کی بگڑی کبھی نہ بن سکے گی۔"

اگر یہ کتابیں انسانی دست و برد سے ناپاک ہو چکی تھیں، تو اہل کتاب کو ان پر عمل کرنے کی دعوت کیوں دی؟

اور سنئے:

﴿وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللّٰہ﴾ [2]

"ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا حکم درج ہے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ "درج تھا" بلکہ "درج ہے" نحو کا مشہور قاعدہ ہے، جہاں جار و مجرور کا متعلق مذکور نہ ہو۔ وہاں محذوف "کائن" فرض کر لو۔ اس

---

❶ أیضًا

❷ المائدۃ: ٤٣

قاعدہ کی رو سے آیت کے معنی ہوں گے ''تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے۔'' لیکن آپ کہتے ہیں کہ ''موجود تھا۔'' کس کو صحیح سمجھوں: آپ کو یا قرآن کو؟

﴿إنا أنزلنا التوراة فيها هدى و نور﴾ ❶

''ہم نے تورات نازل کی، جس میں ہدایت اور نور موجود ہے!''

ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

﴿ وهذا كتاب أنزلناه مبارك فاتبعوه واتقوا لعلكم ترحمون o أن تقولوا إنما أنزل الكتاب على طائفتين من قبلنا وإن كنا عن دراستهم لغافلين﴾ ❷

''ہم نے یہ مبارک کتاب تمہیں عطا کی ہے، اسے مانو اور گناہوں سے بچو، تاکہ تم ہماری رحمت کے مستحق بن سکو، اب تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے: ہم سے قبل دو امتوں (یہود و نصاریٰ) پر کتابیں نازل ہوئیں تھیں، لیکن وہ اجنبی زبان میں تھیں اور ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔''

یعنی نزول کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ پہلی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں، بلکہ یہ کہ وہ ایسی زبان میں تھیں، جس سے عرب نا آشنا تھے۔ کیا تورات کی صحت پر اس سے بڑی شہادت پیش ہو سکتی ہے؟

اور سنئے:

﴿ ليسوا سواء من أهل الكتاب أمة قائمة يتلون آيات الله آناء اليل وهم يسجدون o يؤمنون بالله واليوم الآخر

❶ المائدة:٤٤

❷ الأنعام:١٥٥-١٥٦

ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویسارعون في الخیرات وأولٰئک من الصالحین ﴾ [1]

''سارے اہل کتاب برے نہیں، ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں، جو رات کو اللہ کی آیات (تورات وانجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کی ترغیب دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نیک اعمال کی طرف بے تابانہ بڑھتے ہیں، یہ لوگ صالح ہیں۔''

اس آیت میں تورات وانجیل کو اللہ کی ''آیات'' کہا گیا ہے۔ اگر تورات بگڑ چکی تھی، تو اللہ اس کے احکام کو ''آیات'' کیوں کہتا ہے؟ اور اس پر عمل کرنے والوں کو ''صالحین'' میں شمار کیوں کرتا ہے؟

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ صورتحال ہے، تو پھر مسلمان بننے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ عیسائی رہ کر نیک عمل کیے جاؤ، نہ قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت، نہ رسول پہ، سارے اسلام سے چھٹی مل گئی۔ یہ سوال اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کسی زبانی اقرار کا نام نہیں، بلکہ نیکی کا نام ہے، اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے، تو وہ قرآن کی رو سے مسلمان ہے۔ رسول وقرآن کا صحیح پیرو وہی ہے جو نیک ہو، نہ وہ جو کلمہ پڑھے، سارے جہان کی بدمعاشیاں کرتا پھرے۔ آپ کے ہاں اسلام چند عقائد کا نام ہے، اور قرآن کے نزدیک صرف نیکی کا۔ اس لئے خدا و رسول کا صحیح پیرو وہ ہے، جو ان احکام پر عمل کر رہا ہے، خواہ اس پر عیسائیت کا لیبل لگا ہو یا یہودیت کا، نہ وہ جو خدا و رسول کا صرف زبانی

[1] آل عمران:١١٤

قائل ہو اور عملاً کافر، چونکہ قرآن کی رو سے ﴿إن هذا لفي الصحف الأولى ۝ صحف إبراهيم وموسى ۝﴾ [1] یہ قرآن ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں بھی موجود ہے، اس لئے کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے۔ مت بھولئے کہ ہر عمل کا ایک صلہ ہے، جو کسی طرح ضائع نہیں ہوتا۔ عامل خواہ مرد ہو یا عورت، عیسائی یا مسلمان، یہ صلہ اسے مل کر رہے گا، اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وما يفعلوا من خير فلن يكفروه﴾ [2]

''ہم ان اہل کتاب کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے۔''

ممکن ہے، آپ سوچ رہے ہوں کہ وہ جو قرآن میں یہود کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تورات میں تحریف کیا کرتے تھے، اس کا کیا مطلب؟ تحریف سے مراد آیات کی من مانی تفسیر کرنا، نہ الفاظ کو بدلنا۔

عہد رسول میں تورات اصلی حالت میں موجود تھی، اس تورات میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ذکر کردہ روایت کہیں موجود نہیں!''

جواب:

مندرجہ بالا عبارت میں مصنف نے پہلے تو یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ عبارت جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، تورات میں نہیں پائی جاتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں تاریخی غلط بیانی ہے۔ پھر ان کا اپنی طرف سے ایک جواب ''تورات میں تحریف ہو چکی ہے، اس واسطے یہ عبارت نہیں ملتی'' ذکر کر کے اس پر بحث کی ہے۔ اور اپنی طرف سے پہلے یہ کہا ہے کہ تورات کے محرف ہونے کا زمانہ چھ سو سال قبل

---

[1] الأعلى: ۱۸۔۱۹

[2] آل عمران: ۱۱۵

مسیح ہے۔ اس واسطے اگر تحریف ہو چکی تھی، تو عبارت تو اس میں موجود ہونی چاہیے، کیونکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے وقت میں نقل کی ہے۔ اس کے بعد تورات اور انجیل کے غیر محرف ہونے کا ذکر کیا ہے، اس پر تین ولائل ذکر کئے ہیں:

اول: بعض یہودی راست باز بھی تھے۔

دوم: مسیح نے کہا: تورات کا ایک شوشہ بھی نہیں ٹلے گا۔

سوم: قرآن سے استدلال کیا ہے، اس کے ضمن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو بدوں مسلمان ہونے کے ناجی قرار دیا ہے، بلکہ اسلام صرف عمل کا ہی نام رکھ دیا ہے۔

اس کا مقصد معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں تو تحریف ہو چکی ہے اور حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا مشکل ہے، اس لئے اسلام سے تو چھٹی ہوئی، اب اپنا اصل مقصد ظاہر کر دیا ہے کہ توارت و انجیل غیر محرف ہیں، ان پر عمل کر کے نجات ہو سکتی ہے، پس یہودی اور عیسائی بننا، مسلمان بننے سے بہتر ہے، یہ ہے ان کی عبارت کا خلاصہ مطلب!

اولاً: یہ عرض ہے کہ یہ حدیث عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ہے، نہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے۔ ❶

دوم: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے جو تورات کا لفظ بولا ہے، تورات سے مراد ان کی صرف موسیٰ علیہ السلام کی کتاب نہیں، بلکہ وہ سب پہلی کتابیں مراد ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے نبیوں کی طرف منسوب ہیں، جو آیت توارت کے حوالہ سے لکھی گئی ہے، اس کا بعض حصہ تو قرآن کا ہے، اور بعض حصہ کسی سابق کتاب کا ہے:

---

❶ دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب البيوع، باب كراهية السخب في السوق، رقم الحديث(٢٠١٨) ورقم الحديث:٤٥٥٨)

﴿ يأيها النبي إنا أرسلناك شاهدا و مبشرا و نذيرا ﴾ ❶

یہ حصہ قرآن کا ہے: جو "سورہ أحزاب" میں ہے، اس کے بعد کا حصہ کسی پہلی کتاب کا ہے، جس کو "تورات" سے تعبیر کیا ہے۔ اکثر پیشین گوئیاں "یسعیاہ" کی کتاب میں ہیں، یہ پیش گوئی بھی اسی کتاب کی ہے۔ مگر ان الفاظ کو اس ترتیب کے ساتھ اس میں تلاش کرنا ضروری نہیں، بلکہ یہ الفاظ متفرق طور پر اس میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے "سورۃ صف" میں عیسیٰ علیہ السلام کا وعظ جس ترتیب کے ساتھ ہے، اس ترتیب کے ساتھ انجیل میں نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿إني رسول الله إليكم مصدق لما بين يدي من التوراة و مبشرا برسول يأتي من بعدي اسمه أحمد﴾ ❷

"میں تمہاری طرف اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں، تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے پیچھے آنے والے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں، جس کا نام احمد ہے۔"

اب یہ تین باتیں:

1. میں رسول ہوں۔
2. تورات کا مصدق ہوں۔
3. اور آنے والے نبی کی خوشخبری دیتا ہوں۔

ایک جگہ انجیل میں نہیں، بلکہ متفرق طور پر ہیں۔ اسی طرح جو باتیں اس عبارت میں ہیں، متفرق طور پر "یسعیاہ" نبی کی کتاب میں موجود ہیں:

"دیکھو میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ، جس سے میرا دل

---

❶ الأحزاب: ٤٥

❷ الصف: ٦

خوش ہے، میں نے اپنی روح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کریگا، وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دیگی۔ وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹمٹماتی بتی کو نہ بجھائے گا۔'' ❶ (یسعیاہ:٤٢)

اس پیشین گوئی اور اس قسم کی دوسری پیشین گوئیوں سے اس قسم کے الفاظ مل جاتے ہیں۔

ثانیاً: یہ عرض ہے کہ تورات کے محرف ہونے پر داخلی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح انجیل کے محرف ہونے پر بھی دلائل موجود ہیں۔ یہ وہ تورات نہیں، جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھی۔

باب :۳۴، آیت: ۵ میں ہے:

''پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی:''

اور آیت: ٦ میں ہے:

''پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں۔''

اور آیت: ١٠ میں ہے:

''اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں، نہیں اٹھا۔'' ❷

---

❶ یسعیاہ: باب :٤٢، آیت: ١۔٤، نیز دیکھیں: باب:٩، آیت: ٦۔٧؛ باب:٤٢، آیت: ١١، باب: ٥٤، آیت: ١۔٢،

❷ استثناء، باب :٣٤، آیت: ٥، ٦، ١٠ ان عبارات سے بایں طور تحریف ثابت ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی آیات میں ایسے امور کا ذکر ہے، جن کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد سے ہے جس میں ان کی مقام وفات اور قبر وغیرہ کا ذکر ہے، جس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ یہ الفاظ کسی بعد میں آنے والے فرد نے تورات میں درج کر دیے ہیں۔

یہ تین آیتیں علی الاعلان کہہ رہی ہیں کہ یہ تورات موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھ زمانہ گزرنے پر لکھی گئی، جب کہ لوگوں کو ان کی قبر بھی یاد نہ رہی۔

دوسری شہادت یہ ہے کہ تورات میں انبیاء کے متعلق زنا تک بلکہ بت پرستی کرانے کا بھی ذکر ہے،❶ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔

یہی حال انجیل کا ہے، چار انجیلوں میں بھی اختلاف ہے، کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ۔ ان میں رطب و یابس پایا جاتا ہے۔

باقی رہی یہ بات ہے کہ مسیح نے جو یہ کہا تھا کہ ''تورات کا ایک شوشہ بھی نہیں ٹلے گا۔'' تو اس کا تعلق منسوخ ہونے کے ساتھ ہے۔ یعنی جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے، اس وقت تک منسوخ نہیں ہو گی، انجیل کے الفاظ اس طرح ہیں:

> ''منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں، کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں، ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا، جب تک سب کچھ پورا نہ جائے۔'' (متی، باب: ۵ آیت: ۱۸)

❶ دیکھیں: عہد نامہ قدیم: ۱۹، پیدائش: باب: ۱۹، آیت: ۳۰۔۳۸، سموئیل (۲)، باب: ۱۱، آیت: ۲۔۵، ان عبارات میں تصریح ہے کہ حضرت داود اور لوط علیہما السلام نے (معاذ اللہ) زنا کیا، اور لوط علیہ السلام کے متعلق (معاذ اللہ) لکھا ہے کہ انھوں نے شراب پی کر اپنی بیٹیوں سے زنا کیا، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ انھوں نے شراب پی اور وہ برہنہ ہو گئے۔ (پیدائش: باب: ۹، آیت: ۲۰۔۲۲، حضرت ہارون علیہ السلام کا شرک، پیدائش: باب: ۳۲، آیت: ۱۔۶۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بت پرستی: سلاطین (۱)، باب: ۱۱، آیت: ۱۔۱۳۔

علاوہ ازیں بائبل میں ایسے بے شمار واقعات منقول ہیں، جن سے انبیاء کرام علیہم السلام کا جھوٹا، شرابی، مکار، بت پرست، زنا کار، ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن نصاریٰ کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ وہ بائبل میں تحریف کے خوف سے ان مقدس ہستیوں کے متعلق حق و سچائی کا اعلان کریں اور ان کو ان تمام اتہامات سے مبرا قرار دیں۔

یعنی جب وہ پیشین گوئیاں پوری نہ ہوں، جن کا پورا ہونا منسوخ ہونے سے پہلے ضروری ہے، آسمان اور زمین بھی ٹل جائیں، مگر اس وقت تک تورات منسوخ نہیں ہوسکتی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جب تک آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف نہ لائیں، اس وقت تک تورات کا ایک شوشہ بھی منسوخ نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ یہودی نیک بھی تھے، وہ کسی طرح تحریف پر راضی نہ ہوسکتے تھے، اسی صورت میں قابل استدلال ہوسکتا ہے، جب ان کی رضا سے تحریف ہوئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تورات کے نسخے چرا کر تلف کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ تحریف شدہ نسخے رکھ دیئے جائیں۔ مصر میں عیسائیوں نے عربی میں قرآن کے مقابلہ میں ایک کتاب لکھی اور بہت شائع ہوئی۔ مگر جب ان کو اس کتاب کی کمزوری معلوم ہوئی، تو پوشیدہ طور پر اس کے تمام نسخے جمع کر کے خرد برد کر دیئے۔ آج اس کا ایک نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تحریف نہیں ہوسکتی تھی، مگر سابق تحریف کا تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کہ محض من گھڑت داستان ہے، کوئی معقول جواب نہیں۔ خاص کر جب تورات میں اندرونی شہادتوں سے تحریف معلوم ہوتی ہو، پس ہوسکتا ہے کہ تحریف شدہ نسخوں میں یہ عبارت نہ ہو۔ اور بعض دیگر کتابوں میں یہ بطور نقل موجود ہو، اور عبداللہ بن عمرو نے اس دوسری کتاب سے تورات کا حوالہ پڑھ لیا ہو۔ اور قرآن سے عدم تحریف پر جو آیتیں ذکر کی گئی ہیں، ان سے عدم تحریف پر استدلال کرنا درست نہیں کہ وہ وحی جوں کی توں اب بھی موجود ہے۔ اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس بات کو ماننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد و ہدایت شروع سے جاری کیا اور اب تک چلا آیا، خواہ وہ محفوظ رہا ہو یا نہ۔

اسی طرح جس آیت میں انجیل کے متعلق یہ لکھا ہے کہ: ''اس میں ہدایت اور

نور ہے" خواہ محرف ہو یا اصلی، کیونکہ قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ انجیل محفوظ ہے۔ اور قرآن نے یہ بھی نہیں کہا کہ موجودہ انجیل میں نور اور ہدایت ہے، کیونکہ عیسائی کے ہاں اناجیل ہیں اور قرآن صرف انجیل کہتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو انجیل مسیح پر نازل ہوئی اور جو وہ تلقین کرتے رہے، اور جس کا ذکر موجودہ اناجیل میں بھی ہے، اس میں نور و ہدایت ہے۔

اسی طرح قرآن نے جو تورات و انجیل کی تصدیق کی، تو انہی مسائل میں کی ہے، جو قرآن سے ملتے ہیں، جیسے قرآن "مصدق" ہے، ساتھ ساتھ "مهيمن"❶ بھی ہے۔ ان کتابوں پر رقیب بھی ہے، ان کے تحریف شدہ احکام کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

اسی طرح تیسری آیت میں جو یہ ذکر ہے کہ "جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو۔" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن پر ایمان لاؤ، کیونکہ قرآن پر ایمان لانا ہی تورات و انجیل کو قائم کرنا ہے، جیسے ایک جگہ فرمایا:

﴿ومن يكفر به من الأحزاب فالنار موعده﴾❷

"جو فرقہ قرآن سے کفر کرے، اس کا ٹھکانہ بھی جہنم ہے۔"

ایک جگہ فرمایا:

﴿فالذين آتيناهم الكتاب يؤمنون به ومن هؤلاء من يؤمن به﴾❸

"جو کتاب سے واقف ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان مشرکین

---

❶ المائدة: ٤٨

❷ هود: ١٧

❸ العنكبوت: ٤٧

سے بھی بعض ایماندار ہیں۔''

اور جس آیت میں یہ ذکر ہے :"فیها حكم الله" (اس میں اللہ کا حکم ہے) اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ تجھے حَکَم اس لئے نہیں بناتے کہ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کرتے ہیں، اگر ایسی بات ہوتی، تو جس مسئلہ میں تیرے پاس آئے تھے، کیا اس میں اس مسئلہ کا کوئی جواب نہ تھا۔ کیا وہ اللہ کا حکم نہ تھا، یعنی اللہ کا حکم تھا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تورات میں تحریف احکام میں نہ ہوئی ہو، بلکہ اعتقادات اور واقعات میں ہوئی ہو۔

یہاں ایک نحوی نکتہ بھی بیان کیا ہے، شاید یہ درس نظامی کا بھولا ہوا کوئی مسئلہ ہو، جار و مجرور کے متعلق بتایا ہے کہ "کائن" محذوف ہے، پس معنی ہوا: ''تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے۔'' اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ ''اسم فاعل'' یا ''مفعول'' کو مقدر کرنا کوفیوں کا مذہب ہے۔ بصری "ثبت" یا "وجد" نکالتے ہیں۔ اگر "کائن" سے موجود ہونا سمجھا جاتا ہے، تو "ثبت" اور "وجد" سے یہ سمجھا جائے گا کہ اس میں اللہ کا حکم تھا۔

• آگے ایک اور آیت ہے:

﴿فيها هدى ونور﴾

''اس میں ہدایت اور نور موجود ہے۔''

حالانکہ یہ جملہ حال واقعہ ہوا ہے۔ یعنی ہم نے تورات کو اس حالت میں نازل کیا کہ اس میں ہدایت اور نور ہے۔

اس کے بعد ایک آیت غلط لکھ دی ہے:

"ولو آمن أهل الكتاب وما أنزل إليهم من ربهم......"

صحیح آیت اس طرح ہے:

﴿ولو أنهم أقاموا التوراة والإنجيل وما أنزل إليهم من ربهم لأكلوا من فوقهم......﴾ [1]

''اگر یہ لوگ تورات وانجیل اور دوسری کتابوں پر عمل کرتے، جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھیں، ان کی معیشت میں فراوانی ہوتی۔''

آگے اس اعتراض کہ ''جب تورات وانجیل اصل حالت میں تھیں، تو قرآن کی کیا ضرورت پڑی'' کا جواب یہ دیا ہے کہ ''قرآن اس لئے آیا کہ وہ کتابیں عربی زبان میں نہ تھیں۔ نہ یہ کہ وہ مسخ ہو چکی تھیں'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن صرف عربوں کے لئے ہے، ہمارے لئے اردو یا پنجابی میں کتاب ہونی چاہیے۔ قرآن کی اس آیت میں جو وجہ قرآن کے نزول کی بیان کی گئی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی وجہ ہے، بلکہ یہ وجہ بھی ہے کہ تمہارا یہ اعتراض بھی نہ رہے، اگرچہ اعتراض کوئی معقول نہیں، ورنہ لازم تھا کہ کچھ مدت پہلے ہی قرآن اترتا، اس واسطے اس آیت سے یہ سمجھنا کہ پہلی کتب کا مسخ ہونا، اس کے نزول کی وجہ نہیں، باطل ہے۔ بلکہ قرآن مجید کے نزول کے بہت سے اسباب ہیں:

نزولِ قرآن کے اسباب:

① اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ عرب کے ذریعہ سارے عالم کو دعوت دی جائے اور وہ دعوت اسی صورت میں مکمل ہو سکتی تھی کہ پہلے ان کی زبان میں کتاب اتاری جائے، تاکہ کتاب سے کما حقہ واقف ہو سکیں۔

---

[1] المائدة:٦٦

② پہلی کتابیں محرف ہو چکی تھیں، ان میں واقعات اور عقائد میں رد و بدل ہو چکا تھا، ان سے حقیقتِ حال کا معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ قرآن نے جابجا یہودیوں اور عیسائیوں کے رد میں ان کے فاسد عقائد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اناجیل پڑھ کر توحید کا خالص پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔

③ وہ کتابیں مکمل نہ تھیں، مثلاً یوم جزا کی تفصیل سے دونوں کتابیں معرا ہیں اور عقائد اور مسائل کی حکمتیں اور ان کے دلائل بیان کرنے میں کم زبان ہیں۔

④ ان کے بعض مسائل پر عمل کرنے کا وقت گذر چکا ہے، وہ احکام وقتی تھے۔

⑤ وہ کتابیں اور ان کے احکام عالمگیر نہ تھے، بلکہ خاص خاص قوموں کیلئے وہ کتابیں آئیں۔

اس کے بعد صفحہ (۱۹۲) میں چوتھے پارہ کی آیت ﴿لیسوا سواء......﴾ سے یہ سمجھا ہے کہ اس میں جس جماعت کی تعریف کی گئی ہے، وہ ابھی تک اپنے مذہب پر قائم ہے۔ غلط ہے، بلکہ اس جگہ اس جماعت سے وہ لوگ مراد ہیں، جو حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اس جگہ ''آیات'' سے مراد قرآن کی ''آیات'' ہیں۔ ❶

''اسلام'' کا معنی:

اسلام اگرچہ سب انبیاء کا مذہب تھا، مگر آنحضرت ﷺ کی آمد پر ''اسلام'' کا لفظ اسی مذہب پر بولا جاتا ہے، جو قرآن و سنت کی شکل میں مسلمانوں کے پاس ہے اور اسی کے پیروؤں کو مسلمان کہتے ہیں، کیونکہ پہلے ادیان منسوخ ہو چکے ہیں۔ نسخ کے بعد اب ان کو اسلام نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اسلام کے معنی فرمانبرداری کے ہیں،

❶ دیکھیں: تفسیر الطبري: ۳۹۷/۳، تفسیر البغوي: ۴۰۶/۱، تفسیر القرطبي: ۱۷۱/۴، زاد المسیر: ۴۴۱/۱، الدر المنثور: ۲۹۶/۲، تفسیر ابن کثیر: ۵۲۷/۱،

جب تک فرمان ہے، اس وقت تک تو اس کی تعمیل کو فرمانبرداری کہیں گے، مگر جب حکم اور فرمان کا وقت ہی گذر گیا، تو اس وقت اس کی تعمیل کو نافرمانی کہتے ہیں۔ پس عیسائی اور یہود کو اس وقت مسلمان کہہ سکتے ہیں، جب وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع کریں۔

یہ کہنا ''قرآن چونکہ پہلی کتابوں میں ہے، اس لئے پہلی کتابوں پر عمل کرنے والا قرآن کا عامل ہے'' یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا ذکر پہلی کتابوں میں ہے یا اس کے بعض مسائل، نہ جمیع مسائل۔ اس آیت ﴿إن هذا لفي الصحف الأولىٰ﴾ (یہ مسئلہ پہلی کتابوں میں ہے) سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ سارا قرآن پہلی کتابوں میں ہے۔ [1] پس ثابت ہوا کہ تورات کے غیر محرف ہونے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں، بلکہ داخلی اور خارجی ایسی دلیلیں موجود ہیں، جن سے تورات اور انجیل کا محرف ہونا پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث کا حوالہ ہم ''یسعیاہ'' کی کتاب (باب: ۴۲) سے دے چکے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جس کتاب سے یہ حوالہ نقل کیا ہے، وہ اصل کتاب نہ ہو، بلکہ اس میں نقل ہو اور نقل میں ناقل کی غلطی ہو۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کوئی معصوم نہ تھے کہ ان سے غلطی کا تصور ممنوع ہو، یعنی ہوسکتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے ناقل پر اعتماد کر کے لکھ دیا ہو۔

چھٹا اعتراض:

اس کے بعد بخاری پر ایک اور اعتراض کرتے ہیں:

---

[1] اکثر مفسرین کے نزدیک مذکورہ بالا آیت کریمہ میں مذکورہ اشارہ (هذا) کا مرجع اس سورت میں مذکور تزکیۂ نفس، ذکر اللہ اور آخرت کے متعلق عقیدہ ہے، اس سے سارا قرآن مجید مراد نہیں۔ (تفسير القرطبي: ۲۰/۲۵، زاد المسير: ۴/۴۳۳، فتح القدير: ۵/۶۰۳

’’چہارم: قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ لکھ سکتے اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ’’بخاری‘‘ میں ہے: ’’وہ لکھ سکتے تھے۔‘‘ حدیث یوں چلتی ہے کہ جب حضور ﷺ ذیقعدہ میں عمرہ کیلئے تشریف لے گئے، تو اہل مکہ نے کچھ پابندیاں عائد کر دیں اور اس سلسلہ میں ایک تحریری معاہدہ ہوا، جسے ’’محمد رسول اللّٰه‘‘ تسلیم کرتے ہیں۔ اہل مکہ نے ’’رسول اللّٰه‘‘ کے لفظ پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم آپ کو ’’رسول اللّٰه‘‘ ماننے کیلئے تیار نہیں، اس لئے آپ ’’محمد بن عبداللّٰه‘‘ کی حیثیت سے معاہدہ کریں۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ’’رسول اللّٰه‘‘ کے الفاظ مٹا دو:

’’قال لا واللّٰه لا أمحوك أبدا فأخذ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الكتاب فكتب هذا ما قاضى عليه محمد بن عبداللّٰه......‘‘ [1]

’’علی نے جواب دیا: خدا کی قسم میں آپ کے نام سے ’’رسول اللّٰه‘‘ کا لفظ جدا نہیں کروں گا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے وہ کاغذ اٹھا لیا اور اس پر لکھ دیا: یہ وہ فیصلہ ہے جسے محمد بن عبداللہ تسلیم کرتے ہیں۔‘‘

بخاری کی ایک اور روایت (۲/ ۱۳۵) بتلاتی ہے کہ حضور ﷺ نے ’’رسول اللّٰه‘‘ کا لفظ کھرچ ڈالا تھا [2] اور کاتب نے ’’ابن عبداللہ‘‘ کے لفظ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الصلح، باب كيف يكتب هذا ما قاضى فلان بن فلان...... الحديث (٢٥٥٢)

[2] صحيح البخاري: كتاب الخمس، باب المصالحة على ثلاثة أيام أو وقت معلوم، رقم الحديث(٣٠١٣)

اور تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے، اس لئے لکھنے والی حدیث غلط ہے۔" (دو اسلام: ۱۹٦)

جواب:

پہلی حدیث میں جو "کَتَبَ" (لکھا) ہے، اس کے معنی "لکھانے" کے ہیں، جیسے قرآن مجید میں جا بجا اس صیغہ کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے:

﴿كتاب الله عليكم﴾ [1]

"یہ حکم اللہ نے لکھا ہے۔"

یعنی اس کو قرآن میں نازل کیا ہے، جس کے لکھنے کا حکم ہے۔

﴿ونكتب ما قدموا﴾ [2]

ہم لکھتے ہیں، جو انہوں نے آگے بھیجا۔"

﴿سنكتب ما قالوا﴾ [3]

"جلدی لکھیں گے ہم ان کی بات۔"

ان تینوں مقامات پر لکھنے سے مراد لکھانا اور لکھنے کا حکم کرنے کے ہیں۔ لہٰذا یہ پہلی حدیث بھی صحیح ہے اور ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض بھی نہیں!

---

[1] النساء: ٢٤

[2] یٰسین: ١٢

[3] آل عمران: ١٨١

نواں باب

''حضور کی تصویر حدیث میں''

''قرآن میں حضور ﷺ کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ إنك لعلىٰ خلق عظيم ﴾ ❶

''اے رسول! تمہارا کردار عظیم الشان ہے۔''

اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا صرف احادیث کی بدولت ہوا، اور ہم حدیث کے اس گراں بہا ذخیرے پر ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ لیکن بعض ایسی احادیث بھی ہیں، جو کائنات کے اس محسن اعظم کا کردار نہایت بھیانک شکل میں پیش کرتی ہیں، اتنا بھیانک کہ ہم شرم سے کسی کو بتا بھی نہ سکیں۔ درست کہا تھا مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے کہ ''میں کسی نومسلم یورپین کو صحیح بخاری نہیں پڑھا سکتا اور اس کی وجہ میں مجلس عام میں نہیں بتا سکتا۔'' (الفرقان شاہ ولی اللہ: ۲۸۵)

وہ وجہ کیا تھی؟ آیئے آج ہم اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں!

اعتراض:

صحیح بخاری میں روزے کی نہایت عمدہ تشریح درج ہے:

"فإنه يترك طعامه وشرابه وشهوته من أجلي" ❷

''روزے دار اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت میرے لئے چھوڑ دیتا ہے۔''

---

❶ القلم: ٤

❷ صحيح البخاري: كتاب الصوم، باب فضل الصوم، رقم الحديث(١٧٩٥)

ایک اور حدیث دیکھئے:

"من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه" (بخاری) ❶

"جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ اور بدکاری سے باز نہیں رہ سکتا، اسے کہہ دو کہ اس کو بھوک اور پیاس کی قطعاً ضرورت نہیں!"

ان احادیث میں روزے کا فلسفہ واضح ہو گیا۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنے ان ارشادات پر خود کہاں تک عمل کیا؟

"عن عائشة رضى الله عنها قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم يقبل ويباشر وهو صائم" (بخاری) ❷

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام روزہ رکھ کر اپنے ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے مباشرت فرماتے۔"

مباشرت کے معنے ہیں مجامعت اور بوس و کنار وغیرہ۔ لیکن اس حدیث میں مباشرت سے کیا مراد ہے؟ مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنئے!

آپ "صحیح مسلم" کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" المباشرة فوق السرة وتحت الرقبة بالذكر والقبلة أو المعانقة أو اللمس وغير ذلك حلال باتفاق المسلمين"

(فتح الملهم ١/٤٥٦)

"آپ روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم، رقم الحديث(١٨٠٤)

❷ صحيح البخاري: كتاب الصوم، باب المباشرة للصائم، رقم الحديث(١٨٢٦)، صحيح مسلم: كتاب الصيام، باب بيان أن القبلة في الصوم ليست محرمة، رقم الحديث (١١٠٦)

مباشرت کر سکتے ہیں۔ یعنی اسے چھو سکتے ہیں، چوم سکتے ہیں، گلے لگا سکتے ہیں اور آلہ تناسل کا استعمال کر سکتے ہیں۔''

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے:

اول: روزے کا مقصد شہوت کو ترک کرنا ہے، نہ کہ بوس و کنار اور گھٹنوں کے نیچے آلہ تناسل کا استعمال!

دوم: یہ حدیث اوپر والی دو حدیثوں سے متصادم ہوتی ہے۔

سوم: یہ قرآن سے ٹکراتی ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ أحل لكم ليلة الصيام الرفث الىٰ نساء كم ﴾ [1]

''ماہ صیام میں رات کے وقت ہم تمہیں بیویوں سے متمتع ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔''

آغاز اسلام میں رات کے وقت بیویوں سے اختلاط ممنوع تھا، بعض صحابہ رک نہ سکے، تو یہ پابندی دور کر دی گئی، تو فرمایا کہ ''اب تم مباشرت کر سکتے ہو۔'' [2]

یعنی صرف رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے، لیکن یہ حدیث مکمل چھٹی دیتی ہے۔

چہارم: گناہ اور محرّماتِ گناہ ہر دو سے بچنا ضروری ہے، اپنے آپ کو دیکھو اور انصافاً کہو کہ کیا آج تک کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے اور گلے لگانے کے بعد جماع سے بچ سکا ہے؟

پنجم: حضور علیہ السلام کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم یہ سن لے کہ حضور ۵۶

---

[1] البقرة: ۱۸۷

[2] صحيح البخاري: كتاب التفسير، باب ﴿ أحل لكم ليلة الصيام الرفث...... ﴾ رقم الحديث (٤٢٣٨)، تفسير الطبري: ٢/ ١٦٧

برس کی عمر میں روزہ رکھ کر مباشرت فرمایا کرتے تھے، تو وہ ہمارے نبی کے متعلق کیا رائے قائم کریگا۔؟ یہی وہ حدیث ہے، جس نے مجھے احادیث سے بدظن کیا اور اس کتاب کی محرک بنی۔" (دو اسلام: ۲۰۲)

جواب

ان تمام اعتراضات کا مدار دو چیزوں پر ہے:

1. روزہ کی حقیقت۔
2. مباشرت کے حقیقی اور کنائی معنی میں فرق۔

روزہ بالاتفاق اکل و شرب و جماع کے ترک کا نام ہے، جس کی ابتداء صبح صادق سے ہوتی ہے اور انتہاء سورج کے غروب ہونے پر۔ پہلی اور دوسری حدیث میں جو لفظ "شہوت" آیا ہے، اس سے مراد جماع ہے، پس باقی چیزیں حرام نہیں۔

مباشرت کا لفظ قرآن مجید میں جماع سے کنایہ ہے اور حدیث میں لغوی معنی مراد ہے، مگر جماع اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ مائی صاحبہ سے ہی دوسری حدیث میں آیا، کہ آنحضرت ﷺ اپنی حاجت کو روکنے پر قادر تھے۔ ❶ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ "مباشرت" سے مراد ماسوا جماع ہے۔ اور "مباشرت" کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ ماسوا جماع کے سب کو شامل ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ جتنے معانی اس کے مولانا شبیر احمد صاحب نے یہ گنوائے ہیں، وہ سب یہاں مراد ہوں، صرف بدن سے بدن لگ جائے، تو بھی "مباشرت" کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ ❷

---

❶ بلکہ اس حدیث میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں، جو برق صاحب نے کسی غرض کی وجہ سے نقل نہیں کیے، حدیث کا بقیہ حصہ ہے: "و كان أملككم لإربه" یعنی رسول اللہ ﷺ اپنی خواہشات پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے۔ صحيح البخاري (١٨٢٦)

❷ لفظ "مباشرت" کا اصل اشتقاق "بشر" ہے، جس کا معنی ظاہری چیز ہے، اسی سے لفظ "بشرة" ماخوذ ہے، جس کا معنی انسان کی ظاہری جلد ہے۔ (معجم مقاييس اللغة: ١١٧) لہٰذا "مباشرت" کا ←

آپ کا پہلا اعتراض اس لئے غلط ہے کہ روزے کی حقیقت میں ہر قسم کی شہوت کو روکنا داخل نہیں، بلکہ شہوتِ جماع سے روکنا داخل ہے اور دوسری حدیث میں بدعملی اور جھوٹ سے بچنا بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مگر بوس و کنار وغیرہ سے بچنا مقصدِ روزہ نہیں ❶ نہ اس پر کوئی آیت و حدیث صراحتاً دلالت کرتی ہے۔ آپ اپنے

← لغوی معنی ہوا: دو انسانوں کی جلد کا ملنا'' اور اس کا استعمال جماع اور بدون جماع بدن کے ملاپ پر ہوتا ہے۔ اور علماء لغت نے بھی مذکورہ بالا حدیث میں مباشرت کا معنی ''ملامسة'' کیا ہے۔ یعنی جسم کا کسی دوسرے جسم سے ملنا۔ دیکھیں: كتاب العين: ٢٥٩/٦، لسان العرب: ٥٩/٤، النهاية لابن الأثير: ٣٣٣/١، تاج العروس، مادة(بشر) نیز دیکھیں: فتح الباري: ١٤٩/٤

❶ اور اس حدیث سے یہی بیان کرنا مقصود ہے...... دین اسلام دین فطرت ہے۔ یہ دین انسانوں کے لیے نازل ہوا اور انسانی فطرت کے کسی بھی پہلو اور کسی بھی گوشہ کو اس نے نظر انداز نہیں کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کی باتیں (جن کے متعلق صاحب ''دو اسلام'' نے لکھا ہے کہ ہم'' مارے شرم کے کسی کو بتا بھی نہ سکیں) امت کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اسلام اگر بعض باتوں سے منع کر سکتا اور ان پر پابند عائد کر سکتا ہے، تو اسی قسم کی بعض دوسری باتوں کی اجازت بھی تو دے سکتا ہے۔ اسلام اگر روزے کی حالت میں جماع سے منع کر سکتا ہے(جو منع ہے) تو بوس و کنار کی اجازت کیوں نہیں دے سکتا (جو کہ روزے کی حالت میں جائز ہے؟)

دین اسلام صرف عقائد کا نام نہیں، بلکہ انسان کی عملی زندگی بھی اس میں داخل ہے، جبھی تو انسانی افعال میں سے بعض پر پابندی عائد کرتا ہے، بعض کو جائز قرار دیتا ہے اور بعض کو ثواب کا درجہ دے دیتا ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسانی افعال کے ساتھ اس دین کا گہرا تعلق ہے، تو پھر ان کی تشریح و توضیح میں شرم کا کیا سوال؟...... یہ باتیں تو دین کا حصہ ہیں، اسی لیے ایک ایک بات پر نہایت باریک بینی کے ساتھ بحث کی گئی، مبادا کوئی شخص اپنے اعمال ضائع کر بیٹھے یا بلاوجہ شکوک و شبہات اور اوہام وظنون کا شکار ہو کر رہ جائے۔

پھر یہ بات بھی زیر نظر رہنی چاہیے کہ حدیث قرآن کی تفسیر ہے، اگر قرآن مجید ﴿فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ﴾، ﴿فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ﴾، ﴿أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ﴾ (ایک صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ حدیث میں نہایت گندی گندی باتوں کا ذکر ہے، حتی کہ منی کے مسائل پر بھی بحث کی ←

دماغ میں روزہ کا مقصد یہ فرض کر رہے ہیں کہ مطلقاً شہوت کو ترک کر دے، یعنی اچھا کپڑا نہ پہنے، بدن میں تیل نہ لگائے، کنگھی نہ کرے، یعنی کوئی بھی کام خواہش کے مطابق نہ کرے...... یہی بنیادی غلطی ہے، جس کی بناء پر آپ نے حدیث پر اعتراض کیا۔

دوسرا اعتراض بھی اس لئے غلط ہے کہ بوس و کنار اور بدن کا چھونا شہوت ممنوعہ میں داخل نہیں۔ نہ ''مباشرت'' کے مرادی معنی میں داخل ہے۔ اس واسطے حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ تیسرا اعتراض بھی باطل ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ''مباشرت'' کنایہ ہے جماع سے، اور حدیث میں اس کا لغوی معنی مراد ہے۔ اس لفظ کے مختلف معنے ہوں، تو ان کے احکام میں نفی و اثبات کی صورت بن جاتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿قد أفلح من زكّٰها﴾ ❶

← تمھی ہے...... فکر ہر کسے بقدر ہمت اوست) وغیرہ قسم کے الفاظ و فقرات کا استعمال کر سکتا ہے۔ تو حدیث پر بے شرمی کا فتویٰ کیوں لگایا جاتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ آپ کا فلسفہ شرم، حدیث اور قرآن کے فلسفہ سے مختلف ہے۔ کتاب و سنت میں اگر کسی مسئلہ کو فطرت انسانی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مفصل بیان کیا جاتا ہے، تو یہ چیز شرم سے بعید معلوم ہوتی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ بات بات میں فحش گالیوں کا بے محابا استعمال ہوتا ہے، حتی کہ کلام میں زور ہی گالیوں کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ آپ کے شاعر اور ادیب عورت کے جسمانی اعضاء کے ایک ایک حصہ کی تفصیل بیان کریں۔ آپ کے مصوران نقوش کو اپنی تصاویر میں بڑھ چڑھ کر اجاگر کریں۔ آپ کے رسائل و اخبارات ننگی تصویریں چھاپیں تو کوئی حرج نہیں؟ معاف کیجیے کہ اگر نو مسلم یورپین موجودہ دور کے مسلمانوں کی ان حرکتوں کو دیکھ کر دین اسلام سے متنفر نہیں ہو سکتے، تو مطمئن رہیے کہ وہ بخاری شریف کی ان احادیث کو پڑھ کر دین اسلام سے قطعاً دور نہیں بھاگیں گے، جو انسانی فطرت کو حد کمال تک ملحوظ رکھ کر مسائل بیان کرتی ہیں۔

❶ الشمس: ۹

''جو تزکیہ کرے (یعنی اپنے آپ کو پاک کرے) وہ کامیاب ہوگا۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فلا تزكوا أنفسكم ﴾ ❶

''اپنا تزکیہ (اپنے آپ کو پاک سمجھنا) نہ کرو۔''

چوتھا اعتراض اس لئے باطل ہے کہ سدِّ ذرائع کا مسئلہ شریعت میں مستقل ہے۔ اس میں ہر جگہ کلی قانون نہیں ہوتا، ہر آدمی اس معاملہ میں اپنے نفس کا فقیہ ہے۔ جس کو ڈر ہو، وہ ایسا نہ کرے، جس کو نہ ڈر ہو، وہ ایسا کرسکتا ہے۔ اگرچہ عمر رسیدہ ہونے کی بناء پر بعض آدمیوں کے لئے موزوں نہیں، مگر بیوی اگر جوان ہو، اور اس کی خواہش ہو، تو رکنا بھی دانشمندی نہیں۔ بہرکیف شریعت نے بھی اس میں سدِّ ذرائع کا خیال رکھا ہے۔ ❷ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک جوان کو بوس و کنار کی اجازت نہ دی، لیکن ایک بوڑھے نے اجازت چاہی، تو اس کو اجازت دیدی۔ ❸ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس سے منع کرتے تھے، ❹ مالکی مذہب میں بھی منع ہے۔ ❺

اعتراض

''عن عائشة أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقبلها و هو

❶ النجم: ٣٢

❷ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ ایسی ہی خود ساختہ پابندیوں کے متعلق فرماتے ہیں: ومن خاف على أمة محمد مالم يخفه عليها نبيها فقد جاء من التعسف بما لا يخفى ''(التمهيد: ٢٢/٢٦٧)

❸ سنن أبي داود: كتاب الصيام، باب كراهيته للشاب، رقم الحديث (٢٣٨٧)

❹ الموطا: ١/٢٩٣، مصنف عبد الرزاق: ٤/١٨٩، مصنف ابن أبي شيبة: ٢/٣١٧، مرفوع حدیث سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے اور کئی صحابہ سے بھی اس کا جواز مروی ہے، لہٰذا اگر انسان کو اپنے آپ پر قابو ہو، تو یہ عمل مباح ہے۔ واللہ أعلم۔

❺ الاستذكار: ٣/٢٩٦، المدونة الكبرى: ١/٢٦٨

صائم ویمص لسانها" [1]

''نبی ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے اور زبان چوستے''!

کیا زبان چوسنے سے دوسرے کا تھوک اپنے تھوک میں مل کر پیٹ میں نہیں چلا جاتا اور کیا اس صورت میں روزہ باطل نہیں ہو جاتا؟

(دو اسلام: ۲۰۵)

جواب:

چوسنے سے لازم نہیں آتا کہ زبان کی تھوک کو نگل لیں، چوس کر انسان تھوک بھی سکتا ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں، اشکال جب ہوتا، اگر حدیث میں نگلنے کا لفظ ہوتا۔ [2]

اعتراض:

اس کے بعد ایک حدیث بیان کی ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ

''مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمن کو کہا کہ اپنی بیوی کا بوسہ لینے اور اس کے ساتھ دل لگی کرنے سے تجھے کیا چیز مانع ہے؟ عبداللہ نے کہا: میں روزہ کی حالت میں ایسا کر سکتا ہوں؟ آپ نے

---

[1] سنن أبي داود: كتاب الصيام، باب الصائم يبلع الريق، رقم الحديث(٢٣٨٦)، مسند أحمد: ١٢٣/٦، صحيح ابن خزيمة: ٢٤٦/٣، سنن البيهقي: ٢٣٤/٤، اس حدیث کو ابن عدی، زیلعی، ابن حجر اور البانی رحمہم اللہ نے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ (الكامل: ١٩٨/٦، ٤٦٨، نصب الراية: ٣٢٢/٤، فتح الباري: ١٥٣/٤، ضعيف أبي داود: ٢٣٦/١ (٥١٥)

[2] اسی لیے امام زیلعی فرماتے ہیں کہ امام ابو داود کی اس حدیث پر بایں الفاظ تبویب متنازع اور درست نہیں، کیونکہ چوسنے سے نگلنا لازم نہیں آتا، ممکن ہے کہ آپ ﷺ چوسنے کے بعد تھوک باہر پھینک دیں۔ نصب الراية: ٣٢٢/٤، نیز دیکھیں: عون المعبود: ١٠/٧

فرمایا: ہاں![1] مائی صاحبہ نے اسود کو روکا[2] اور اپنے بھتیجے کو اجازت دیدی“!

جواب:

ان دونوں میں فرق ہو گا، ایک کے متعلق خطرہ ہو گا، دوسرے کے متعلق خطرہ نہیں ہو گا اور یہ باتیں مخاطب متکلم سمجھ سکتا ہے۔ بوسہ اور عورت سے کھیلنا فی نفسہ برائی نہیں۔ اگر خطرہ ہو، تو منع ہے، ورنہ نہیں۔ مفتی کو حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینا چاہیے۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اور حالات، ماحول، ملک اور رواج کے اختلاف سے گفتگو میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔

اعتراض:

آگے ایک عجیب بات تحریر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ:

”آج تک کسی بیوی نے اپنے شوہر سے مباشرت کی التجا نہیں کی اور نہ مرد کے سامنے عریاں بات کہی۔“

جواب:

اس جگہ مصنف کو قرآن کی آیت بھی یاد نہیں رہی:

﴿وراودته التي هو في بيتها عن نفسه وغلقت الأبواب

---

[1] الموطا: ۱/۲۹۲، مصنف عبد الرزاق: ۴/۱۸۳، شرح معاني الآثار: ۲/۹۵،

[2] مسند أحمد: ۶/۱۲۸، سنن النسائي الكبرى: ۲/۲۱۰، سنن البيهقي: ۴/۲۳۲، مسند إسحاق بن راهويه: ۳/۸۸۷، اس کی سند میں ”حماد بن أبي سليمان“ ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اس اثر کے متعلق فرماتے ہیں: ”و هو بهذا السياق عن الأسود غريب، تفرد به جماعة عن إبراهيم عنه، و حماد هو ابن أبي سليمان مع فضله و فقهه في حفظه ضعف، فلا يقبل منه ما تفرد به مخالفا فيه الثقات (إرواء الغليل: ۴/۸۰).

وقالت هيت لك﴾ ❶

کہ جس عورت کے گھر یوسف علیہ السلام رہتے تھے، اس نے مباشرت کی التجا کی اور دروازے بند کر کے عریاں بات کہی۔

اعتراض: مباشرت در حیض

قرآن شریف میں مذکور ہے:

﴿يسئلونك عن المحيض قل هو أذى فاعتزلوا النساء في المحيض ولا تقربوهن حتىٰ يطهرن فإذا تطهرن فأتوهن من حيث أمركم الله ......﴾ ❷

اس آیت میں دو حکم دیئے گئے ہیں:

اول: حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہیے۔

دوم: ان کے قریب تک مت جایئے۔

ذرا دیکھیں کہ حدیث نے اس "قریب و دور" کی کیا تشریح پیش کی ہے:

"عن عائشة كان يأمرني فأتزر فيباشرني وأنا حائض" ❸

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں: مجھے آپ حکم دیتے، میں ازار باندھ لیتی، پھر مجھ سے مباشرت کرتے۔"

اس سے اگلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ "عائشہ فرماتی ہیں: جب حضور حیض

---

❶ يوسف: ٢٣

❷ البقرة: ٢٢٢

❸ صحيح البخاري: كتاب الحيض، باب مباشرة الحائض، رقم الحديث (٢٩٥)

کی حالت میں مباشرت کا ارادہ فرماتے، تو پہلے ایک تہہ پوش پہنا دیتے، پھر مباشرت کرتے۔"❶ یہ ہے قریب و دور کی تشریح حدیث کی!

ہم عرض کر چکے ہیں کہ محرکات گناہ سے بچنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا گناہ سے، اور اسی لئے قرآن نے بار بار کہا ہے کہ حدود الٰہی کے قریب مت جاؤ،❷ فواحش کے قریب مت جاؤ،❸ مشہور حدیث ہے:

"من حام حول الحمى وقع فيه" ❹

''چراگاہ کے اردگرد گھومنے والا جانور عموماً چراگاہ میں گھس جاتا ہے۔''

ایک اور حدیث ہے کہ جو شبہات سے بچے، وہ اپنے دین اور عزت کو بچا لیتا ہے ❺ اور حضور علیہ السلام اس معاملہ میں سخت محتاط واقع ہوئے ہیں:

"واللہ إني لأ تقاكم"❻

---

❶ مصدر سابق، رقم الحدیث (٢٩٦)، برق صاحب نے اس حدیث کے باقیماندہ حصہ کو نقل کرنے کے بعد اس کا ترجمہ نہیں کیا، کیونکہ وہ ان کے خود ساختہ مفہوم کے منافی ہے، ملاحظہ فرمائیں: "و أيكم يملك إربه كما كان النبي ﷺ يملك إربه" ان الفاظ میں اشارہ ہے کہ قوت ضبط کی موجودگی میں یہ امر مباح ہے، مطلقاً نہیں!

❷ دیکھیں: البقرة: ١٨٧

❸ الأنعام: ١٥١

❹ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس معنی کی حدیث روایت کی ہے، جس کے الفاظ ہیں: "من يرتع حول الحمى يوشك أن يواقعه" (بخاري: ١٩٤٦) مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نہیں ملی۔ واللہ اعلم

❺ صحيح البخاري: كتاب الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه، رقم الحديث (٥٢)، صحيح مسلم: كتاب المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، رقم الحديث (١٥٩٩)

❻ صحيح مسلم: كتاب الصيام، باب بيان أن القبلة في الصوم ليست محرمة على من لم تحرك شهوته، رقم الحديث (١١٠٨)

”اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔“
پھر ہم کیسے تسلیم کرلیں کہ آپ اس حالت میں مباشرت کریں!“

(دو اسلام: ۱۱۰)

جواب:

اس اعتراض میں پھر وہی کنایہ اور لغوی معنی میں عدم فرق ہے۔ قرآن میں اعتزال اور عدم قرب ”ترک جماع“ سے کنایہ ہے، جس طرح عورت کے پاس آنا بھی جماع سے کنایہ ہے، یہاں ان الفاظ کا استعمال لغوی معنی میں نہیں، اور حدیث میں جو ”مباشرت“ کا لفظ آیا ہے، وہاں لغوی معنی مراد ہے۔ جس کی تفصیل ہم گذشتہ ابواب میں بیان کر آئے ہیں۔

شبہات کی حدیث کا بیان یہاں بے معنی ہے، کیونکہ ”مباشرت“ بمعنی لغوی حلال ہے اور مباشرت جو جماع سے کنایہ ہے، وہ بحالت حیض و روزہ حرام ہے، لہٰذا کوئی بات یہاں مشتبہات میں داخل نہیں!

اسی طرح اس حدیث ”لأ تقاکم“ (کہ میں تم سب سے زیادہ متقی ہوں) کا یہاں پیش کرنا بھی بے محل ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جو کام آنحضرت ﷺ نے کیا، وہ تقویٰ کے خلاف نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ تقویٰ کے انتہائی مقام پر ہیں۔

اسی طرح جو حدیث میں ہے: ”وکان أملککم“

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی حاجت پر قابو رکھتے تھے۔ دواعی شہوت سے آپ ﷺ کے مغلوب ہونے کا اندیشہ نہ تھا، یعنی جس کو اندیشہ ہو، وہ ایسا نہ کرے۔ دوسرا یہ مطلب ہے کہ دواعی شہوت کا استعمال کرنا، اس لئے نہ تھا

کہ آپ ﷺ کو اپنی ذات پر کنٹرول تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ اس میں کسی قسم کی قباحت نہ تھی۔

اعتراض:

اس کے بعد ایک اور حدیث ذکر کرتے ہیں:

''کردارِ رسول ﷺ پر ایک اور جھوٹ''

"عن عائشة قالت كنت أغتسل أنا والنبي صلى الله عليه وسلم من إناء واحد" ❶ (بخاری)

''حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن میں نہاتے تھے۔''

مسلم میں اس طرح ہے: ''جنابت کے غسل میں، مَیں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے۔'' ❷

مطلب یہ کہ حضور ازواج کے ہمراہ برہنہ غسل کرتے تھے۔(دو اسلام: ۲۱۱)

جواب:

حدیث میں تو صرف یہ ذکر ہے کہ دونوں ایک برتن میں سے غسل کیا کرتے تھے۔ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دونوں برہنہ ہوتے تھے۔ آگے جا کر خود ہی لکھتے ہیں۔ ''میں مانتا ہوں کہ شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔''!!

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الغسل، باب هل يدخل الجنب يده في الإناء قبل أن يغسلها إذا لم يكن على يده قذر غير الجنابة، رقم الحديث(٢٥٨)

❷ صحيح مسلم: كتاب الحيض، باب القدر المستحب من الماء...... رقم الحديث(٣٢١)

اعتراض:

اس کے بعد ایک اور حدیث ذکر کی ہے:

"عن عائشة قالت كنت أشرب وأنا حائض ثم أناوله النبي ﷺ فيضع فاه على موضع في فيشرب" [1] (مسلم)

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں پانی پی کر رسول اللہ کو دے دیتی، وہ میرے منہ والی جگہ پر منہ رکھ کر بچا ہوا پانی پی جاتے۔"

(دو اسلام: ۲۱۲)

جواب:

اس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حیض والی عورت کا بچا ہوا پانی پلید نہیں اور نہ اس کا منہ پلید ہے۔

اعتراض:

اس کے بعد کہتے ہیں:

"اور سنئے! ابوسلمہ کہتے ہیں: میں اور حضرت عائشہ کا بھائی حضرت عائشہ کے پاس گئے، آپ کے بھائی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح غسل فرمایا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن منگوایا، جس سے آپ نے غسل کیا اور سر پر بھی پانی ڈالا، درمیان میں ایک پردہ لٹکا ہوا تھا۔ (بخاری) [2]

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الحيض، باب جواز غسل رأس زوجها و ترجيله و طهارة سؤرها والاتكاء في حجرها و قراءة القرآن فيه، رقم الحديث(۳۰۰)

[2] صحيح البخاري: كتاب الغسل، باب الغسل بالصاع و نحوه، رقم الحديث(۲۴۸) ←

سوال یہ ہے کہ آیا یہ دونوں اس پردے میں حضرت عائشہ کو غسل کرتے دیکھ رہے تھے؟ اگر جواب نفی میں ہے، تو غسلِ رسول کی نمائش کرنے کا مقصد کیا تھا، اگر اثبات میں ہے، تو پھر وائے افسوس کہ چار نامحرم آنکھیں حضرت عائشہ کو غسل کرتے دیکھیں!'' (دو اسلام: ۲۱۳)

جواب:

محدثین جنہوں نے ذخیرہ احادیث ہم تک پہنچایا، اتنی عقل تو رکھتے تھے کہ اس حدیث پر ایک معمولی عقل والا آدمی بھی اعتراض کر سکتا ہے اور ایک کمزور ایمان والا عام سا مسلمان بھی ایسی بات کو غیرت کے منافی خیال کرے گا۔ لہٰذا ایسی احادیث کو نقل نہ کرنا چاہیے۔ پھر بھی انہوں نے اس حدیث کو نقل فرمایا، تو اس سے ان کا مقصد کیا ہے؟

اصل میں حدیث کو بڑے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں مقصد غسلِ رسول کی نمائش نہ تھا، بلکہ یہ بتلانا مقصود تھا کہ آنحضرت ﷺ غسل کیلئے نہایت قلیل مقدار میں پانی استعمال فرماتے تھے۔

مائی صاحبہ نے ایک صاع کے قریب پانی منگایا اور پس پردہ اس سے غسل فرمایا، ابوسلمہ اور آپ کے بھائی نے آپ کو غسل کرتے ہوئے نہیں دیکھا، کیونکہ درمیان میں پردہ تھا اور اصل مقصد یہ بتلانا تھا کہ اتنے قلیل پانی سے بھی غسل ہو سکتا ہے۔ مائی صاحبہ نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ شاید اس قدر قلیل پانی سے غسل کر لینا کسی کیلئے ناقابلِ یقین ہو، ایک صاع یا اس کے قریب پانی سے خود غسل کر کے اس امر کو حد یقین تک پہنچا دیا۔ اور یہ ہم تاویل نہیں کر رہے، بلکہ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس

← ، صحيح مسلم: كتاب الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة، رقم الحديث(٣٢٠)

یہ باب باندھا ہے:

"باب الغسل بالصاع ونحوه"

"ایک صاع اور اس کے قریب اتنے مقدار سے غسل جائز ہے۔"

اور یہ حدیث اسی باب کے ذیل میں دی گئی ہے۔ حدیث میں یہ لفظ ہیں:

"فدعت بإناء نحوا من صاع"

"آپ ﷺ نے ایک برتن میں جو صاع کے قریب تھا، پانی منگایا"

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال حقیقت میں پانی کی مقدار سے تھا، نہ کہ غسل کے طریقہ سے، مؤخر الذکر صورت میں غسل کا پورا طریقہ زبانی بھی بتایا جا سکتا تھا، جو کسی صورت بھی نا قابل یقین نہ تھا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ مائی صاحبہ کے رضاعی بھانجے تھے اور دوسرے ان کے اپنے بھائی تھے۔ لہٰذا دونوں محرم تھے، جیسا کہ فتح الباري میں ہے۔ ❶

اعتراض:

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ذرا اس حدیث کے الفاظ دیکھیے:

"عن أبي هريرة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال إذا جلس بين شعبها الأربع ثم جهدها فقد وجب عليه الغسل وإن لم ينزل" ❷

❶ فتح الباري: ۱/ ۳٦٥

❷ صحيح البخاري: كتاب الغسل، باب إذا التقى الختان الختان، رقم الحديث (۲۸۷)، صحيح مسلم: كتاب الحيض، باب نسخ الماء من الماء، رقم الحديث (۳٤۸)

ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی مرد عورت کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے، تو اس کیلئے نہانا ضروری ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔''

حدیث کی زبان دیکھئے! (دو اسلام: ۲۱٤)

جواب:

یہ تو مترجم کا اختیار ہے، چاہے مہذب لفظ استعمال کرے یا برہنہ، حدیث میں جو لفظ ہیں، اس کا ترجمہ ''ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا'' صریح بے انصافی ہے۔ حدیث میں ''شعب'' کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنے شاخوں اور ٹہنیوں کے ہیں اور یہ کنایہ ہے، لیکن ٹانگوں کا لفظ صریح ہے۔ پھر ''جَهَدَهَا'' کا معنی زور لگانے کے بھی ٹھیک نہیں، بلکہ اس سے بہتر لفظوں میں اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً پوری حدیث کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ

''جب کوئی شخص عورت کے پاس آئے، تو خواہ انزال ہو یا نہ ہو، اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے!''

اعتراض: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح

''حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جنگ خیبر کے اسیروں میں شامل تھیں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ خود چن لو۔ اس نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو منتخب کیا، بعد میں کسی نے کہا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے، اسے لونڈی بنا کر اس سے خدمت لینا ظلم ہے۔ اس لئے حضور ﷺ اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں۔ حضور ﷺ نے یہ تجویز مان لی اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ بات

سیدھی سادی تھی اور تمام احادیث میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا تھا، لیکن ''بخاری'' کی ایک روایت میں اس واقعہ کو یوں مسخ کیا گیا ہے کہ تمام داستان ہجو بن کر رہ گئی ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں:

''......ثم قدمنا خيبر فلما فتح الله عليه الحصن ذكر له جمال صفية بنت حيي بن أخطب وقد قتل زوجها وكانت عروسا فاصطفاها رسول الله لنفسه'' ❶

''پھر ہم خیبر میں آئے، جب اللہ کے فضل و کرم سے حضور ﷺ نے قلعہ خیبر فتح کر لیا، تو کسی نے کہا کہ صفیہ بنت حیي بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کا خاوند جنگ میں مر چکا ہے اور وہ ابھی دلہن ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ نے کسی اور خیال سے نہیں۔ بلکہ صفیہ کی شہرت حسن سن کر اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ (دو اسلام: ۲۱۵)

جواب:

پہلے خود ایک معنی تجویز کرتے ہیں، پھر اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اصل واقعہ جو پہلے ذکر کیا ہے، اس کو خوب اپنی خاص عبارت میں پیش کیا ہے۔ مثلاً یہ لفظ ''اسے لونڈی بنا کر خدمت لینا ظلم ہے'' پہلی روایت میں اضافہ کیا ہے۔ اصل روایت تو اتنی تھی کہ وہ رئیس کی بیٹی ہے، مگر کہنے والے کا اس سے غالباً مطلب یہی ہوا کہ اسے لونڈی بنا کر خدمت لینا ظلم ہے۔ اس لئے اس کا اضافہ مناسب سمجھا۔ اسی طرح اس حدیث کا ترجمہ اگر اس طرح کر لیتے:

''آنحضرت ﷺ کو لوگوں نے کہا: یہ عورت بہت خوبصورت ہے اور ایسی

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب من غزا بصبي للخدمة، رقم الحديث (۲۷۳٦)

عورت سے لونڈی بنا کر خدمت لینا ظلم ہے، تو آپ ﷺ اس بات کو سمجھ گئے، اس کو اپنے لئے چن لیا اور آزاد کر کے نکاح کر لیا" تو کتنا اچھا تھا!

احادیث کے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ ان کے ایک لفظ پر ہی عقیدے یا عمل کی بنیاد نہیں ہوتی، کیونکہ راوی بسا اوقات اختصار سے کام لیتے ہیں۔ محدّث کو ان تمام الفاظ کو جمع کر کے مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی ایک مسئلہ ایک جگہ مختصر ہوتا ہے اور دوسری جگہ مفصل، یہی حال احادیث کا ہے۔

اعتراض:

"سیرتِ رسول ﷺ کا ایک اور منظر"

"حضور کی کل گیارہ ازواج تھیں، جن میں سے دو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب بنت خزیمۃ رضی اللہ عنہا فوت ہو چکی تھیں اور نو باقی تھیں، جو علیحدہ علیحدہ مکانات میں رہتی تھیں، حضور ہر گھر باری باری جاتے تھے، ایک رات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزارتے، دوسری حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں، تیسری حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں۔ وقس علی هذا! اگر کسی وجہ سے حضور اپنے اس دستور العمل میں رد و بدل کرنے پر مجبور ہوتے، تو جس کی باری ہوتی، اس سے اجازت حاصل کر لیتے۔

اس تمہید کے بعد اب حدیث سنیئے:

"عن قتادة عن أنس بن مالك قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يدور على نسائه في الساعة الواحدة من الليل والنهار وهن إحدىٰ عشرة قال قلت لأنس أو كان يطيقه ؟ قال كنا نتحدث أنه أعطي قوة ثلاثين رجلا" [1] (بخاری)

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الغسل، باب إذا جامع ثم عاد و من دار على نسائه في غسل واحد، رقم الحديث (٢٦٥)، صحیح بخاری میں "ثلاثین" کے بعد "رجلا" کے الفاظ نہیں ہیں۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ دن ہو یا رات، ایک ہی وقت میں اپنی گیارہ بیویوں کے پاس مجامعت فرمایا کرتے تھے، میں نے پوچھا: رسول اللہ ﷺ میں اتنی طاقت تھی؟ کہا: آپ میں تیس مردوں کی طاقت موجود تھی۔''

ملاحظہ کی آپ نے حضور کی یہ دلچسپ تصویر! یہ حدیث صریحاً غلط ہے۔

اول: اس کا راوی انس رضی اللہ عنہ ہے اور یہ وہی بزرگ ہیں، جنہیں رسول اکرم ﷺ کی عمر بھی معلوم نہیں تھی!

دوم: ۷ھ میں حضور کے ہاں صرف سات ازواج زندہ تھیں، ۷ھ میں دو کا اور اضافہ ہوا۔ کل نو ہوئیں۔ زینب بنت خزیمہ نکاح کے بعد صرف تین ماہ زندہ رہی تھیں۔ پھر خدیجۃ الکبریٰ کے بغیر کسی اور بیوی سے اولاد نہیں ہوئی۔

سوم: حضرت عائشہ کے سوا سب بیوائیں تھیں اور بعض کی پہلے شوہروں سے اولاد بھی تھی، قرآن کہتا ہے۔

﴿إنما أنا بشر مثلكم﴾ [1]

''رسول تم جیسے بشر ہیں۔''

لیکن حدیث کہتی ہے کہ ان میں تیس مردوں کی طاقت تھی لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بغیر کسی بیوی سے اولاد کیوں نہیں ہوئی؟

میرا خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ میں آکر ازواج مطہرات کیلئے خود کو بطور شوہر استعمال نہیں فرمایا تھا۔ (دو اسلام)

جواب:

پہلا اعتراض کہ راوی انس رضی اللہ عنہ ہے اور اس کا جواب پہلے ہو چکا ہے کہ انس رضی اللہ عنہ

---

[1] الکہف: ۱۱۰

کی روایت عمر کے متعلق صحیح ہے۔ ❶

دوسرا اعتراض ''نو بیویاں صرف ۷ھ میں تھیں، گیارہ کا قصہ غلط ہے'' مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نو اور گیارہ میں یہ تطبیق دی ہے کہ جس نے گیارہ کہا ہے، اس نے ریحانۃ اور ماریۃ کو بھی شمار کیا ہے، حالانکہ دونوں لونڈیاں تھیں۔ ریحانۃ کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو آزاد ہونے اور ملک میں رہنے کا اختیار دیا تھا، اس نے ملک کو پسند کیا اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اختلاف ہے۔ سعید، قتادہ رضی اللہ عنہ سے نو کا ذکر کرتے ہیں اور ھشام گیارہ بتاتے ہیں۔ ان دونوں میں ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مثلاً سعید کی روایت کو ترجیح دی جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر نو (۹) کا لفظ بھی تغلیبی ہے، کیونکہ مائی سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری ہبہ کر دی تھی، باقی صرف آٹھ رہ جاتی ہیں۔ ❷ انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے سیاق وسباق سے تو اس حدیث کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس اس لئے جاتے تھے، جس سے غسل لازم ہو۔ مگر اس حدیث میں جماع کی صراحت نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جانا صرف خبر گیری کیلئے بھی ہوسکتا ہے۔

باقی رہا راوی کا یہ استفسار ''أَوَ كان يطيقه'' (کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی طاقت تھی؟) ہوسکتا کہ اس نے یہی سمجھا ہو کہ انس رضی اللہ عنہ کی مراد اس سے جماع ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق اس نے سوال کر دیا اور انس رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کی بات کا جواب دے دیا کہ ہم باتیں کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس مردوں کی طاقت ہے۔ یہ باتیں صحابہ کی اپنی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ صرف تخمینی ہوں، اور حقیقت میں یہ کوئی قابل اعتراض بھی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت دوسرے آدمیوں سے زیادہ ہو۔ آج بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ قوت و ذہانت میں آدمیوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ ایک

---

❶ فتح الباري: ۱/ ۳۷۷

ایک آدمی سو سو پر بھاری ہوتا ہے۔ اس میں کیا تعجب ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راوی نے بھی حدیث کا مطلب یہی سمجھا ہو کہ آپ ﷺ بیویوں کے پاس خبر گیری کیلئے جاتے ہیں۔ مگر ایک اور بات جو الفاظ سے مترشح ہوتی تھی، اگرچہ مراد نہ تھی، اس کے متعلق استفسار کر دیا۔ اثناء گفتگو میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اگر اس کا معنی جماع کا لیا جائے، تو اس پر یہ اعتراض کہ آپ ﷺ نے باری مقرر کر دی تھی، چنداں وزنی نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کا باری مقرر کرنا، اس لئے نہ تھا کہ آپ ﷺ پر باری باری جانا فرض تھا۔ کیونکہ قرآن مجید نے اس فریضہ سے آپ ﷺ کو بری الذمہ قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ترجي من تشاء منهن وتؤوي إليك من تشاء﴾ ❶

کہ ''آپ ﷺ اپنی بیویوں میں سے جس کے پاس جانا چاہیں، جائیں اور جس کو چھوڑنا چاہیں، چھوڑ رکھیں۔''

بلکہ آپ ﷺ نے اپنی طرف سے باری بطیبِ خاطر مقرر کی تھی، اس واسطے اس کو ترک بھی کر سکتے تھے۔ اور محدثین نے ایک اور صورت بھی بیان کی ہے کہ جب آپ ﷺ سفر سے واپس آئیں، تو اس وقت قبل اس کے کہ آپ باری باری جانا چاہیں، پہلے کا یہ واقعہ ہو، نیز یہ بھی ہو سکتا کہ باری والی عورت سے اجازت لے لیں۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ ''آپ ﷺ میں اتنی قوت تھی، تو آپ کے ہاں اولاد کیوں نہ ہوئی؟ حالانکہ جو عورتیں آپ نے بیاہیں، ان کی پہلی اولاد تھی، اور آنحضرت ﷺ کی بھی پہلی اولاد تھی، لیکن اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ ﷺ اپنی بیویوں کو بطور شوہر استعمال نہیں کرتے تھے'' قرآن کے لحاظ سے بالکل لغو ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿يهب لمن يشاء إناثا ويهب لمن يشاء الذكور ٥ أو

❶ الأحزاب:٥١

یزوجهم ذکرانا وإناثا ویجعل من یشاء عقیما﴾ ❶

”جس کو چاہے لڑکیاں دے، جس کو چاہے لڑکے اور جس کو چاہے لڑکے لڑکیاں دونوں عطا کرے اور جس کو چاہے بانجھ کر دے۔“

نیز فرمایا:

﴿أفرأیتم ما تمنون ۝ أأنتم تخلقونه أم نحن الخالقون﴾ ❷

ماریہ قبطیہ سے آپ ﷺ کا فرزند ابراہیم پیدا ہوا، مگر آپ تو اس کو بھی داستان ہی بتاتے ہیں اور محض اس وجہ سے کہ لونڈی رکھنا، آپ کے نزدیک اس حدیث کے خلاف ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ لونڈی کو آزاد کر کے نکاح کرنے میں دوہرا اجر ہے۔ اگر قرآن پڑھتے، تو آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو جاتی!

قرآن نے کہا ہے:

﴿لا یحل لك النساء من بعد ولا أن تبدل بهن من أزواج ولو أعجبك حسنهن إلا ما ملکت یمینك﴾ ❸

”اے پیغمبر! اس کے بعد تیرے لئے نہ کسی اور عورت سے نکاح جائز ہے اور نہ ہی اس میں رد و بدل کی اجازت ہے، ہاں لونڈیاں رکھ سکتے ہو۔“

جب قرآن نے لونڈیاں رکھنے کی اجازت دے دی اور مزید نکاح کرنے سے منع کر دیا، تو آپ اس حدیث پر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ اور اس آیت سے سابقہ مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ آنحضرت ﷺ میں اتنی قوت موجود تھی، جس کی بناء پر باوجود اتنی عورتوں کے لونڈیوں کی اجازت دی گئی۔

---

❶ الشوریٰ: ۴۹۔ ۵۰

❷ الواقعة: ۵۸۔ ۵۹ ترجمہ: تو کیا تم نے دیکھا وہ نطفہ جو تم ٹپکاتے ہو کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟

❸ الأحزاب: ۵۲

پس انس رضی اللہ عنہ کی روایت کا ظاہری مفہوم بھی کوئی قابل اعتراض نہیں۔ مصروفیات کے بڑھنے سے اگرچہ قوت میں کمی پیدا ہو جاتی ہے، مگر اس میں طبائع کا اختلاف ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک میں صرف بیس بال سفید تھے۔ ❶ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے، ❷ دیکھنے میں بڑے معلوم ہوتے تھے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان مصروفیات میں شریک تھے۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے سفر میں آپ رضی اللہ عنہ کے ہاں محمد بن ابوبکر پیدا ہوا۔ ❸ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سارا بوجھ ان پر آن پڑا۔ مسیلمہ کذاب سے مقابلہ، مرتدین سے لڑائی اور منکرین زکوٰۃ سے جنگ کی۔ مگر پھر بھی آپ رضی اللہ عنہ کے ہاں آپ کی وفات کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ (مؤطا) ❹

اعتراض:

اس کے بعد ایک اور حدیث لکھتے ہیں، کہتے ہیں:

''چلتے چلتے ذرا اس حدیث پہ بھی نظر ڈالتے جائیے:

''حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میرا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ برس کی عمر میں ہوا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی۔'' (مسلم) ❺

---

❶ سنن ابن ماجه: كتاب اللباس، باب من ترك الخضاب، رقم الحديث(٣٦٢٩)، مسند أحمد: ١٠٨/٣، صحيح ابن حبان: ٢٠٤/١٤، مسند أبي يعلى: ٣٨٥/٦

❷ أسد الغابة-١٠٤/١، الإصابة: ١٦٩/٤

❸ صحيح مسلم: كتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ رقم الحديث(١٢١٨)

❹ المؤطا: ٧٥٢/٢ (١٤٣٨)

❺ صحيح البخاري: كتاب النكاح، باب تزويج الأب ابنته من الإمام، رقم الحديث(٤٨٤١)، صحيح مسلم: كتاب النكاح، باب تزويج الأب البكر الصغيرة، رقم الحديث(١٤٢٢) و لفظه: و بنى بي و أنا بنت تسع سنين (نو سال کی عمر میں میری رخصتی ہوئی) برق صاحب کا لکھا ہوا لفظ ''مجامعت'' حدیث میں نہیں ہے۔

یہ مت بھولئے کہ اس وقت حضور کی عمر ۵۴ برس تھی اور یہ بھی مت بھولئے کہ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضور ﷺ کے ہاں آنے سے پہلے حضرت عائشہ تپ محرقہ میں مہینہ بھر مبتلا رہ چکی تھیں اور آپ کے تمام بال جھڑ چکے تھے۔ [1] اتنی نابالغ بچی ہو، مہینہ بھر تپ محرقہ میں مبتلا رہ کر کانٹا ہو چکی ہے، کیا ایسی بچی مجامعت کی تاب لاسکتی ہے؟ اور مجامعت بھی ایسے مرد کے ساتھ جس میں بقول بخاری تیس مردوں کی طاقت تھی!" (دو اسلام: ۲۲۳)

جواب:

اس اعتراض کی نوعیت صرف یہ ہے کہ عمر کم ہے، نابالغ ہے اور یہی غلطی کی وجہ ہے۔ نو سال کی عمر میں بعض علاقوں اور خاندانوں میں لڑکیاں بالغ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ بعض لڑکے بھی دس سال کے بالغ ہو جاتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرو اپنے باپ عمرو بن عاص سے صرف گیارہ سال چھوٹے تھے۔ (تذكرة ذهبي) [2]

ان کا نکاح کم از کم دس سال کی عمر میں ہوا ہوگا اور سال کے بعد وہ پیدا ہوئے ہونگے، لڑکیاں ہمیشہ لڑکوں سے پہلے بالغ ہوتی ہیں۔ آپ اپنے علاقہ اور اپنے خاندان کی لڑکیوں پر عربوں اور قریش خاندان کی لڑکیوں کو قیاس کرتے ہیں!! [3]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب فضائل الصحابة، باب تزويج النبي ﷺ عائشة......، رقم الحديث(٣٦٨١)، صحيح مسلم: كتاب النكاح، باب تزويج الأب البكر الصغيرة،رقم الحديث(١٤٢٢)

[2] تذكرة الحفاظ: ١/ ٤٢

[3] مختلف مناطق کی آب و ہوا اور روزہ مرہ استعمال ہونے والی غذا انسانی طبائع پر متنوع اثر ڈالتی ہے، جن سے انسانی اجسام کی نشوونما میں مختلف اثرات ظاہر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عرب جیسے گرم خشک علاقے میں رہنے والوں کے اندر کم سنی میں شادی کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور نہ یہ کوئی ایسا عجوبہ ہے، جس پر ناک بوں چڑھائی جائے، انہی وجوہ کی بناء پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بعمر نو ←

پھر اگر پہلے بخار آیا، بال جھڑ گئے تھے، تو اس کے بعد اتنی مدت بھی گذر چکی تھی کہ بال دوبارہ اُگ کر کان سے نیچے کندھے تک پہنچ چکے تھے۔ (بخاری) ❶ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخار کا اثر کافی حد تک دور ہو چکا تھا۔ اور مسلم کے الفاظ کا جو ترجمہ کیا ہے ''آپ نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی'' نہایت بیہودہ ہے۔ پاسِ ادب تو بڑی دور کی بات ہے!

مسلم کے الفاظ ہیں:

''وبنی بي وأنا بنت تسع سنین'' (یہ الفاظ مصنف نے بھی نقل کیے ہیں)

''بناء'' کا لفظ اس امر سے کنایہ ہے کہ عورت کو خاوند کے ہاں بھیج دیا جائے۔ ❷

اعتراض:

آگے ایک اور حدیث لکھتے ہیں:

← سال شادی کوئی عجیب بات نہیں، کیونکہ یہ وہاں کے رواج کے متعلق ایک معمول کی بات تھی، جیسے حضرت ہشام بن عروہ نے فاطمہ بنت منذر سے شادی کی اور بوقت زواج فاطمہ کی عمر نو سال تھی۔ (الضعفاء للعقیلي: ٤/٢٤، الکامل لابن عدي: ٦/١٠٣، تاریخ بغداد: ١/٢٢٢)
اسی طرح عبداللہ بن صالح کہتے ہیں کہ ان کے پڑوس میں ایک عورت نو سال کی عمر میں حاملہ ہوئی اور مزید فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے ان کو بتایا کہ اس کی بیٹی دس سال کی عمر میں حاملہ ہوئی۔ (الکامل لابن عدي: ٤/٢٠٦) اسی طرح حضرت معاویہ نے اپنی بیٹی ہندہ کی شادی نو سال کی عمر میں عبداللہ بن عامر بن کریز سے کرائی۔ (تاریخ دمشق: ٧٠/١٨٨) مزید برآں أبو عاصم النبیل کہتے ہیں کہ میری والدہ ایک سو دس (١١٠) ہجری میں پیدا ہوئی اور میں ١٢٢ھ میں پیدا ہوا۔ (سیر أعلام النبلا: ٩/٤٨٣) یعنی بارہ سال کی عمر میں ان کا بیٹا پیدا ہوا، تو ظاہر ہے کہ ان کی والدہ کی شادی دس گیارہ سال کی عمر میں وقوع پذیر ہوئی! لہٰذا عرب معاشرہ میں کم سنی کی شادی معمول کی بات ہے۔ ﴿فمال ھؤلاء بقوم لا یکادون یفقھون حدیثاً﴾!!

❶ صحیح البخاري (٣٦٨١)

❷ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: النھایة في غریب الحدیث: ١/١٧٤

"ذرا یہ حدیث بھی دیکھئے:

سبرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے متعہ (متعہ کی تفسیر وہ واقعہ ہے، جو اسی حدیث میں بیان ہو رہا ہے) کی اجازت طلب کی، آپ نے دے دی، چنانچہ میں اور میرا ایک ساتھی بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے، جو ایک خوبصورت ناقہ کی طرح حسین تھی۔ ہم نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے پوچھا: کیا دو گے؟ میں نے کہا یہ چادر، پھر میرے ساتھی سے بھی یہی سوال کیا، اس کے پاس بھی صرف چادر ہی تھی، اس کی چادر خوبصورت تھی اور میں خود خوبصورت! چنانچہ اس نے مجھے پسند کیا اور میں اس عورت کے پاس تین راتیں ٹھہرا۔" (مسلم: ٤٤٣/٣) [1]

تو پھر کیا حکم ہے، ان خواتین کے متعلق جو پشاور سے چل کر ٹبی بازار میں کچھ ایسے ہی مقاصد کے لئے جاتے ہیں؟

"صحیح مسلم" میں ہے:

"إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى يوم الفتح عن متعة النساء" [2]

کہ "رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے دن متعہ سے روک دیا تھا۔"

---

[1] صحيح مسلم: كتاب النكاح، باب نكاح المتعة و بيان أنه أبيح ثم نسخ ثم أبيح ثم نسخ و استقر تحريمه إلى يوم القيامة، رقم الحديث (١٤٠٦)، حدیث کے آخر میں الفاظ ہیں: " ثم إن رسول الله ﷺ قال من كان عنده شيئ من هذه النساء التي يتمتع فليخل سبيلها" جن سے "متعہ" کی صریح ممانعت معلوم ہوتی ہے، جنھیں برق صاحب دیدہ دانستہ حذف کر گئے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ ان کے اعتراض کی قلعی کھول دیتے ہیں، اس لیے کہ اس حدیث سے بھی متعہ کی حرمت ہی معلوم ہوتی ہے!

[2] مصدر سابق

لیکن صفحہ(۴۴۱) میں یہ روایت موجود ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق کے زمانہ میں مٹھی بھر آٹا دیکر عورتوں کو استعمال کیا کرتے تھے اور اس حرکت سے ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روک دیا۔ ❶

اس تمام عبارت کا مطلب یہ ہے کہ متعہ بھی آج کل کی بازاری عورتوں کے کسب کی طرح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ جائز نہیں اور اس میں احادیث بھی متعارض ہیں، کسی میں اجازت، کسی میں ممانعت؟ اور کسی میں آنحضرت کے زمانہ میں ممانعت اور کسی میں حضرت عمر کے زمانہ میں ممانعت؟ (دو اسلام : ۲۲۵)

جواب:

اصل بات یہ ہے کہ متعہ کا رواج جاہلیت کے زمانہ میں تھا۔ مگر قرآن نے مکہ ہی میں اس کو بند کر دیا تھا:

﴿فمن ابتغى وراء ذلك فأولئك هم العادون﴾ ❷

''یعنی جو بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی جگہ اپنی شہوت پوری کرے، وہ حد سے بڑھنے والا ہے۔''

مگر نکاح باقی رہا اور نکاح کی مختلف شکلیں تھیں۔ ایک شکل وہ ہے، جو آج کل جاری ہے، اس کے علاوہ اور شکلیں بھی تھیں۔ ❸ ان میں ایک نکاح مؤقت کی صورت تھی، یعنی ایک عرصہ معینہ کیلئے نکاح کرنا، اس میں نکاح بھی ہوتا تھا، مگر ایام معین ہوتے تھے، اسی کا ذکر ''سبرۃ'' کی حدیث میں ہے، اس کو مجازاً ''متعہ''

---

❶ مصدر سابق، رقم الحديث (١٤٠٥)

❷ المومنون: ٧

❸ صحيح البخاري: كتاب النكاح، باب من قال لا نكاح إلا بولي، رقم الحديث: ٤٨٣٤، نیز دیکھیں: فتح الباري: ١٨٤/٩

کہا گیا ہے۔ حالانکہ ''متعۂ حظ'' تو مکہ میں ہی حرام ہو گیا تھا۔ مگر لوگ نکاح مؤقت کرتے تھے اور اس پر بھی ''متعہ'' کا اطلاق کرتے تھے۔

اور یہ نکاح مؤقت جس پر متعہ کا اطلاق کیا گیا ہے، اس کی ممانعت بھی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کر دی گئی تھی۔ مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ قیامت تک حرام کر دیا گیا ہے۔ ❶ مگر بعض لوگ جن کو اس نہی کا علم نہ ہوگا، تو اپنی جگہ حلال سمجھ کر کرتے رہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا، تو آپ نے منع کر دیا، یہ مطلب نہیں کہ جائز تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا۔ ❷

---

❶ صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب نکاح المتعة و بیان أنه أبیح ثم نسخ ثم أبیح ثم نسخ و استقر تحریمه إلی یوم القیامة، رقم الحدیث(١٤٠٦)

❷ اب بتایئے! احادیث میں کیا تعارض ہے؟ نیز یہ بھی کہ اس بات کو ٹبی بازار میں پشاور سے چل کر آنے والے خوانین پر کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے، جب کہ اسلام نے اسے مطلقاً قیامت تک حرام کر دیا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسے حلال سمجھ کر کرتے رہے، ظاہر ہے غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ اور غلط فہمی کی وجہ سے کسی چیز کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کرنا اور بات ہے اور دیدہ دانستہ اس کا ارتکاب الگ بات! پھر ایک ایسی غلط بات سے جو لاعلمی میں سرزد ہوئی ہے۔ جواز کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟ اور پھر طرفہ یہ کہ حدیث کے الفاظ موجود ہیں کہ '' جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا، تو آپ نے اس سے منع کر دیا'' اور اگر واقعی جواز کا پہلو نہیں نکلتا، بلکہ یہ مطلقاً حرام ہے، تو معاملہ صاف ہے، پھر اسے آج کل کی بازاری عورتوں کے کسب پر قیاس کر کے حدیث پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے؟! نہ جانے معترض صاحب یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اسلام نے بعض چیزوں کی اصلاح بتدریج کی ہے۔ مثلاً شراب کو ایک دم حرام نہیں کیا گیا، مال غنیمت کی محبت کو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے دلوں سے محو کیا گیا۔ یہی حال متعہ کا ہے کہ پہلے متعہ حظ حرام قرار دیا گیا، مگر نکاح مؤقت باقی رہا، پھر اسکو بھی قیامت تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں، ان کا مقصد ذہنی عیاشی نہیں ہے (جیسا کہ معترض کے الفاظ سے مترشح ہے) بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ دورِ جاہلیت کی اس لعنت کو بتدریج مسلم معاشرہ سے دور کیا گیا حتیٰ کہ یہ مطلقاً حرام قرار پایا۔ (ساجد)

اعتراض:

اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حج کیلئے روانہ ہوئے۔ جن کے پاس قربانی کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔ انہیں ذی الحجہ کی پانچویں تاریخ کو احرام توڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا اور پانچویں دن کے بعد جب ہم عرفہ کے لیے روانہ ہوئے، تو "تقطر مذاكيرنا المني" ہمارے اعضاءِ تناسل سے نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا۔'' (صحيح مسلم)

جواب:

حدیث کا مطلب غلط بیان کیا، پھر اس پر اعتراض کیا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو جن کے پاس قربانی نہ تھی، حلال ہونے کے لئے کہا اور ان پر ان کی عورتیں بھی حلال ٹھہرائیں، مگر جماع کو فرض نہیں کیا۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ہم نے کہا: جب صرف عرفہ میں پانچ دن باقی رہ گئے ہیں، ہم کو عورتوں کے پاس جانے کے لئے کہا ہے، یعنی اجازت دی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جماع سے فارغ ہو کر فوراً عرفات پہنچیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ عرفہ میں اور جماع میں فاصلہ بہت سے دنوں کا ہونا چاہیے۔ چنانچہ لفظ یہ ہیں:

"فنأتي عرفة و تقطر مذاكيرنا المني" [1]

اس کے نیچے امام نووی لکھتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب نهي النبي ﷺ على التحريم إلا ما تعرف إباحته و كذلك أمره، رقم الحديث(٦٩٣٣)، صحيح مسلم: كتاب الحج، باب بيان وجوه الإحرام...... رقم الحديث(١٢١٦)

"هو إشارة إلى قرب العهد بوطي النساء" ❷

''یہ جماع کے زمانہ کے قرب کی طرف اشارہ ہے۔''

معترض صاحب اس طرح احادیث کو مسخ کرتے ہیں اور اعتراض یہ ہے کہ ملاّ نے حدیث بنائی اور مسخ کی ہے۔ (فیا للعجب)

❶ المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج للنووي (١٦٣/٨)

دسواں باب:

’’حدیث میں نماز کی صورت‘‘

اس باب میں حدیث میں نماز کی صورت بتلائی ہے، مطلب یہ ہے کہ حدیث کی نماز رواجی نماز کے خلاف ہے، لہٰذا حدیث کو معلمِ نماز کہنا درست نہیں۔ اس کا ذکر قدرے ہو چکا ہے کہ حدیث رواجی نماز کے خلاف نہیں۔ بعض کام اس قسم کے ہیں کہ ان کو دونوں طرح کرنا جائز ہے۔ مگر رواج میں صرف ایک چیز کو اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں سہولت ہے اور بعض جگہ حدیث میں ایک چیز مستحب ہے، مگر رواج میں وہ لازم قرار دی گئی اور بعض احادیث اس قسم کی ہیں، جو منسوخ ہیں۔ اس لئے رواج دوسری احادیث کے موافق ہے، جو ناسخ ہیں۔

پھر نماز کے فرض ہونے پر اعتراض کیا ہے۔

اعتراض:

اس جگہ معراج کی حدیث بیان کی ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ پہلے پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، تو آپ علیہ السلام کے کہنے پر اللہ تعالیٰ سے تخفیف کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر بار بار ہوا۔ تھوڑی تھوڑی تخفیف ہوتی گئی، یہاں تک کہ پانچ رہ گئیں اور اللہ نے فرمایا: میری بات نہیں بدلتی، پانچ ہی پچاس ہیں۔ [1]

---

[1] صحیح البخاري: کتاب الصلاۃ، باب کیف فرضت الصلاۃ في الإسراء، رقم الحدیث (٣٤٢)، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ، رقم الحدیث (١٦٣)

جواب:

یہ واقعہ ایک مثالی واقعہ ہے۔ اگرچہ معراج جسمانی ہے، مگر بعض واقعات اس کے مثالی ہیں۔ یعنی پانچ نمازیں مثالی شکل میں پچاس کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ اس کی مثال خواب کی ہے۔ انسان چونکہ شہادی صورتوں کے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس واسطے اس کا دماغ اسی طرف جاتا ہے کہ اس کا وجود عالم شہادت میں اس طرح ہے۔ چنانچہ وہ جذباتی طور پر اس سے متاثر ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جو پہلے رسول تھے، یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ یعنی یہ وجودِ مثالی ہے، ان کا ثواب پچاس کا ہے، دراصل یہ پانچ ہی ہیں۔

اعتراض:

اب ان کا اعتراض سنئے، لکھتے ہیں:

''اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ امتِ رسول کی استعداد کا علم نہ خدا کو تھا اور نہ حضور کو۔ اگر موسیٰ (علیہ السلام) پیچھے نہ پڑتے، تو امت پہ پچاس نمازیں فرض ہو جاتیں اور یہ امت صبح سے لیکر شام تک نمازیں ہی پڑھتی رہتی۔ نہ کما سکتی، نہ کھا سکتی۔ نہ ضروریاتِ حیات کی طرف توجہ دے سکتی۔ مجبوراً ہر شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتا۔ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عقل کی داد دیجئے کہ اسلام کو بچا لیا۔ ورنہ خدا اور رسول تو بقول انس ''یہ غلطی'' کر ہی بیٹھے تھے۔ ماشاء اللہ! کیا داستان تراشی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا اور رسول کا معلمِ دانش بنا ڈالا۔ اور یہ آخری فقرہ بھی خوب ہے کہ ''ہم اپنا قول نہیں بدلا کرتے'' اگر نہیں بدلا کرتے، تو پچاس

سے پچیس اور پچیس سے پانچ کیونکر ہوئیں۔ (دو اسلام: ۲۲۹)

جواب:

یہ ہے لب و لہجہ مصنف کا۔ نہ بات کو سمجھا، نہ حقیقت کو پایا، بس اعتراض جڑ دیا۔ یہ مسئلہ تو قرآن میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ادعوني أستجب لكم﴾ [1]

''مجھے پکارو، میں تمہاری پکار قبول کروں گا۔''

اس پر آپ جیسے آزاد منش یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اس کی دعا کا فیصلہ کر دیا ہے، تو ہم دعا کر کے اللہ تعالیٰ کو اپنی ضروریات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ جواب دیں کہ دعا سے آگاہ کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم دعا کریں، تو وہ ہماری ضرورت پوری کرے، تو یہی حکمت وہاں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہماری مصالح سے واقف تھا، مگر اس کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ درخواست سے اس میں تخفیف کی جائے اور متنبہ کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واسطہ قرار دیا۔

اعتراض:

اس کے بعد فقہ اور حدیث میں جو اختلاف ہے، اس کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

وضوء:

''فقہ کی بنیاد قرآن و حدیث پر رکھی گئی تھی، فقہ بتلاتی ہے:

① وضو میں اعضاء کو تین تین مرتبہ دھونا چاہیے۔

② مجامعت سے غسل فرض ہوتا ہے۔

---

[1] غافر: ٦٠

③ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

④ نیند کے بعد وضو ضروری ہے۔

⑤ جنابت کے پانی سے وضو درست نہیں۔

لیکن احادیث کچھ اور ہی کہتی ہیں:

ہر نماز کے لیے وضوء:

"کان النبي صلی الله علیه و سلم یتوضأ عند کل صلوٰة"

"آنحضرت ﷺ ہر نماز کیلئے نیا وضو کیا کرتے تھے۔" (بخاري) ❶

تردید بالا:

ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ کے گھر میں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کچھ دیر سو چکنے کے بعد جاگے، وضو کیا، نماز پڑھی:

"ثم اضطجع فنام حتیٰ نفخ ثم أتاه المنادي فآذنه بالصلوٰة فقام معه إلی الصلوٰة فصلیٰ ولم یتوضأ"

"پھر آپ لیٹ گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد نماز کیلئے بلانے والا آیا، آپ اس کے ہمراہ مسجد میں چل دیئے اور وہاں جا کر وضو کے بغیر نماز ادا کی۔" (بخاري) ❷

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوگئیں:

اول: حضور ہر نماز کیلئے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

---

❶ صحیح البخاري: کتاب الوضوء، باب الوضوء من غیر حدث، رقم الحدیث(۲۱۱)

❷ صحیح البخاري: کتاب الوضوء، باب التخفیف في الوضوء، رقم الحدیث(۱۳۸)

دوم: نیند کے بعد وضو ضروری نہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی صرف آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا تھا۔ اس لئے ان کے لئے وضو ضروری نہیں تھا اور یہ ہدایت صرف امت کے لیے تھی، تو ملاحظہ کیجئے صحیح مسلم کا یہ قول کہ:

" كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ينامون ثم يصلون ولا يتوضاؤن"

"رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سو جاتے، پھر نماز پڑھتے اور وضو نہ کرتے۔" ❶

کیا صحابہ کے دل بھی نبی ﷺ کی طرح جاگتے رہتے تھے؟ (دو اسلام: ۲۳۰)

جواب:

ہر نماز کے لیے نیا وضو مستحب ہے، اس لئے آپ ﷺ ایسا کرتے تھے اور نماز سے مراد یہاں پنجوقتی نماز ہے۔ یعنی ایک فرضی نماز کیلئے جو وضو کرتے، دوسری نماز کیلئے اس پر اکتفاء نہ فرماتے۔ اور حدیث مذکور میں ایسا نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے پہلے تہجد کیلئے وضو کیا، پھر اسی پر اکتفاء کیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے نیا وضو کرنا دائمی نہیں تھا، کبھی کبھی ایک ہی وضو سے متعدد نمازیں بھی پڑھ لیا کرتے تھے، جیسے "سنن" میں ہے۔ ❷

---

❶ صحيح مسلم: كتاب الحيض، باب الدليل على أن نوم الجالس لا ينقض الوضوء، رقم الحديث(٣٧٦)

❷ صحيح مسلم: كتاب الطهارة، باب جواز الصلوات كلها بوضوء واحد، رقم الحديث (٢٧٧)، سنن أبي داود: كتاب الطهارة، باب الرجل يصلي الصلوات بوضوء واحد، رقم الحديث(١٧٢)، سنن الترمذي: أبواب الطهارة، باب ما جاء أنه يصلي الصلوات بوضوء واحد، رقم الحديث(٦١)، سنن النسائي: كتاب الطهارة، باب الوضوء لكل صلاة، رقم ←

نیند کے بعد وضو کرنے کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نیند فی نفسہٖ ناقض نہیں، بلکہ نیند سے چونکہ مفاصل ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، اس لئے وضو کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ رکوع، قیام، اور بدوں ٹیک لگائے بیٹھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ اس میں مفاصل ڈھیلے نہیں ہوتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت بھی یہی تھی۔

لہو سے وضوء ٹوٹنے کا مسئلہ:

اس میں اختلاف ہے، اصل تحقیق یہ ہے کہ مستحب ہے، مگر فقہ نے اس مستحب کو رواج دے دیا ہے۔

مجامعت کے بعد غسل:

مجامعت کے بعد غسل کے ضروری ہونے پر پہلے بحث ہو چکی ہے کہ جس حدیث سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مجامعت سے غسل واجب نہیں ہوتا، اس میں مجامعت کا ذکر نہیں اور وہ حکم منسوخ ہے۔ آخری حکم وجوب غسل کا ہے۔

آگ کی پکی ہوئی چیز سے وضوء:

آگ کی پکی ہوئی چیز سے وضو مستحب ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا اور کبھی نہیں کیا، اس میں کوئی تعارض نہیں۔

وضوء میں اعضاء دھونے کی تعداد

وضو ایک بار اعضاء دھونے سے بھی ہو جاتا ہے۔ دو بار بھی، تین بار بھی۔ یہ آخری درجہ ہے۔ ان مسائل میں فقہ اور حدیث کا کوئی اختلاف نہیں۔

← الحدیث(۱۳۳)، سنن ابن ماجه: کتاب الطهارة باب الوضوء لکل صلاة و الصلوات کلها بوضوء واحد، رقم الحدیث(۵۱۰)

غسل کے پانی سے وضوء:

کیا غسل سے بچے ہوئے پانی سے وضو جائز ہے؟ ایک حدیث میں منع ہے اور ایک میں جواز، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہی تنزیہی ہے۔ یعنی بہتر ہے کہ وضو نہ کرے، ویسے جائز ہے۔

تعدادِ رکعات:

حضر میں ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعات ہیں اور سفر میں ان کی دو دو رکعات ہیں۔ باقی مغرب کی حضر وسفر میں تین اور فجر کی دو ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے کہ رات و دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔ ❶ اس سے مراد نوافل ہیں۔

اور أبو جیفه کی روایت میں جو ظہر اور عصر کی دو دو رکعت پڑھنے کا ذکر ہے، وہ سفر کی روایت ہے۔ چنانچہ بخاری میں یہ لفظ ہیں:

"فصلیٰ بالبطحاء الظهر والعصر ركعتين" ❷

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے بطحاء مقام پر دو دو رکعتیں ظہر وعصر کی پڑھیں۔"

اور بخاري نے یہاں باب باندھا ہے:

"باب السترة بمكة وغيرها"

---

❶ سنن أبي داود: كتاب الصلاة، باب في صلاة النهار، رقم الحديث(١٢٩٥)، سنن الترمذي: باب ما جاء أن صلاة الليل والنهار مثنى مثنى، رقم الحديث(٥٩٧)، سنن النسائي: كتاب قيام الليل و تطوع النهار، باب كيف صلاة الليل، رقم الحديث (١٦٦٦)، سنن ابن ماجه: كتاب إقامة الصلاة، باب ما جاء في صلاة الليل والنهار مثنى مثنى، رقم الحديث(١٣٢٢)، مسند أحمد(٢/٢٦)، ابن خزيمة(٢/٢١٤)، ابن حبان(٦/٢٣١)

❷ صحيح البخاري: أبواب سترة المصلي، باب السترة بمكة وغيرها، رقم الحديث(٤٧٩)

"مکہ اور مدینہ ہر جگہ سترہ ہونا چاہئے"
اور یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے، جبکہ آپ ﷺ سفر پر تھے۔
اب مصنف کا یہ کہنا کہ
"اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں آپ ﷺ سفر پر تھے اور اس لئے نماز میں تخفیف کر لی تھی" جہالت پر مبنی ہے۔

عصر کے بعد نماز

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد نماز سے منع کرتے تھے [1] اور آنحضرت ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس لئے منع کرتے تھے کہ آہستہ آہستہ غروب کے وقت نہ نماز پڑھنے لگیں، ورنہ فی نفسہٖ منع نہیں سمجھتے تھے۔(فتح الباري) [3]

تکبیرِ اقامت

حنفیہ میں اگرچہ تکبیر، اقامت میں دو دو مرتبہ رائج ہے، مگر ایک ایک مرتبہ بھی

---

[1] صحيح البخاري: أبواب السهو، باب إذا كلم و هو يصلي فأشار بيده واستمع، رقم الحديث(١١٧٦)

[2] صحيح البخاري: كتاب مواقيت الصلاة، باب ما يصلى بعد العصر من الفوائت و نحوها، الحديث(٥٦٧)

[3] مصنف عبد الرزاق:٢/٤٣١، مسند أحمد:٤/١١٥، المعجم الكبير:٥/٢٢٨، فتح الباري: اس کی سند میں "أبو سعد الأعمى" راوی مجہول ہے۔(تقريب التهذيب:٦٤٣، تعجيل المنفعة:٤٨٨) لہٰذا یہ سند "ضعیف" ہے۔ اس کی ایک دوسری سند بھی ہے۔(المعجم الكبير:٢/٥٨، المعجم الأوسط:٨/٢٩٦) اس کی سند میں "عبد الله بن صالح كاتب الليث" ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صدوق كثير الغلط، ثبت في كتابه و كانت فيه غفلة" (تقريب التهذيب:٣٠٨)

جائز سمجھتے ہیں، جیسے أحکام القرآن جصاص میں ہے۔ ❶

نماز میں صرف فاتحہ کافی ہے

پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے پر عمل چلا آ رہا ہے، مگر فرض کسی کے نزدیک نہیں۔ حنفیہ واجب کہتے ہیں اور باقی سنت، یہ کوئی اختلاف نہیں!

دعائے قنوت کا وقت

''ہم دعائے قنوت نماز عشاء میں پڑھتے ہیں، لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دعائے قنوت ہم نے نماز فجر میں پڑھی۔'' ❷ (دواسلام)

دعائے قنوت دو قسم کی ہے، ایک وہ جو کسی مصیبت کے وقت پڑھی جاتی ہے، انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اسی کا ذکر ہے۔ اور وتر میں جو پڑھی جاتی ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔

دعاءِ استفتاح

دعائے استفتاح کے متعلق یہی دستور ہے کہ آہستہ پڑھی جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جہر اس لئے کیا تھا ❸ کہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھی جائے۔ ❹ جس روایت میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز ''الحمد'' سے

---

❶ أحكام القرآن للجصاص الرازي(٢٤٢/٣)

❷ صحيح البخاري: كتاب الوتر، باب القنوت قبل الركوع و بعده، رقم الحديث(٩٥٦)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب استحباب القنوت في جميع الصلاة، رقم الحديث (٦٧٧)

❸ صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، رقم الحديث(٣٩٩)

❹ سنن دارقطنی کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعلیم کی غرض سے ایسا کرتے تھے، حضرت أسود کہتے ہیں ''یسمعنا ذلك و یعلمنا'' (سنن الدارقطني: ٣٠١/١) اس کے بعد امام دارقطنی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی یہ عمل نقل کیا ہے۔

شروع کرتے تھے،❶ اس کا یہ مطلب ہے کہ قرأت یہاں سے شروع کرتے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ دعائے استفتاح بالکل نہیں پڑھتے تھے، مگر سمجھنے کیلئے غور وفکر کی ضرورت ہے!

نماز میں مختلف اعمال کی اجازت

اس میں منبر پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔❷ اور یہ مسئلہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ یہ واقعہ تعلیم کیلئے ہے❸ ورنہ امام کو اونچا کھڑا ہونا منع ہے۔❹

دوسرا واقعہ اپنی نواسی "أمامة" کو اٹھا کر آپ ﷺ کے نماز پڑھانے کا ہے۔❺ اور جو اس طرح کی حرکات نماز میں جائز نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ بچے خود بخود آتے جاتے اور کندھے پر چڑھ جاتے ہیں، اس طرح فقہ کی رُو سے بھی نماز میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اقتداء کا واقعہ ہے، جس میں وہ بائیں طرف

---

❶ صحيح مسلم: كتاب الصلاة ، باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، رقم الحديث(٣٩٩)

❷ صحيح البخاري: كتاب الصلاة، باب الصلاة في السطوح والمنبر والخشب، رقم الحديث(٣٧٠)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب جواز الخطوة والخطوتين في الصلاة ، رقم الحديث(٥٤٤)

❸ دیکھیں: ابن حبان: ٥/٥١٤، فتح الباري: ١/٤٨٧

❹ سنن أبي داود: كتاب الصلاة، باب الإمام يقوم مكانا أرفع من القوم، رقم الحديث (٥٩٨،٥٩٧) ، مصنف عبد الرزاق: ٢/٤١٣، مصنف ابن أبي شيبة: ٢/٦٦، ابن خزيمة: ٣/١٣، ابن حبان: ٥/٥١٤، المستدرك: ١/٣٢٩، سنن البيهقي: ٣/١٠٨، المنتقى لابن الجارود: ١/٨٧

❺ صحيح البخاري: أبواب سترة المصلي، باب إذا حمل جارية صغيرة على عنقه في الصلاة، رقم الحديث(٤٩٤)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب جواز حمل الصبيان في الصلاة، رقم الحديث(٥٤٣)

کھڑے ہوئے، تو آپ ﷺ نے انہیں پیچھے سے دائیں جانب کر دیا۔ ❶ اس طرح کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

نمازی کے آگے سے گزرنا

نمازی کے آگے سے گزرنا فقہ اور حدیث کی رو سے منع ہے۔ مگر جماعت اور انفرادی حالت کا فرق ہے، جماعت میں امام کے آگے گزرنا منع ہے، اور صف کے آگے سے گزرنا جائز ہے اور انفرادی حالت میں نمازی کے آگے سے گزرنا منع ہے۔ باقی رہا یہ کہ نمازی کے آگے سے گزرنا نماز کو باطل کرتا ہے یا نہیں، اس میں اصل بات یہ ہے کہ عورت، کتا اور گدھا نمازی کے اس تعلق کو توڑتے ہیں، جو نمازی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے، مگر نماز باطل نہیں ہوتی۔ جن روایات میں یہ آیا ہے کہ یہ چیزیں نماز کو کاٹ دیتی ہیں، ❷ اس جگہ کاٹنے سے مراد تعلق کا کاٹنا ہے، جس کا ذکر ہوا ہے۔ اور جن احادیث میں یہ وارد ہے کہ نماز کو کوئی شئی قطع نہیں کرتی۔ ❸ اسکا

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الوضوء ، باب قراءة القرآن بعد الحدث وغيره ، رقم الحديث(١٨١٠) ، صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين، باب الدعاء في صلاة الليل و قيامه ، رقم الحديث(٦٧٣)

❷ صحيح البخاري: أبواب سترة المصلي: باب الصلاة إلى السرير، رقم الحديث(٤٨٦)، صحيح مسلم: كتاب الصلاة باب الاعتراض بين يدي المصلي، رقم الحديث(٥١٢) بعض روایات میں نماز لوٹانے کا حکم ہے، ابن خزيمه: (٨٣١)

❸ یہ حدیث مختلف طرق سے مروی ہے، لیکن اس کی کوئی بھی سند ضعف سے خالی نہیں اور ضعف بھی اس درجہ کا ہے کہ تمام اسانید کو ملا کر بھی مرتبہ احتجاج کو نہیں پہنچتی۔ دیکھیں: فتح الباري لابن رجب:٢/٦٩٦، فتح الباري لابن حجر:١/٥٨٨، السلسلة الضعيفة(٥٦٦٠، ٥٦٦١)، تمام المنة(٣٠٦)

مطلب یہ ہے کہ باطل نہیں ہوتی کہ اس کو دوبارہ ادا کرنے کا حکم ہو۔ آگے سے گزرنے سے نماز میں خلل پیدا ہوتا ہے، مگر آگے لیٹنے اور بیٹھنے سے یہ خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے لیٹنے اور گزرنے کی احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جس روایت میں یہ فرمایا ہے کہ تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں جیسا سمجھ لیا ہے، اس سے ان کی غرض حدیث سے انکار نہیں، کیونکہ قطع والی حدیث تو مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے [1] بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ عورت میں قطع صلوٰۃ کی اور وجہ ہے اور گدھے اور کتے میں اور وجہ ہے۔ گدھے اور کتے میں ان کا نجس اور شریر ہونا ہے، جبکہ عورت برے خیال کا باعث بنتی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے لیٹی رہتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے رہتے۔ [2] اگر ہم عورتیں بھی کتوں کی طرح ہوتیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آگے نہ لیٹنے دیتے۔

رفع الیدین

رفع الیدین بعض آئمہ کے نزدیک سنت ہے اور بعض نے ترک کو ترجیح دی ہے، مگر جو لوگ ترک کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے ہاں بھی جائز ہے، جیسے امام جصاص حنفی نے "أحکام القرآن" میں لکھا ہے۔ [3]

---

1. مسند أحمد ٦/٨٤ اس کی سند ضعیف ہے۔ اور متن بھی "منکر" ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري لابن رجب: ٢/٧٠٥، السلسلة الضعيفة (٥٥٤٢)
2. صحيح البخاري: أبواب سترة المصلي، باب الصلاة إلى السرير، رقم الحديث (٤٨٦)، صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب الاعتراض بين يدي المصلي، رقم الحديث (٥١٢)
3. أحكام القرآن للجصاص الحنفي: ١/٢٥٣

اجتماع صلوٰتین

"جمع بین الصلوٰتین" کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ظہر آخری وقت، عصر اول وقت۔ یہ حنفیہ کے نزدیک بھی ضرورت کے وقت جائز ہے اور "مؤطا" وغیرہ کی روایت میں جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے [1] وہ اسی پر محمول ہے۔

کیا حائضہ نماز ادا کرے؟

کہتے ہیں "فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے اور نماز نہ پڑھے۔" معلوم نہیں فقہ کی کونسی کتاب میں یہ لکھا ہے، پھر آگے بخاری سے بھی نقل کیا ہے:

"إن الحائض تقضي الصيام ولا تقضي الصلوٰة"[2]

"حائضہ روزے رکھے اور نماز ادا نہ کرے۔"

اس جگہ جہاں فقہ کی طرف غلط نسبت کی ہے، وہاں بخاری کی عبارت کا بھی غلط مطلب لیا ہے۔ بخاری کا مطلب قضاء کی ادائیگی سے ہے کہ روزوں کی قضاء دینا ضروری ہے، جبکہ نماز معاف ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ تو اتفاقی ہے کہ حائضہ (ان ایام میں) نہ روزے رکھے اور نہ نماز پڑھے۔ اس کے بعد یہ بھی اتفاقی ہے کہ روزے کی قضاء دے اور نماز کی قضا نہ دے۔

آگے ایک عجیب غلطی کی ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ أمھات المؤمنین میں سے ایک بیمار تھیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتکاف بیٹھیں۔ بیماری کی وجہ سے ان کو خون آتا تھا۔[3] مصنف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ شاید حائضة تھیں! یہ مسئلہ پہلے بھی

---

[1] صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر، رقم الحديث(٧٠٥)، المؤطا: ١/١٤٤،

[2] صحيح البخاري: كتاب الصوم، باب الحائض، تترك الصوم والصلاة، یہ ابو الزناد کا قول ہے ، جسے امام بخاری نے ترجمة الباب کے بعد معلق ذکر کیا ہے۔

[3] صحيح البخاري : كتاب الحيض ، باب اعتكاف المستحاضة، رقم الحديث(٣٠٣)

ذکر ہو چکا ہے۔

رکوع وسجود میں قرآن

ایک حدیث میں منع آیا ہے، ❶ جبکہ دوسری حدیث مصنف کے خیال میں اس کے معارض ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ "سبوح قدوس رب الملئكة والروح" رکوع وسجدے میں پڑھا کرتے تھے۔" ❷ مصنف اس ورد کو قرآن کی آیت سمجھ رہے ہیں!!

نماز میں انسانی کلام

ایک حدیث میں تو منع آیا ہے کہ نماز میں کلام نہیں کرنا چاہئے۔ ❸ مگر مصنف کہتا ہے کہ آپ نے خود کلام کی، کیونکہ حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے کہا تھا: "ألعنك بلعنة الله" ❹ مصنف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بددعا بھی اس کلام میں داخل ہے، جو منع ہے، مگر دونوں حدیثوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دعا کلام ممنوع میں داخل نہیں اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ حدیث میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے نماز کو اس وقت چھوڑ نہیں دیا۔ اور عارضہ کیلئے نماز کو چھوڑنا جائز ہے۔

---

❶ صحيح مسلم: كتاب اللباس والزينة، باب النهي عن لبس الرجل الثوب المعصفر، رقم الحديث(٢٠٧٨)

❷ صحيح مسلم: كتاب الصلاة باب ما يقال في الركوع والسجود، رقم الحديث: ٤٨٧، یہ دعائیہ کلمات ہیں، جن کو رسول اکرم ﷺ رکوع وسجود میں پڑھا کرتے تھے، برق صاحب ان کو قرآنی الفاظ سمجھ بیٹھے ہیں، بنا بریں احادیث میں تعارض ثابت کر رہے ہیں!!

❸ صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة و نسخ ما كان من إباحته رقم الحديث(٥٣٧)

❹ صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب جواز لعن الشيطان في أثنا الصلاة والتعوذ منه وجواز العمل القليل في الصلاة، رقم الحديث (٥٤٢)

اس کے بعد دعاءِ قنوت میں بعض آدمیوں کا نام لے کر جو ان کیلئے استخلاص کی دعا کی، [1] اس کو بھی کلام میں داخل کر رہے ہیں۔ "إنا للّٰه وإنا إليه راجعون"!

دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا

"ہم دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارش کی دعا کے بغیر کسی اور دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔" [2]

جواب

مگر اس جگہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ بلند صرف استسقاء میں ہی کرتے تھے۔ بعض روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ بلکہ بخاری میں یہ لفظ بھی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اس قدر اٹھاتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی۔ [3]

جوتوں میں نماز

اس میں کوئی قباحت نہیں، سب جائز سمجھتے ہیں، بشرطیکہ جوتے پاک ہو۔ لیکن عرب میں جو "نعلین" کا لفظ وارد ہے، اس کا معنی "جوتا" کرنا ٹھیک نہیں، بلکہ اس کا معنی چپل ہے۔ چپل اور جوتے میں فرق ہے۔ چپل میں انگلیاں بعض وقت زمین پر لگ جاتی

---

[1] صحيح مسلم : كتاب المساجد، باب استحباب القنوت في جميع الصلاة إذا نزلت بالمسلمين نازلة، رقم الحديث (٦٧٥) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیر مسلمانوں کے لیے نماز میں رکوع کے بعد قنوت نازلہ کی تھی، جس کو برق صاحب ممنوع انسانی کلام میں داخل کر رہے ہیں!

[2] صحيح البخاري: كتاب الاستسقاء، باب رفع الإمام يده في الاستسقاء، رقم الحديث (٩٨٤)، صحيح مسلم: كتاب صلاة الاستسقاء، باب رفع اليدين بالدعاء في الاستسقاء، رقم الحديث (٨٩٥)

[3] صحیح البخاری (٩٨٤) کے الفاظ ہیں: "و إنه يرفع حتى يرى بياض إبطيه" مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: " فتح الباري: ٢/٥١٧

ہیں، لیکن جوتے میں سجدے کی حالت میں پاؤں معلق رہتا ہے۔

سجدے میں بازو کھولنا

کہتے ہیں ''انس سے روایت ہے: ''لا يبسط ذراعيه كالكلب''❶ ''کتے کی طرح بازو نہ کھولے''

اس جگہ مصنف نے ترجمہ غلط کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''کتے کی طرح زمین پر بازو نہ پھیلائے'' اب دوسری حدیث ❷ کے ساتھ معارض نہ ہوگا، کیونکہ ہاتھ کھولنے اور کروٹوں سے ہٹا رکھنے کا اس میں ذکر ہے۔ اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں زمین پر پھیلانے کی ممانعت ہے۔

پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا

یہ ثابت ہے، ❸ مگر حنفیہ کا خیال کسی عذر کی بناء پر تھا۔

نماز چھوٹی ہو یا لمبی

دونوں طرح جائز ہے، امام کیلئے بہتر یہ ہے کہ قیام اور تشہد ذرا لمبا کرے اور

---

❶ صحيح البخاري: كتاب مواقيت الصلاة، باب المصلي يناجي ربه، رقم الحديث(٥٠٩)

❷ یعنی جس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ رسول اکرم ﷺ سجدہ میں بغلوں کو اتنا کھول دیتے تھے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔(صحيح البخاري: كتاب الصلاة، باب يبدي ضبعيه و يجافي في السجود، رقم الحديث(٣٨٣)، صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب ما يجمع صفة الصلاة، رقم الحديث(٤٩٥)

❸ صحيح البخاري: كتاب صفة الصلاة، باب من استوى قاعدًا في الأرض إذا قام من الركعة، رقم الحديث(٧٩٠) چونکہ احناف کے پاس اپنے موقف (ترک جلسۂ استراحت) کی کوئی صریح و صحیح دلیل نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے عذر تراش کر اس حدیث کو ناقابل عمل بنانے کی سعی مذموم کی ہے، جو کہ اہل تقلید کی قدیم روش ہے۔ أعاذنا الله منه!

باقی ارکان میں اختصار سے کام لے۔

قومہ میں اختصار اور طول دونوں طرح وارد ہے۔ ❶ مگر طول عارضی ہوتا ہے۔ ظہر کی نماز کے قیام میں اگر طوالت اختیار کی جائے، تو کچھ حرج نہیں۔ ہاں عشاء کی نماز میں بہت زیادہ لمبی قرأت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ وہ نیند کا وقت ہوتا ہے۔

وقتِ عصر

''عصر کی نماز کے متعلق بخاری میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"كنا نصلي العصر ويذهب الذاهب منّا إلى قباء فيأتيهم والشمس مرتفعة" ❷

''ہم عصر کی نماز پڑھ لیتے، تو اگر کوئی جانے والا قباء جاتا، تو اس کے قبا پہنچنے تک سورج بلند ہوتا۔''

ایک روایت میں ہے کہ عوالی کی طرف جاتا، جب وہاں پہنچتا، تو سورج ابھی بلند ہوتا۔ اور بعض عوالی چار میل کے قریب ہیں۔ ❸ اس جگہ عوالی سے مراد قباء ہے، جیسا کہ پہلی روایت میں تصریح ہے۔

حدیث میں صرف ایک طرفہ مسافت طے کرنے کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے غلطی سے دو طرفہ مسافت طے کرنا سمجھا ہے۔ اور لفظ "یرجع" سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ حالانکہ "یرجع" کا معنی ہے: مدینہ سے عوالی کی طرف رجوع کرنا، نہ یہ کہ جا کر واپس آنا۔

اور عصر کا وقت گرمیوں میں سورج کے غروب ہونے سے تین گھنٹے قبل شروع ہو

---

❶ صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب اعتدال أركان الصلاة و تخفيفها في تمام۔

❷ صحيح البخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب وقت العصر، رقم الحديث (٥٢٦)

❸ مصدر سابق، رقم الحديث (٥٢٥)

جاتا ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ میں تین چار میل مسافت کا طے کرنا مشکل نہیں۔ اور سورج کے غروب ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی بھی ہو، تو سورج بلند ہی ہوتا ہے۔ پس سورج کے غروب ہونے سے اگر دو گھنٹہ پہلے بھی نماز پڑھی جائے، تو اتنی مسافت سورج غروب ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے طے کی جا سکتی ہے۔ مصنف نے یہ سمجھا ہے کہ اتنی مسافت طے کرنے کیلئے آدھا دن چاہئے، لہٰذا عصر ۲ بجے یا بارہ پونے بارہ بجے پڑھی جاتی ہو گی...... یہ اعتراض مضحکہ خیز ہی تو ہے!!

اعتراض:

"ابوامامہ کہتے ہیں کہ میں اور عمر بن عبدالعزیز نماز ظہر پڑھ کر معاً حضرت مالک بن انس کے ہاں چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نماز عصر پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا؟ کہنے لگے کہ حضور کا وقت یہی تھا۔" (دو اسلام:٢٤٨)

جواب:

اس حدیث کا ترجمہ بھی غلط کیا اور مطلب بھی غلط سمجھا۔ ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ساتھ نماز پڑھی (یعنی ان کی اقتداء میں) پھر انس بن مالک کے ہاں گئے، تو وہ عصر پڑھ رہے تھے۔ [1] یہاں لفظ "ثم" ہے، جو تراخی کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی ذرا ٹھہر کر گئے، یہ مطلب نہیں کہ معاً چلے گئے۔

جب ظہر کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اس وقت عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس دن ظہر کی نماز تاخیر کر کے پڑھی ہو گی۔ جیسے ان کے

---

[1] صحیح البخاري : کتاب مواقیت الصلاة، باب وقت العصر، رقم الحدیث(٥٢٤)، صحیح مسلم: کتاب المساجد: باب استحباب التبکیر بالعصر، رقم الحدیث(٦٢٣)

خاندان کی عادت تھی، کیونکہ بنو امیہ نماز میں تاخیر کیا کرتے تھے۔(فتح الباري) ❶

اس کے بعد لکھتے ہیں:

”چند اور اختلاف:

1 سجدہ میں آنحضرت ﷺ ”سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلي“ پڑھا کرتے تھے۔ ❷

2 آپ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

”اللهم إني أعوذبك من عذاب القبر“ ❸

3 حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی:

”اللهم إني ظلمت نفسي......إنك أنت الغفور الرحيم“ ❹

4 عبدالله بن أبي اوفیٰ کہتے ہیں کہ حضور رکوع کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

”ربنا لك الحمد ملء السموٰت وملء الارض ❺ ......“ لمبی دعا ہے۔

5 ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: حضور ﷺ نے ہم کو ”التحیات“ یوں پڑھایا تھا:

---

❶ فتح الباري: ٢/ ٢٨

❷ صحيح البخاري: كتاب صفة الصلاة، باب الدعاء في الركوع، رقم الحديث(٧٦١)

❸ صحيح البخاري: كتاب صفة الصلاة، باب الدعاء قبل السلام، رقم الحديث (٧٩٨)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب ما يستعاذ منه في الصلاة، رقم الحديث(٥٨٧)

❹ صحيح البخاري: كتاب صفة الصلاة، باب الدعاء قبل السلام، رقم الحديث(٧٩٩)

❺ صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب ما يقول إذا رفع رأسه من الركوع، رقم الحديث(٤٧٦) دعا کے الفاظ ہیں: ”اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰاتِ وَ مِلْءَ الْاَرْضِ وَ مِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ“

”التحیات المبارکات الصلوٰت الطیبات“ [1]

٦ أبو حمید الساعدي نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ نماز میں ہم آپ پر کس طرح ”صلوٰۃ“ بھیجا کریں؟ کہا اس طرح:

” أللھم صل علی محمد وعلیٰ أزواجه وذريته كما صليت علی إبراھیم وبارك علی محمد وأزواجه وذريته كما باركت علی إبراھیم!“ [2]

٧ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم ”التحیات“ ”عبدہٗ ورسولہٗ“ تک پڑھ چکو، تو پھر جو جی میں آئے، دعا مانگو۔“ [3] (دواسلام : ٢٤٩)

جو کچھ ان احادیث میں مذکور ہے وہ متبادل دعائیں ہیں یا زائد ہیں، جو مستحب ہیں۔ اس واسطے مروجہ نماز اور ان احادیث میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ ان احادیث میں یہ نہیں کہ یہی پڑھو۔ جو دعائیں اور درود مروجہ ہیں، ان کا ثبوت بھی احادیث سے ملتا ہے۔ کوئی عالم یہ نہیں کہتا کہ احادیث والی دعائیں منع ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب التشھد في الصلاۃ، رقم الحدیث(٤٠٣)

[2] صحیح البخاري: کتاب الأنبیاء، باب ﴿یزفون﴾ رقم الحدیث(٣١٨٩)، صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبي ﷺ في التشھد، رقم الحدیث (٤٠٧)

[3] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ ، باب التشھد في الصلاۃ ، رقم الحدیث(٤٠٢)

گیارہواں باب

بہترین عمل

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں چونکہ جہاد کی بہت فضیلت اور تاکید آئی ہے، اس لئے وہ بہترین عمل ہے، مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا کھلانا اور آشنا اور ناآشنا سب کو سلام کہنا، اچھا اسلام ہے۔ نیز مسلمان کو زبان اور ہاتھ سے دکھ نہ پہنچانا، اچھا اسلام ہے۔ ان دو احادیث میں جہاد کا ذکر ہی نہیں۔

اعتراض:

اب ایسی احادیث سنئے، جن میں جہاد کو تیسرے یا چوتھے درجہ کی نیکی بتایا گیا ہے:

① عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت سے پوچھا کہ سب سے بہتر عمل کونسا ہے؟ فرمایا: نماز بہ پابندی وقت۔ اس کے بعد والدین کی خدمت اور اس کے بعد جہاد۔ (بخاري) ❶

دیکھا آپ نے نماز کو کہاں رکھ دیا اور جہاد کو کہاں پھینک دیا!

② ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور علیہ السلام سے کہا:

"نرى الجهاد أفضل العمل، أفلا نجاهد؟ قال لا ولكنّ أفضل

❶ صحيح البخاري: كتاب مواقيت الصلاة، باب فضل الصلاة، لوقتها، رقم الحديث (٥٠٤) ، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب كون الإيمان بالله تعالىٰ أفضل الأعمال، رقم الحديث(٨٥)

الجهاد حج مبرور"[1]

"ہماری رائے میں جہاد بہترین عمل ہے، کیا ہم جہاد نہ کریں؟ فرمایا نہیں، بلکہ حج بہترین جہاد ہے۔"[2]

③ کسی شخص نے حضور سے پوچھا کہ بہترین عمل کونسا ہے؟ فرمایا: خدا اور رسول پر ایمان، اس کے بعد جہاد اور اس کے بعد حج۔[3]

اوپر والی حدیث میں بہترین عمل حج تھا اور اس کے بعد جہاد، اس حدیث کے مطابق حج سے جہاد بہتر ہے۔ قرآن کہتا ہے: جان و مال کی قربانی کے بغیر جنت نہیں ملے گی۔ لیکن حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ جہاد کرو، نہ کرو، جنت تمہاری ہے!

قرآن لاکھ چلائے کہ ہم جہاد کے بغیر جنت نہیں دیں گے، لیکن حدیث کہتی ہے کہ اللہ نمازی اور روزہ دار کو جنت میں بھیجنے پر مجبور ہے۔

ابن ماجه اور ترمذي کی ایک حدیث ملاحظہ ہو:

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، رقم الحديث(١٤٤٨)

[2] اس حدیث سے جہاد کی افضلیت ثابت ہو رہی ہے نہ کہ حج افضل ثابت ہوتا ہے، اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ برق صاحب نے حدیث میں وارد لفظ "لَكُنَّ" کو " لٰكِنْ " (حرف استدراک) سمجھ کر ترجمہ غلط کیا ہے۔ جس کی وجہ سے حدیث پر اعتراض کر رہے ہیں، حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

"ہم جہاد کو سب سے افضل عمل سمجھتے ہیں، تو کیا ہم بھی جہاد نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم عورتوں کے لیے بہترین جہاد حج مبرور ہے۔" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کے حق میں حج افضل عمل ہے۔ دیکھیں: فتح الباري: ٣٨٢/٣

[3] صحيح البخاري: كتاب الإيمان، باب من قال إن الإيمان هو العمل، رقم الحديث(٢٦)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب كون الإيمان بالله تعالىٰ أفضل الأعمال، رقم الحديث(٨٣)

"کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل کونسا ہے؟ ایسا عمل جو تمہارے درجوں کو بلند کر دے، جو سونے اور چاندی کی قربانی سے بہتر ہو اور اس جہاد سے بھی اچھا ہو، جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے اور اپنی کٹاتے ہو؟" لوگوں نے کہا: بتائیے!، کہا: اللہ کا ذکر!"[1]

جواب:

حدیثوں میں جہاد پر آنحضرت ﷺ کے بہت زیادہ اقوال موجود ہیں:

① ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کسی نے کہا: یا رسول اللہ! بہترین آدمی کون ہے؟ فرمایا: وہ مومن جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں!"[2]

② "اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام صرف کرنا، دنیا کا بہترین عمل ہے۔"[3]

اسی طرح دیگر احادیث میں جہاد کی فضیلت آئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ "أفضل الأعمال" یعنی بہترین اعمال کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اور وجہ اختلاف کی یہ ہے کہ وجوہ افضلیت مختلف ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

① کبھی ایک عمل اس لئے افضل ہوتا ہے کہ کفر اور اسلام میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا عمل فارق نہیں ہوتا، جیسے ایمان۔

---

[1] سنن الترمذي: أبواب الدعوات، باب منه، رقم الحديث(٣٣٧٧)، سنن ابن ماجه: كتاب الأدب، باب فضل الذكر، رقم الحديث(٣٧٩٠)

[2] صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب أفضل الناس مؤمن يجاهد بنفسه و ماله في سبيل الله ، رقم الحديث(٢٧٣٤)، صحيح مسلم: كتاب الإمارة، باب فضل الجهاد والرباط، رقم الحديث(١٨٨٨)

[3] صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب الغدوة والروحة في سبيل و قاب قوس أحدكم من الجنة، رقم الحديث(٢٦٣٩)، صحيح مسلم: كتاب الإمارة، باب فضل الغدوة والروحة في سبيل الله تعالىٰ، رقم الحديث(١٨٨٠)

② کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جتنا دخل ایک عمل کو اظہارِ شعائرِ اسلام میں ہوتا ہے، دوسرے کو نہیں ہوتا، جیسے حج۔

③ اور بعض اعمال اس قسم کے ہیں کہ حقوق العباد میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا، جیسے والدین سے احسان کرنا۔

④ اور کبھی ایک عمل کی افضلیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عمل اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے پیش پیش ہوتا ہے، جیسے جہاد فی سبیل اللہ۔

⑤ اور کبھی ایک عمل اس لئے افضل ہوتا ہے کہ وہ وسائل سے نہیں، بلکہ مقاصد میں سے ہوتا ہے اور تقرب إلی اللّٰہ کے لیے پیش پیش، جیسے نماز اور ذکر اللہ۔

ان وجوہ مذکورہ کا آپس میں بھی تفاوت ہے، مثلاً وسیلہ مقصد سے بہتر نہیں ہوتا۔ اس لئے نماز، روزہ، جہاد سے افضل ہوں گے۔ کیونکہ نماز مقصد ہے اور جہاد اس کا وسیلہ۔ یعنی جہاد سے اصل مقصد یہ ہے کہ امن و امان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿الذين إن مكنهم في الأرض أقاموا الصلوٰة واتوا الزكوٰة﴾ ❶

''اگر ہم نے ان کو زمین میں اقتدار بخشا، تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿قد أفلح من تزكى ۝ وذكر اسم ربه فصلى﴾ ❷

---

❶ الحج: ٤١

❷ الأعلى: ١٤-١٥

''جو شخص پاک ہو کر اللہ کا نام لے اور نماز پڑھے، وہ کامیاب ہوا۔''

نیز جو وسیلہ ہوگا، وہ اسی وقت تک رہے گا، جب تک مقصد حاصل نہ ہو اور مقصد اس کے بعد بھی رہے گا۔ پس جہاد اسی وقت تک ہے، جب تک دنیا میں فتنہ ہے، جب فتنہ نہ رہے گا، تو جہاد ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جب فتنہ ہوگا، جہاد کو ہی اولیت اور افضلیت حاصل ہوگی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وقاتلوهم حتیٰ لا تکون فتنة﴾ ❶

''لڑو یہاں تک کہ فتنہ (شرک) نہ رہے۔''

جب قتال ختم ہو گیا، تو اس وقت اس کو نیک عمل بھی نہیں کہہ سکتے، چہ جائیکہ اس کو بہترین عمل کہیں۔ پھر عمل کا مرتبہ متعین کرنے میں عامل کی حالت کو بھی دخل ہوتا ہے۔ ایک مالدار آدمی کیلئے کھانا کھلانا خصوصاً قحط میں بہترین عمل ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿وما أدراك ما العقبة ٥ فك رقبة ٥ أو إطعام في يوم ذي مسغبة ٥﴾ ❷

''آپ کو کیا علم کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟ وہ غلام آزاد کرنا اور قحط میں کھانا کھلانا ہے۔''

اور سورۂ حاقہ میں فرمایا:

﴿إنه كان لا يؤمن بالله العظيم ٥ ولا يحض على طعام المسكين﴾ ❸

---

❶ البقرة:١٩٣

❷ البلد:١٢-١٣-١٤

❸ الحاقة:٣٣-٣٤

''وہ جہنم میں اس لئے گیا کہ اللہ عظیم پر اس کا ایمان نہ تھا اور مسکین کے کھلانے پر ترغیب نہ دیتا تھا۔''

سورۃ مدثر میں فرمایا:

﴿قالوا لم نك من المصلين ٥ ولم نك نطعم المسكين ٥ وكنا نخوض مع الخائضين ٥ وكنا نكذب بيوم الدين﴾ [1]

(دوزخی کہیں گے ہم جہنم میں اس لئے گرے کہ) ''ہم نمازی نہ تھے، نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، بیہودہ باتیں کرتے اور دن جزاء کو جھٹلاتے تھے۔''

بلکہ جہاد میں کامیابی کا راز ہی ''ذکر اللہ'' کو بتایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿إذا لقيتم فئة فاثبتوا واذكروا الله كثيرا لعلكم تفلحون﴾ [2]

''جب کسی (دشمن) جماعت سے ملو، تو جم کر لڑو، اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

قرآن مجید نے جس قدر ''ذکر اللہ'' کی تاکید کی ہے، کسی اور عمل کی نہیں کی:

﴿اذكروا الله كثيرا﴾ [3]

''اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو۔''

اس تمہید کے بعد بالاختصار بالترتیب جواب سنئے:

1 اس حدیث میں کھانا کھلانا اور سلام کہنا اچھا بتایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، بعض حالات میں کھانا کھلانا، بہترین عمل ہوتا ہے اور سلام کا پھیلانا، انس اور

---

1 المدثر:٤٣-٤٦

2 الأنفال:٤٥

3 مصدر سابق

الفت پیدا کرنے کیلئے بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

۲ کسی مسلمان کو کسی مسلمان سے اذیت نہ پہنچنا، اتحاد و اتفاق و انسیت و محبت کا بہترین وسیلہ ہے اور اتفاق و اتحاد جہاد کا مقدمہ ہے۔ کیونکہ منتشر قوم جہاد نہیں کر سکتی۔ اس واسطے قرآن نے جہاد کے مقام پر نزاع سے روکا ہے۔ فرمایا:

﴿و لا تنازعوا فتفشلوا﴾ ❶

''نزاع نہ کرو، اس سے بددل ہو جاؤ گے۔''

۳ مقصد اور تقرب الی اللہ کے لحاظ سے نماز سب سے بہتر ہے۔ اور حقوق العباد میں سب سے بہتر عمل والدین کے ساتھ احسان ہے۔ پھر اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے جہاد۔ نماز بلحاظ مقصد کے جہاد اور والدین کے ساتھ احسان کرنے سے بہتر ہے۔ جہاد میں نفع اکثر مخلوق کو ہے اور والدین کے ساتھ احسان کرنے میں نفع صرف والدین کو ہے۔ والدین کے ساتھ احسان کرنا، دوسری مخلوق کے ساتھ احسان کرنے سے بہتر ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے، جب فرضِ عین نہ ہو۔ اگر فرضِ عین ہو، تو جہاد والدین کے ساتھ احسان کرنے سے بھی افضل اور مقدم ہے۔

۴ عورتوں کیلئے جب جہاد فرض عین نہ ہو، تو حج جہاد سے بہتر ہے۔ اگر فرض عین ہو، تو پھر عورتوں کے لیے جہاد افضل ہے۔ حدیث میں اولاً تو مخاطب عورتیں ہیں، ثانیاً اس میں لفظ '' لکُنَّ '' استعمال ہوا ہے۔ اس لئے یہ حکم عورتوں کے لیے ہے۔

۵ کفر اور اسلام میں فرق صرف ایمان کے ساتھ ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر نجات نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جہاد، اگر فرض ہو اور پھر حج۔ اگر جہاد فرض عین نہ ہو اور حج فرض ہو، تو حج بہتر ہوتا ہے، کیونکہ فرض عین، فرض کفایہ سے افضل ہوتا ہے۔

❶ الأنفال: ٤٦

٦ اللہ کا ذکر تقرب الی اللہ کے بارہ میں سب سے بہتر ہے۔ جہاد چونکہ وسیلہ اور ذکر اللہ مقصد ہے، اس واسطے ذکر اللہ بہتر ہے۔ مگر جہاد فرض عین یا فرض کفایہ ہونے کی بناء پر ذکر اللہ سے بہتر ہے۔ افضلیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ولذكر الله أكبر﴾ ❶

''اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔''

اور قرآن مجید نے بھی بعض جگہ جہاد کے بغیر جنت کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو غیر مجاہدین سے افضل قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿فضل الله المجاهدين بأموالهم و أنفسهم على القاعدين درجة و كلا وعد الله الحسنىٰ﴾ ❷

''مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بیٹھنے والوں پر فضیلت دی ہے اور ہر ایک کو اچھا وعدہ دیا ہے۔'' (یعنی جنت کا) ❸

اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد بعض وقت فرض عین ہوتا ہے اور کبھی کفایہ۔ پہلی صورت میں نجات کیلئے جہاد کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری صورت میں فضیلت کا جزو ہوتا ہے۔ کیا اب بھی معترض کیلئے کوئی اشکال باقی رہ جاتا ہے؟

---

❶ العنكبوت: ٤٥

❷ النساء: ٩٥

❸ تفسير الطبري: ٤/٢٢٩، تفسير القرطبي: ٥/٣٢٤، تفسير ابن كثير: ١/٧١٨

بارھواں باب

''اللہ کی عبادت''

لکھتے ہیں:

''اس وقت مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے کم نہیں۔ ان کی آٹھ نو ٹوٹی پھوٹی سلطنتیں بھی موجود ہیں، لیکن ذرا عبرت سے دیکھئے کہ ان کی حالت کیا ہے؟ اول درجے کے جاہل، غیر منظم، بدمعاشرت، نہ کھانے کی تمیز، نہ بات کرنے کا ڈھنگ، نہ قبائح سے نفرت، نہ محاسن کا شوق، چھ کروڑ روسیوں کو دیکھو، ڈھوروں سے بدتر، ایک کروڑ قبائلیوں کی حالت کہ جہالت میں چوٹی تک ڈوبے ہوئے اور صابن سے نا آشنا، چالیس لاکھ کشمیریوں اور پانچ کروڑ چینی مسلمانوں کی حالت ان سے بھی بدتر، مسلمان ہر آب و ہوا ہر ملک میں ملتے ہیں، لیکن ہر جگہ چند چیزیں ان میں مشترک ہیں۔ یعنی جہالت، غلاظت، افلاس، پستی، کام چوری، کاہلی اور اپنی قوم سے غداری۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بری حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے، ملّا اور اس کا حدیثی اسلام! دنیائے اسلام میں لاکھوں مساجد ہیں۔ ان میں لاکھوں ملّا، اور ہر ملّا صبح و شام مسلمانوں کو مندرجہ ذیل اسباق دے رہا ہے کہ:

① صرف تم اللہ کے محبوب ہو، یہ امت بخشی بخشائی ہے اور اللہ تمہیں کبھی عذاب نہیں کرے گا۔

② ”الدنیا جیفة وطلابها کلاب“ [1]

”دنیا ایک مردار ہے جس کے طالب کتے ہیں۔“

③ ”المؤمن لا ینجس“ [2]

”مومن جسم پر کتنی ہی غلاظت مل لے، وہ ناپاک نہیں ہوتا۔“

④ صرف کلمہ پڑھ لینے سے بہشت مل جاتی ہے۔

⑤ فقہ اور حدیث کے بغیر باقی تمام علوم ناپاک ہیں۔ سائنس گناہ اور کائنات میں غور کرنا کفر ہے۔

⑥ دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت دو نفل ہیں۔

⑦ ہر نتھو خیرا، خواہ وہ چنگیز ہو یا ہٹلر، اگر ہم پہ حکومت کر رہا ہے، تو وہ ہمارا اولی الامر ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔

⑧ خرقہ دنیا کا بہترین لباس ہے۔

⑨ فلاں دعا ایک لاکھ حج اور لاکھ شہیدوں کا ثواب دلاتی ہے اور جنت میں ایک لاکھ محل مفت بناتی ہے۔

⑩ مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن ہے۔

⑪ اللہ نے فلاں اختیارات فلاں مُردے کے حوالے کر دیئے ہیں، اس لئے اس سے مرادیں مانگو۔

انصافاً کہو کہ اگر کسی آدمی کے دماغ میں اس قسم کے عقائد ٹھونس دیئے جائیں کہ دنیا مردار ہے، سائنس گناہ ہے، سب سے اچھا لباس گدڑی

---

[1] یہ روایت ”موضوع“ ہے۔(کشف الخفاء:۱۳۱۳)

[2] صحیح البخاري: کتاب الغسل، باب الجنب یخرج و یمشي في السوق وغیرہ، رقم الحدیث (۲۸۱)، صحیح مسلم: کتاب الحیض، باب الدلیل علی أن المسلم لا ینجس، رقم الحدیث(۳۷۱)اس حدیث کی تشریح آگے آ رہی ہے۔

ہے۔ بہشت ہمارے پاس رہن ہو چکی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کو تنظیم کی کیا ضرورت؟ جہاد کیوں کیا جائے؟

ملاّ تیرہ سو برس سے انہی عقائد کی تبلیغ کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوہام واباطیل ملت کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے۔ ہر فرد دعا گو اور دعا خواں بن کر دنیائے عمل سے کوسوں دور جا پڑا۔ نہ بلندیوں کا شوق، نہ محنت سے لگاؤ، نہ عمل سے تعلق، نہ لہو میں حرارت۔ نہ سینوں میں تڑپ، نہ نغموں میں لذت، نہ نوحوں میں اثر، پاؤں ذوقِ رفتار سے بیگانہ اور ہاتھ کارِ لذت سے محروم۔

ہر مرض، ہر افتاد اور ہر حادثہ کا علاج دعا سے کیا جاتا رہا، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اتحادیوں نے مار مار کر ترکی کا حلیہ بگاڑ دیا اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان " رَبَّنَا انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ "کی لمبی لمبی دعائیں مانگتے رہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ دنیا دارالعمل ہے۔ یہاں صرف عمل ؟ سے بیڑے پار ہوتے ہیں۔ سارا قرآن محنت، صبر، ابتلاء، جاں سپاری اور جہاد کی طرف بلا رہا ہے اور قدم قدم پر یہ دھمکی دے رہا ہے کہ اگر تم نے عمل چھوڑ دیا، تو ہم کسی اور قوم کو تمہارا وارث بنا دیں گے۔ وہ امیہ، وہ عباسیہ، وہ ہسپانوی، وہ سلاجقہ، وہ تیموری، وہ ایوبی اور اس طرح کے ایک سو بیں اور سلسلے، جب یہ سب عیاش بن گئے، کام چھوڑ دیا، محنت سے کترانے لگے، تو اللہ (تعالیٰ) نے ان کی داستانِ عظمت و حشمت افسانہ بنا کے رکھ دی۔ دنیا میں ہر عمل کا ایک صلہ ہے، جو کسی صورت میں اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کچھ اور ہی کہتی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ کے

ہمراہ ایک سواری پر تھا، آپ نے فرمایا کہ جو شخص منہ سے ''لا إله إلا اللّٰه'' کہے گا، اس پر جہنم کو حرام کر دیا جائے گا۔ معاذ نے پوچھا: میں سب کو ارشاد سناؤں؟ فرمایا کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے سُست ہو جائیں گے۔ چنانچہ معاذ نے مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی۔ ❶

بعض علماء کہتے ہیں کہ کلمہ اسلام کا دروازہ ہے۔ جو شخص اس دروازے میں داخل ہوگا، یا یوں کہیے کہ اسلامی سوسائٹی کا ممبر بن جائے گا، اسے لازمی اسلامی کردار اختیار کرنا پڑیگا، لیکن یہ فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ کو اس حدیث کی تبلیغ سے کیوں روک دیا؟ کیا اسلامی کردار سستی پیدا کرتا ہے؟ ہمارے اس استدلال کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(آگے مسلم والی ایک حدیث بیان کی ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔) ❷

(اس کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ) ابوذر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس گیا، آپ نے فرمایا: جب کوئی آدمی ''لا إله إلا اللّٰه'' کہتا ہے اور اس کی موت اسی عقیدے پر ہو جاتی

---

❶ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون قوم كراهية أن لا يفهموا ،رقم الحديث(۲۱۸)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً، رقم الحديث(۱۲۸)

❷ یعنی جس حدیث میں ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ جو شخص بھی دل کے یقین کے ساتھ '' لاإله الا اللّٰه'' کی گواہی دیتا ہے، اس کو جنت کی خوشخبری دے دو، جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث سنائی، تو وہ ان کو نبی اکرم ﷺ کے پاس لے گئے اور بعد میں آپ ﷺ نے عام لوگوں کو اس حدیث کی خبر دینے سے منع کر دیا۔(صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً، رقم الحديث(۳۱)

ہے، تو وہ جنت میں چلا جاتا ہے، میں نے پوچھا: اگر وہ زانی اور چور ہو تو پھر؟ فرمایا: پھر بھی جنت میں جائے گا۔ میں نے تین مرتبہ یہی سوال پوچھا اور آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا، اور چوتھی مرتبہ کہنے لگے۔ "علیٰ رغم أنف أبی ذرِ" [1] کہ وہ جنت ہی میں جائے گا، خواہ ابوذر کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو!

حالانکہ بعض ایسی احادیث بھی ہیں، جو ان احادیث کے بالکل خلاف ہیں، مثلاً:

1. غماز جنت میں نہیں جائے گا۔ [2]
2. تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ گفتگو کرے گا، نہ انہیں دیکھے گا اور نہ ان کے گناہ معاف کرے گا، بلکہ انہیں سخت عذاب دے گا:
   - **اوّل** : دامن گھسیٹ کر چلنے والا۔
   - **دوم** : احسان کر کے جتانے والا۔
   - **سوم** : جھوٹی قسم کھا کر سوذا بیچنے والا۔ [3]

ایک حدیث میں ہے، جو شخص کسی مسلمان کا حق کھاتا ہے، اس پر جنت حرام کر دی گئی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا: خواہ وہ حق بہت تھوڑا ہو؟ فرمایا: وہ درخت کی ایک ٹہنی ہو۔" [4] (دو اسلام)

---

[1] صحيح البخاري: كتاب اللباس، باب الثياب البيض، رقم الحديث(٥٤٨٩)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب من مات لا يشرك بالله شيئاً دخل الجنة، رقم الحديث(٩٤)

[2] صحيح البخاري: كتاب الأدب، باب ما يكره من النميمة، رقم الحديث(٥٧٠٩)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان ، باب بيان غلظ تحريم النميمة، رقم الحديث(١٠٥)

[3] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار...... رقم الحديث (١٠٦)

[4] صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب وعيد من اقتطع حق مسلم بيمين فاجرة بالنار، رقم الحديث(١٣٧)

جواب:

ابوہریرۃ، معاذ اور ابوذر رضی اللہ عنہم کی حدیث کا جواب ہو چکا ہے۔ ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صدق دل سے کلمہ پڑھے، ضرور ہے کہ قرآن وسنت پر عمل کرنے پر آمادہ ہو گا، مگر پھر بھی بشر ہے اور بشر سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اگر کسی وقت اس سے اس قسم کی غلطی سرزد ہو، تو ضرور ہے کہ وہ فوری طور پر سنبھل جائے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ غلطی کے بعد توبہ کرے اور پشیمان ہو کر استغفار کرے، [1] اور فتح الباري میں ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اخیر میں یہ لفظ ہیں کہ "ثم ندم واستغفر" پھر پشیمان ہو کر تائب ہو جائے، تو اس صورت میں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور اس معنی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

باقی تیرہ باتیں جو ملا اور حدیثی اسلام کی طرف منسوب کی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں۔ بعض کی نسبت حدیث کی طرف تو بہتان ہے۔ اور بعض حدیثیں موضوع ہیں اور بعض کا مطلب غلط بیان کیا گیا ہے:

1. "یہ امت بخشی بخشائی ہے" یہ اس امت کیلئے ہے، جو متبع ہو، نہ اس امت کیلئے، جو نافرمان ہو۔ حدیثوں میں اس کی تعمیم ثابت نہیں۔
2. دنیا سے وہ چیزیں مراد ہیں، جو اللہ سے غافل کریں۔ نہ مال دنیا، خواہ غافل کرے یا نہ کرے۔
3. "مومن نجس نہیں ہوتا" کا تو یہ مطلب ہے کہ مومن کی عادت ہے کہ وہ نجاست سے پرہیز کرتا ہے، اس لئے حدث اور جنابت میں بھی وہ پاک ہی رہتا ہے۔ یہ کہنا کہ "مومن جسم پر کتنی ہی غلاظت مل لے، ناپاک نہیں ہوتا" جہالت ہی

---

[1] صحيح البخاري (٥٤٨٩)

نہیں، حدیث سے استہزاء بھی ہے!

④ صرف کلمہ پڑھنے سے نجات کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔

⑤ ''فقہ اور حدیث کے علاوہ باقی علوم ناپاک ہیں۔'' یہ فتویٰ کسی عالم کا نہیں، جبکہ درس نظامی میں صرف ونحو، ادب، اصول فقہ، تفسیر، اقلیدس، حساب، علم ہندسہ موجود ہیں۔ بلکہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کا فتویٰ موجود ہے کہ مسلمانوں کو انگریزی سیکھنی چاہئے۔

⑥ ''دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت دو نفل ہیں۔'' اس حدیث کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''تمام دنیا و مافیہا سے دو رکعتیں بہتر ہیں۔''[1] یعنی یہ دو رکعتیں آخرت کا زاد ہیں۔ اس لئے وہ دنیا سے بہتر ہیں۔

⑦ ہر نتھو خیرے کو اہل علم امیر نہیں مانتے، اگر کسی نے غلطی کی ہے، تو تمام علماء کیوں کر مطعون ٹھہرے؟!

⑧ گدڑی والی حدیث پر پہلے بحث ہو چکی ہے کہ یہ ''صحیح'' نہیں۔[2] نہ علماء محققین اس قسم کی احادیث بیان کرتے ہیں۔

⑨ لاکھ شہید کے ثواب والی روایات موضوعة کو بھی اہل علم جو حدیث سے

---

[1] یہ روایت انقطاع و ارسال کی وجہ سے ضعیف ہے، اس روایت کے متعلق حافظ عراقی فرماتے ہیں: وہ صحیح نہیں ہے۔(الزهد لابن المبارك:٤٥٦(١٢٨٩)، التهجد و قيام الليل لابن أبي الدنيا:٣٥٥ (٢٩٤)، تخريج أحاديث الإحياء للعراقي:١/٣٢٦، السلسلة الضعيفة: ١٣٥/٨.

[2] یہ روایت ''موضوع'' ہے۔(الموضوعات لابن الجوزي:٣/٤٨، الفوائد المجموعة: ١٩٢، السلسلة الضعيفة:١/٢٠٦(٩٠)

واقف ہیں، بیان نہیں کرتے۔

⑩ ''مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن نہیں۔'' یہ بھی محققین علماء کا مذہب نہیں ہے۔

اسی طرح مُردوں کے سپرد اختیارات کا ہونا بھی علماء واقف کار کا خیال نہیں۔

اگر بعض ملّاؤں نے جو بالکل جاہل تھے، ایسی باتیں کہی ہوں، تو اس کا اثر تمام دنیا کے مسلمانوں پر کیسے پڑسکتا ہے؟

مسلمانوں کی پستی و زوال و نکبت و افلاس کا جائزہ لینے کیلئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ملاّ کی یہ بات تو مان لی گئی کہ جہاد کو چھوڑ دیا۔ مگر ملاّ کا یہ کہنا کہ ''نماز پڑھو اور روزے رکھو۔'' اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ حقیقت پر پردہ نہ ڈالئے۔ اصل وجہ جس کی بناء پر یہ سب عیوب مذکورہ پیدا ہوئے، کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگ اندھی تقلید کے عادی ہوگئے اور قرآن و سنت میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا، اور بعض لوگ اس قدر آزاد ہوگئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کی روش کو چھوڑ کر غور کرنے لگے۔

قرآن و سنت میں مجموعی نظر کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور یہی آئمہ و محدثین، اہلحدیث اور محققین اہل سنت کا مسلک چلا آرہا ہے کہ سلسلۂ اسباب میں دعا بھی داخل ہے۔ جیسے نتائج کے ظاہر اسباب ہیں، اسی طرح بعض اسباب پوشیدہ بھی ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں جابجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً تقویٰ و نیکی رزق کی وسعت کا سبب ہے، جب کہ بدکاری رزق کی تنگی کے اسباب میں داخل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجارت، زراعت، صنعت و ملازمت کو وسعتِ رزق میں کوئی دخل نہیں۔ کبھی کبھی باطنی اور ظاہری اسباب موافق ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تعارض ہوتا ہے۔ اس تعارض میں کبھی ظاہر کو ترجیح ہوتی ہے، اور کبھی باطنی اسباب کو، اس کیلئے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کیلئے حکمت ہوتی ہے، پس حکمت کے مطابق ''نتائج کا نکلنا'' اسی کا نام ''سنة اللّٰه'' ہے۔ اور جیسے ظاہری اسباب کا

حاصل کرنا نتیجہ کے حصول کیلئے ضروری ہے۔ اسی طرح باطنی اسباب مثلاً نماز، روزہ، ذکر اللہ اور خلق سے رحم وغیرہ کو اختیار کرنا بھی لازمی ہے۔ جیسے توپ و تفنگ کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی ﴿ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ﴾ [1] کہنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح اخلاقی اصلاح اور حاکمانہ اوصاف کا پیدا کرنا بھی فرض ہے۔

---

[1] البقرة:٢٨٦

تیرھواں باب

لفظ ''مغفرت'' کی تحقیق

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''مغفرت کے معنی ہیں پردہ پوشی کے، یعنی معاف نہیں ہوتا، بلکہ اس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جو گناہ ہوتا ہے، اس کی سزا مل جاتی ہے۔ جو محنت نہ کرے وہ ایک دفعہ فیل ہو کر سزا بھگت لیتا ہے۔ سو اگر اپنی اصلاح کرے، یعنی محنت کرے، تو اس کے گناہ (نہ محنت کرنے پر) ہرجانہ ہے۔ اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک گناہ سے بچنا، دوم تلافی مافات کیلئے صحیح اور فطری کوشش کرنا۔ خرابی صحت کیلئے فطری کوشش عادتِ بد سے اجتناب اور ورزش وغیرہ ہے، نہ کہ ڈھول بجانا یا سُر سے ہیر رانجھا پڑھنا۔ امتحان میں ناکامی کا علاج کثیف نصاب کو پڑھنا اور مضامین کو یاد کرنا ہے، نہ کہ باہر جا کر گڑھے کھودنا۔

لیکن بعض احادیث ایسی موجود ہیں، جو تلافی مافات کیلئے غیر فطری اور مضحکہ خیز تدابیر پیش کرتی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چند آدمیوں کو وضو کا طریقہ بتا کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح وضو کیا کرتے تھے۔ جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے، اس کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ (بخاري) [1]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الوضوء، باب الوضوء ثلاثا ثلاثا، رقم الحديث(١٥٨)، صحيح مسلم: كتاب الطهارة، باب صفة الوضوء و كماله، رقم الحديث(٢٢٦) اس حدیث کے ←

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرنے کے بعد وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے، تو گناہ معاف ہو گیا۔ یا کوئی طالبعلم سال بھر کام نہ کرے اور آخر میں دو رکعت نماز پڑھ لے، تو سستی کا گناہ معاف ہو گیا۔ یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگیں تڑوا لے اور فوراً دو رکعت نفل پڑھ لے، تو گناہ معاف!

۲۔ جب نماز میں امام ﴿ولا الضالین﴾" کہے اور مقتدی "آمین" کہیں اور ان کی آمین کا وقت فرشتوں کی آمین کے وقت سے مل جائے، یعنی سب ہم نوا ہو جائیں، تو ان سب کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ [1]

۳۔ کتے کو پانی پلانے۔

۴۔ راستے سے کانٹا ہٹانے۔

۵۔ اور چند دعاؤں کے ورد کرنے سے یہ سارے گناہ معاف کئے جا رہے ہیں۔

۶۔ وضو کرنے سے منہ، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ [2]

(دو اسلام)

جواب:

مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ گناہ معاف ہو جائے، یعنی اس کا اثر جاتا رہے۔ اس جگہ اثر سے مراد وہ اثر ہے، جو اس کے صحیفے میں درج ہو چکا ہے یا اس کے

← آخر میں مندرجہ ذیل الفاظ ہیں: "غفر له ما تقدم من ذنبه" یعنی ایسے شخص کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، نہ کہ اگلے گناہ، جیسا کہ برق صاحب سمجھ رہے ہیں! اس حدیث میں ایسے کوئی الفاظ نہیں ہیں، جن سے مترشح ہوتا ہو کہ ایسے شخص کے آئندہ سرزد ہونے والے گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا اس کا ترجمہ "تمام اگلے پچھلے گناہ معاف" کرنا درست نہیں۔

[1] صحيح البخاري: كتاب الصلاة، باب جهر المأموم بالتأمين، رقم الحديث (٧٤٩)

[2] صحيح مسلم: كتاب الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، رقم الحديث (٢٤٤)

روح پر طاری ہو چکا ہے۔ مغفرت کے بہت سے اسباب ہیں:

مغفرت کے اسباب:

① توبہ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ پچھلے گناہ کو چھوڑ دے اور آئندہ کیلئے اس سے رک جانے کا پختہ ارادہ کرے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿قل للذين كفروا إن ينتهوا يغفر لهم ما قد سلف﴾ [1]

''کافروں سے کہہ دیجئے، اگر وہ رک جائیں، تو ان کے پہلے گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی۔''

② نیکیوں سے بھی گناہ کے وہ اثرات جو دل پر چڑھ گئے ہوں، دور ہو جاتے ہیں:

﴿إن الحسنات يذهبن السيئات﴾ [2]

''نیکیاں گناہوں کو لے جاتی ہیں۔''

گناہ کی مثال بیماری کی سی ہے۔ بیماری کے ازالہ کیلئے پرہیز کی سخت ضرورت ہے۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں، جو پرہیز سے زائل ہو جاتی ہیں۔ پھر غذا اور ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض بیماریاں اس قسم کی ہوتی ہیں، جو صرف غذا اور ہوا کی تبدیلی اور اصلاح سے رفع ہو جاتی ہیں۔ اور بعض میں علاج بالدواء کی ضرورت ہوتی ہے۔ توبہ بمنزلہ پرہیز کے ہے۔ نیکیاں بمنزلہ غذا اور ہوا کے ہیں اور استغفار و دعا بمنزلہ علاج بالدواء کے ہے۔ دعا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ادعوني أستجب لكم﴾ [3]

---

[1] الأنفال:٣٨

[2] هود:١١٤

[3] غافر:٦٠

''مجھ سے دعا کرو، میں تمہارا مقصد پورا کروں گا۔''

گناہ کے اثرات:

گناہ کے اثرات دو قسم کے ہیں:

ایک وہ طبعی نتائج جن کو مادی کہنا زیادہ مناسب ہے، جیسے نہ پڑھنے سے فیل ہو جانا، درخت پر سے کودنے سے ٹانگ ٹوٹ جانا اور باپ کو قتل کرنے سے اس کے سایہ سے محروم ہو جانا۔

اور بعض اثرات جن کو ''شرعی'' کہنا زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ ان کا وجود شریعت سے معلوم ہوا ہے، جیسے دل کا سیاہ ہو جانا، نورِ دل کا مٹ جانا، برائی کی طرف راغب ہو جانا، نیکی سے متنفر ہو جانا، اللہ کی طرف سے لعنت کا اترنا، لوگوں کے دلوں میں بلاوجہ اس سے بڑی نفرت کا پیدا ہو جانا، وغیرہ وغیرہ۔

گناہ کا مفہوم:

شرعاً گناہ اسے کہتے ہیں کہ کسی واجب کو چھوڑا جائے یا کسی ممنوع کام کو کیا جائے۔ اگر کوئی شخص پھسل جائے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے، تو یہ شرعاً گناہ نہیں، لیکن گرنے اور چوٹ لگنے کی وجہ سے مادی نتائج سے نہیں بچ سکا۔ پھر شرعی گناہ کی بعض صورتوں میں اس کا ایک مادی اثر بھی ہوتا ہے۔

گناہ کے اثرات کا علاج:

پھر مادی اثر کے ازالہ کیلئے مادی علاج بھی کرنا پڑتا ہے اور شرعی اثر کے ازالہ کیلئے شریعت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان سے غلطی ہوتی ہے، تو اس کے علاج کیلئے شرعاً اور طبعاً پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے، جس سے وہ بیمار ہوا ہے۔ پھر اس بیماری کے ازالہ کے اسباب ڈھونڈے، مثلاً

اگر کسی شخص کو حرام کاری سے سوزاک ہو گیا ہے، تو پہلے اس کیلئے لازم ہے کہ آئندہ ایسی حرام کاری سے بچے۔ پھر سوزاک کے علاج میں ان ادویہ کو استعمال کرے، جن سے سوزاک رفع ہوتا ہے۔ صرف مخصوص حرام کاری سے بچنا ہی کافی نہیں۔ یہاں تلافی مافات سے کام نہیں چلتا۔

اگر کوئی شخص اپنے والد کو مار ڈالے، جس کی وجہ سے وہ طبعی طور پر باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا، تو اس وقت تلافی مافات کی کیا صورت ہو گی؟ کیا اس کا آئندہ کسی کو قتل نہ کرنا، اس کے باپ کو واپس لا سکتا ہے؟ اگر کودنے سے کسی کی ٹانگ ٹوٹ جائے، تو تلافی مافات کی کیا صورت ہے۔ صرف آئندہ کودنے سے پرہیز کرنا، اس کی ٹانگ کو درست کر سکتا ہے؟ اس کیلئے الگ علاج کی الگ ضرورت ہے۔

حقوق کی اقسام:

حقوق دو قسم کے ہیں: ایک حقوق العباد اور دوسرے حقوق اللہ۔

حقوق العباد کی تلافی کی شرعی صورت یہی ہے کہ ان کو ادا کرے یا معاف کرائے۔

اور حقوق اللہ میں توبہ سے معافی ہو جاتی ہے۔

گناہ کی اقسام:

اور گناہ بھی دو قسم کے ہیں: صغیرہ اور کبیرہ۔

چھوٹے گناہ نیکیوں سے معاف ہو جاتے ہیں اور نیکیوں سے گناہوں کا دور ہونا اسی طرح ہے جس طرح ادویہ سے بیماری زائل ہو جاتی ہے۔ حدیث میں جو یہ وارد ہے کہ دو رکعتوں سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، ان سے مراد چھوٹے گناہ ہیں نہ کہ بڑے، جیسے احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ پھر چھوٹے گناہ اس وقت معاف

ہوتے ہیں، جب بڑے گناہ نہ ہوں۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ [1]

مغفرت کے طریقے:

مندرجہ ذیل آیات میں اپنے خیال کے فطری طریقے گناہ کے دور ہونے کے بتائیے:

① ﴿إن الحسنات يذهبن السيئات﴾ [2]

”نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“

② ﴿إن تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خيرلكم ويكفر عنكم من سيئاتكم﴾ [3]

”اگر تم صدقہ چھپا کر فقراء کو دو، تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور تمہاری برائیاں اس سے دور ہوں گی۔“

③ قتل خطا میں دو ماہ کا روزہ بتایا، پھر کہا:

---

[1] قرآن مجید میں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ اگر کبائر سے اجتناب کیا جائے، تو صغیرہ گناہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے معاف کردیتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ...... ﴾(النجم: ۳۲)
نیز فرمایا:﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ...... ﴾ (النساء: ۳۱)
اسی طرح کئی احادیث میں بھی اس بات کی صراحت موجود ہے کہ بعض اعمال کے نتائج میں جو گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے، وہ اسی صورت میں ہے کہ کبیرہ گناہوں سے احتراز کیا جائے، محض ان اعمال کے کرنے سے کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔ دیکھیں: صحيح مسلم: كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء والصلاة عقبه، رقم الحديث(۲۲۸)، و باب الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة، و رمضان إلى رمضان مكفرات لما بينهن ما اجتنبت الكبائر۔

[2] هود: ۱۱٤

[3] البقرة: ۲۷۱

﴿توبة من الله﴾ ❶

''اس سے تمہاری توبہ قبول کرے گا۔''

④ قسم کا کفارہ غلام آزاد کرنا، کھانا کھلانا یا کپڑا پہنانا ہے۔ اگر طاقت نہ ہو، تو روزہ رکھنا۔ ❷

⑤ احرام میں شکار کے عوض قربانی کرنا، یا روزے رکھنا، یا کھانا کھلانا۔ ❸

⑥ ظہار میں غلام آزاد کرنا، کھانا کھلانا، روزے رکھنا۔ ❹

⑦ ﴿إن تجتنبوا كبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سيئاتكم﴾ ❺

''اگر تم کبائر سے بچو گے، تو ہم تمہاری برائیاں دور کر دیں گے۔''

⑧ ﴿إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك﴾ ❻

''اللہ شرک معاف نہیں کرتا، شرک کے سوا جسے چاہے معاف فرما دے۔''

آپ کے نزدیک تو یہ سب غیر فطری طریقے ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہاں فطری طریقہ صرف یہ ہے کہ جس امر کے چھوڑنے پر اس کو سزا ملی، اس کو کرے۔ اگر کسی کے کرنے سے سزا ملی ہے، تو اس کو نہ صرف چھوڑے، بلکہ علاج بھی کرائے۔ یہاں قرآن میں نیک اعمال کو ہی بار بار کفارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ قتل، زنا، چوری وغیرہ کبائر گناہ وضو اور نماز سے معاف نہیں ہوتے۔ اس کی صراحت احادیث میں موجود

---

❶ النساء:٩٢

❷ دیکھیں: المائدة:٨٩

❸ دیکھیں: المائدة:٩٥

❹ دیکھیں: المجادلة:٣-٤

❺ النساء:٣١

❻ النساء:١١٦

ہے، [1] کم از کم "مشکوٰۃ" ہی دیکھ لو!!

توجیہ:

بعض علماء نے ان ادلہ کی جو "مکفر سیئات" کے بارہ میں وارد ہیں، ایسی توجیہ کی ہے، جو مادی امور سے زیادہ موزوں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روزے سے وہ گناہ دور ہوتے ہیں، جن کا اثر اس اثر کے منافی ہے، جو روزے سے پیدا ہوتا ہے، یعنی جن گناہوں کا تعلق شہوت بطن اور فرج سے ہے، روزہ ان کا کفارہ ہوگا، کیونکہ روزہ رکھنے اور نفس پر کنٹرول کرنے سے گناہ کا میلان کم ہو جائے گا۔ اور نماز پڑھنے سے وہ گناہ دور ہوں گے، جو اللہ کی رضا کے منافی ہیں۔ وقس علیٰ ھذا!

[1] دیکھیں: صحیح مسلم: کتاب الطھارۃ ، باب فضل الوضوء والصّلاۃ عقبہ، رقم الحدیث(۲۲۸)، و باب الصلوات الخمس والجمعۃ إلی الجمعۃ ورمضان إلی رمضان مکفرات لما بینھن ما اجتنبت الکبائر۔

چودھواں باب

شفاعت

اعتراض:

''قرآن کریم میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ آنحضرت ﷺ محشر میں سفارش کریں گے، البتہ دنیا میں استغفار کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تلافی مافات کیلئے کمر بستہ ہو جائیں اور حضور ان کی رہبری فرمائیں، تو ان کے پچھلے گناہ چھپ جائیں گے۔

اس مضمون کے علاوہ قرآن میں شفاعت کا اور کوئی تخیل موجود نہیں، بلکہ عدمِ شفاعت کا ذکر ہے:

﴿ولا يقبل منها شفاعة﴾ ❶

''نہ اس سے شفاعت قبول ہوگی۔''

آنحضرت نے اپنی لڑکی کو فرمایا:

"لا أغني عنك من الله شيئا" ❷

''میں اللہ کے دربار میں تمہاری کوئی مدد نہ کرسکوں گا۔''

اب ذرا محدثین کا نقطۂ نگاہ ملاحظہ کیجئے:

---

❶ البقرة:٤٨

❷ صحيح البخاري: كتاب الوصايا، باب هل يدخل النساء والولد في الأقارب، رقم الحديث(٢٦٠٢)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب في قوله﴿ وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ رقم الحديث(٢٠٤)

ابوہریرۃ کی حدیث میں شفاعت کا ذکر ہے۔ ❶ مگر اس حدیث میں یوسف علیہ السلام کے پاس جانے کا ذکر نہیں، حالانکہ ان کے متعلق آنحضرت کی شہادت ہے کہ وہ سب سے زیادہ کریم ہیں۔ ❷ یعنی "أکرم الناس" ہیں۔ اگر کسی طالبعلم کو معلوم ہو جائے کہ وہ محنت نہ کرے گا، تب بھی پاس ہو جائے گا، تو یقیناً محنت چھوڑ دیگا۔ احادیث شفاعت میں اس قسم کا وعدہ آنحضرت سے بھی کیا جا چکا ہے:

"إنا سنرضيك في أمتك ولا نسوءك" ❸

''ہم تجھے تیری امت میں راضی کریں گے اور مغموم نہ ہونے دینگے۔''

(دو اسلام)

جواب:

زندوں کیلئے استغفار ہے اور مردوں کیلئے دعا، منافقوں اور مشرکوں کے لیے البتہ ممانعت ہے:

﴿ولا تصل على أحد منهم مات أبداً﴾ ❹

---

❶ صحيح البخاري: كتاب التفسير، باب ﴿ ذرية من حملنا مع نوح إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ رقم الحديث(٤٤٣٥)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب أدنىٰ أهل الجنة منزلة فيها، رقم الحديث(١٩٤)

❷ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى﴿ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴾ رقم الحديث(٣١٧٥)، صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب من فضائل يوسف عليه السلام، رقم الحديث(٢٣٧٨)

❸ صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب دعاء النبي ﷺ لأمته و بكائه شفقة عليهم، رقم الحديث(٢٠٢)

❹ التوبة: ٨٤

"اگر کوئی منافق مرجائے، تو اس کے لیے دعا نہ کر۔"

﴿ ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان﴾ ❶

"اے ہمارے رب! ہم کو بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان میں سبقت کر چکے ہیں۔"

جب مردے کیلئے دعا اور استغفار ثابت ہے، تو غور کرنے کے بعد یہی شفاعت کی حقیقت ہے، اور آیت ﴿ ما للظالمين من حميم ولا شفيع﴾ ❷ (ظالموں یعنی مشرکوں کیلئے کوئی غمخوار نہیں اور شفیع نہیں) بھی اپنے اسلوب سے بتا رہی ہے کہ غیر ظالموں (غیر مشرکوں) کی شفاعت ہوگی۔

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿فما تنفعهم شفاعة الشافعين﴾ ❸

"ان فرقوں کو شافعین کی شفاعت کا نفع نہ ہوگا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چار فرقوں کے علاوہ باقی کو شفاعت نفع دیگی۔ نفی شفاعت کی آیتوں میں مشرکین کا ذکر ہے یا کافروں کا۔ اور مغفرت کے مفید ہونے کا جہاں ذکر ہے، اس سے مراد موحد مسلمان ہیں۔

شفاعت کی حقیقت:

باقی یہ کہ یوسف علیہ السلام کا اس حدیث میں ذکر نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محشر کے دن کے تمام امور کا یہاں بیان نہیں کیا۔ صرف جو آپ کو بذریعہ کشف دکھائی دیئے، وہ بتائے۔ (مسند أحمد)

---

❶ الحشر: ١٠

❷ غافر: ١٨

❸ المدثر: ٤٨

باقی رہی یہ بات کہ شفاعت سے لوگ گناہ پر دلیر ہو جائیں گے، غلط ہے۔ کیونکہ شفاعت بے نماز کی نہیں ہوگی، بلکہ نمازی کی ہوگی۔ پھر شفاعت مذکور اس وقت شروع ہوگی، جب گناہگار جہنم میں جا چکے ہوں گے۔ پھر سب کے سب ایک ہی بار نہیں نکالے جائیں گے، بلکہ متعدد دفعہ میں نکالے جائیں گے۔ کوئی پہلے اور کوئی پیچھے، اس کی یہی وجہ ہوگی کہ گناہ کے مراتب مختلف ہوں گے، پس جو لوگ سب سے پہلے نکالے جائیں گے، باوجود نمازی، روزہ دار اور حاجی ہونے کے بعض کبائر کی بناء پر اتنی دیر جہنم میں رہیں گے۔ اس سے پہلے میدان محشر میں اور اس سے پہلے عالم برزخ میں سزا اٹھا چکے ہونگے۔ شفاعت کے باوجود اگر گناہگار کو اتنی سزا کا ڈر ہو، تو کب گناہ پر دلیر ہوسکتا ہے؟

اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے، تو حقیقت میں شفاعت آنحضرت ﷺ کی اتباع کی صورت ہے، یعنی گناہ کی سزا دو قسم کی ہے۔ ایک اس گناہ کی حقیقت اور مرتبہ کے لحاظ سے۔ اور ایک اس لحاظ سے کہ وہ متبع ہے۔ ظاہر ہے کہ متبع اور مجرم برابر نہیں ہو سکتے۔ متبع کی سزا میں تخفیف ہونی چاہیے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک گناہ کی سزا فی نفسہٖ ایک سال ہے، مگر متبع ہونے کی بناء پر اس کی سزا ایک ماہ ہے۔ پس گیارہ ماہ جو سزا میں تخفیف ہے وہ اتباع کی وجہ سے ہے۔ یہ اتباع چونکہ آنحضرت ﷺ کی ہے۔ اس واسطے یہ تخفیف قیامت کے دن شفاعت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جس سے آنحضرت ﷺ کی قدر و منزلت کا اظہار بھی ہوگا اور آپ ﷺ کی اتباع کی افادیت کا بھی!

پندرھواں باب

’’قرآن سے متصادم احادیث‘‘

’’قرآن میں ہے: ﴿لا إكراه في الدين﴾ ❶ (دین میں کوئی جبر نہیں) ایک حاکم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی قلمرو میں امن قائم کرنے کے لئے جرائم کا استیصال کرے۔ اس کیلئے تلوار استعمال کرے۔ اس نازک فرض کو سمجھنے کیلئے یہ آیت پڑھیے:

﴿وقاتلوهم حتىٰ لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله﴾ ❷

’’تم کفار سے اس وقت تک لڑو، جب تک بدامنی ختم نہ ہو جائے، اور تمہارا قانون قلمرو میں نافذ نہ ہو جائے۔‘‘

دین کے دو معنی ہیں:

☆ **اول**: ضابطۂ اسلامی۔

☆ **دوم**: اس ضابطہ کا وہ حصہ جس کا نفاذ قیامِ امن کیلئے قلمرو میں ضروری ہے۔

پہلی حدیث:

اب یہ حدیث ملاحظہ ہو:

((أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة فإذا فعلوا

❶ البقرة:٢٥٦

❷ الأنفال:٣٩

ذلك عصموا مني دماء هم و أموالهم إلا بحق الإسلام وحسابهم على الله)) ❶

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ خدا کو ایک جان کر میری رسالت کا اقرار نہ کریں اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند نہ ہو جائیں۔ اگر وہ ان باتوں کو مان لیں، تو پھر میں ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ ہاں جان و مال میں اللہ کے حقوق کسی طرح ساقط نہیں ہوں گے۔''

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے:

اول: قرآن حکیم نے بدامنی کو روکنے اور مظالم کے انسداد کیلئے جہاد کا حکم دیا ہے، نہ کہ قرآن کی تعلیم زبردستی منوانے کیلئے۔ لیکن اگر مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کوئی پیدا ہو جائے تو جنگ ختم کر دو:

اول: جب بدامنی اور فتنہ ختم ہو جائے۔

دوم: جب دشمن سے صلح ہو جائے:

﴿وإن جنحوا للسلم فاجنح لها......﴾ ❷

''اگر وہ صلح چاہیں تو ان سے صلح کر لو۔''

سوم: جب وہ جزیہ دینے پر راضی ہو جائے:

﴿حتىٰ يعطو الجزية......﴾ ❸

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الإيمان، باب ﴿فَإِنْ تَابُوْا وَ أَقَامُوا الصَّلَاةَ......﴾ رقم الحديث(٢٥) صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله، رقم الحديث(٢٢)

❷ الأنفال:٦١

❸ التوبة:٢٩

''یہاں تک کہ جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جائیں۔''

چہارم: جب وہ اسلام قبول کرے:

﴿فإن تابوا وأقاموا الصلوٰة وآتوا الزكوٰة فخلوا سبيلهم﴾ ❶

''یعنی وہ توبہ کرنے کے بعد اگر صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں، تو پھر ان کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔''

سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں مشرکین سے اعلان جنگ کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ یہ کہ انہوں نے تمام معاہدات توڑ دیئے:

﴿ألا تقاتلون قوما نكثوا أيمانهم﴾ ❷

''تم ان مشرکوں سے کیوں نہیں جنگ کرتے، جنہوں نے سارے معاہدات توڑ ڈالے!''

نیز ان کے متعلق کہا گیا ہے:

﴿فَأَتِمُّوا إِليهم عهدهم﴾ ❸

''تم بھی ان معاہدوں کو پورا کرو۔''

اور ساتھ ہی یہ رعایت دی گئی کہ اگر کوئی مشرک تمہارے ہاں پناہ لینے کے لیے کہے، تو انکار نہ کرو۔ چونکہ یہ حدیث لوگوں کو بہ جبر مسلمان بنانے کیلئے جہاد کا حکم دیتی ہے اور قرآن کی تعلیم سے متصادم ہوتی ہے، اس لئے اس کی صحت مشتبہ ہے۔'' (دو اسلام : ٢٩٤)

---

❶ التوبة: ٥

❷ التوبة: ١٣

❸ التوبة: ٤

جواب:

سورۂ توبہ کی آیت اور حدیث دونوں کے الفاظ ملتے جلتے ہیں۔ آیت میں بھی غایتِ قتال تین چیزیں ذکر کی ہیں۔ توبہ (یعنی توحید اور رسالت کی شہادت) اور پابندی صوم وصلوٰۃ ...... حدیث میں بھی یہی تین چیزیں ہیں۔ توحید و رسالت کا اقرار اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پابندی۔ اگر سورہ توبہ میں مراد خاص مشرکین ہیں، تو حدیث میں بھی ''الناس'' سے مراد وہی گروہ ہے۔ کیونکہ ''الف لام'' عہد کا ہے۔ اس جواب سے دوسرا اعتراض بھی اٹھ گیا۔

اعتراض:

دوم: آنحضرت ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہل بحرین کی طرف جزیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا، ❶ حالانکہ وہ لوگ غیر مسلم تھے اور اس حدیث کی رو سے ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تھا۔''

جواب:

لیکن چونکہ ''الف لام'' عہد کا ہے، لہٰذا اہل جزیہ اس سے خارج ہیں۔ اس طرح تیسرا اعتراض بھی اٹھ گیا۔

اعتراض:

سوم: حضور علیہ السلام نے جنگ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

---

❶ صحيح البخاري: أبواب الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب، رقم الحديث (٢٩٨٨)، صحيح مسلم: كتاب الزهد والرقائق، رقم الحديث (٢٩٦١)، اس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو بحرین کی طرف جزیہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ واللہ اعلم

((ثم ادعهم إلى الإسلام ...... لأن يهدى بك رجل واحد خير لك من حمر النعم)) ❶

''پھر تم انہیں اسلام کی طرف دعوت دو اور یاد رکھو، ایک انسان کا ہدایت پا جانا بھی تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔''

یہ نہیں فرمایا کہ غیر مسلم کو قتل کر ڈالو (جب تک مسلمان نہ ہو جائے، جنگ جاری رکھو)

جواب:

اس لئے حدیث خاص ہے۔ اس طرح چوتھا اعتراض بھی اٹھ گیا۔

اعتراض:

چہارم: ''مؤطا'' میں مذکور ہے: ایک اعرابی نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر کہنے لگا: میں بیعت کو توڑتا ہوں، تین مرتبہ یہی بات دوہرائی۔ لیکن آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے، جہاں دھات باقی رہ جاتی ہے اور کثافت نکل جاتی ہے۔'' ❷

جواب:

کیونکہ یہ اعرابی مرتد نہیں ہوا، بلکہ ہجرت کو چھوڑ گیا اور بیعت کی واپسی

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام...... رقم الحديث (٢٧٨٣)، صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب، رقم الحديث (٢٤٠٦)

❷ صحيح البخاري: كتاب الأحكام، باب بيعة الأعراب، رقم الحديث (٦٧٨٣)، صحيح مسلم: كتاب الحج، باب المدينة تنفي خبثها، رقم الحديث (١٣٨٣)، الموطا: ٢/٨٨٦

سے بھی اس کی غرض ہجرت پر بیعت مراد تھی، نہ اسلام پر۔ لہٰذا اعتراض باطل ہے۔

پس اس پر جو متفرع ہے کہ یہ حدیث "من بدل دینه فاقتلوه" [1] (جو شخص اسلام چھوڑ دے اسے مار ڈالو) موضوع ہے۔" باطل ہوا!

اس مسئلہ پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري : كتاب الجهاد والسير، باب لا يعذب بعذاب الله، رقم الحديث (٢٨٥٤)

سترھواں باب

تقدیر

اس کا خلاصہ یہ ہے:

"تقدیر کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو ایک خاص نظام میں مربوط کر دیا ہے۔ علت و معلول، سبب و مسبب کا سلسلہ بنا دیا ہے۔ ہر زمانے میں کاہلی کا نتیجہ ناکامی، محنت کا کامیابی، بداعمالی کا رسوائی، جہالت کا ذلت، علم کا عزت، عبادت کا پاکیزگی اور بلند کردار کا رفعت رہا ہے۔ یہ نتائج کسی قوم، کسی عقیدے، کسی دعا، کسی منتر، کسی چلّے، یا کسی عبادت کی وجہ سے نہ آج تک بدلے اور نہ آئندہ بدلیں گے۔ انسان اعمال کے انتخاب میں آزاد ہے۔ وہ چاہے تو شریف بنے یا شریر، محنتی یا کاہل۔ لیکن نتائج بھگتنے پر مجبور ہے۔ یہی تقدیر ہے اور اسی کا نام قضائے الٰہی ہے۔

کافر ہے تو تقدیر پر کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو آپ ہے تقدیرِ الٰہی!

یہ تھا تقدیر کا قرآنی تخیل۔ اب ذرا حدیثی تخیل ملاحظہ ہو:

حضور فرماتے ہیں کہ نطفہ رحم میں پہنچ کر چالیس دن کے بعد منجمد سا خون بن جاتا ہے، پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اور اس لوتھڑے کے اعمال زندگی، رزق، موت اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ ابھی لکھ لو۔ اور اس کے بعد اس

میں روح پھونکی جاتی ہے۔ ❶

اگر یہ فیصلہ پہلے ہی لکھ لیا جاتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے اتنے پیامبر کیوں بھیجے، بیشمار اقوام کو غرق کیوں کیا اور چور کے ہاتھ کیوں کاٹے؟

آج ساری دنیائے اسلام حدیثی تقدیر کے مہلک تصور میں گرفتار ہے۔ ہر جگہ پٹ رہی ہے اور پھر بھی اس دھن میں مست ہے کہ اللہ کی مرضی میں کیا کرسکتا ہوں'' (دو اسلام)

جواب: تقدیر کی حقیقت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تقدیر سے جبر لازم نہیں آتا۔ کیونکہ تقدیر حقیقت میں سلسلہ علت و معلول اور سبب و مسبب کے مجموعہ کا نام ہے۔ پھر اس کے علم کا جو باری تعالیٰ کو حاصل ہے، پھر اس کی کتابت کا، پھر اس کی قدرت کی تاثیر کا۔ یعنی جہاں میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کیلئے ایک سبب موجود ہوتا ہے۔ جس کے پورا ہونے سے وہ شے وجود اختیار کرتی ہے۔ مثلاً انسان بیمار ہوتا ہے، تو بیماری (جو نظامِ جسم کے بگاڑ کا نام ہے) کسی سبب سے ہوتی ہے۔ جب وہ سبب اپنے اس نصاب پر پہنچ جاتا ہے، نظام جسمانی میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو، تو بیماری نمودار ہو جاتی ہے۔ اور یہ سبب بھی دراصل کسی اور شے سے آموجود ہوتا ہے۔ پھر یہ شئے بھی کسی اور وجہ سے۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی میں جاتا ہے اور انسان جو کام کرتا ہے، پہلے اس کو اس کا علم ہوتا ہے۔ پھر شوق، پھر ارادہ۔ اور ارادہ سے عصبی اور عضلاتی تحریک سے اعضاء میں حرکت ہوتی ہے۔ پس یہ فعل ارادہ سے، ارادہ شوق سے، شوق علم سے، اور علم سننے، دیکھنے اور غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور شوق

---

❶ صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة، رقم الحديث(٣٠٣٦)، صحيح مسلم: كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه، رقم الحديث(٢٦٤٣)

کے پیدا کرنے میں کسی فعل کے منافع کے نصاب مخصوص کو دخل ہوتا ہے۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں معمولی منفعت سے شوق پیدا ہو جاتا ہے اور بعض معمولی منفعت سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی حال تمام اسباب کا ہے۔ یہ سلسلۂ اسباب اور ان کے نتائج اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔ اور اس نے اپنے اس علم کو غیب میں منضبط کر دیا ہے اور پھر اس کے سارے نظام کا ربط اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ اس ربط کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس سارے جہاں کے وجود اور تغیر میں دخل ہے اور اسی کا نام "تقدیر" ہے۔

انسان واقعی خود مختار ہے، چاہے مومن بنے، چاہے کافر بنے۔ تقدیر صرف نتائج کا نام نہیں، بلکہ اسباب اور نتائج کے مجموعہ کا نام ہے۔ حدیث میں جو ذکر ہوا ہے، وہ بھی تقدیر کا ایک حصہ ہی ہے، اگر ادویہ کے افعال وخواص کا ذکر ہے، تو وہ بھی تقدیر کا حصہ ہے۔ اگر انسانی مزاج کی بحث ہے، تو وہ بھی تقدیر کی بحث ہے۔ عناصر کے افعال وخواص بھی تقدیر کی بحث کا جزو ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو قبل از وقت جانتا ہے، یہ بھی تقدیر میں داخل ہے اور اللہ کے سہارے سارا جہاں قائم ہے۔ یہ بھی اسی تقدیر کا ایک شعبہ ہے۔ جب سارا جہاں اس کے سہارے قائم ہے، تو اس کی قدرت کو اس میں دخل ہے۔ تقدیر ایسی چیز نہیں، جس کے ماننے پر انسان اپنے آپ کو مجبور پائے، بلکہ یہ ایک علم کا نام ہے، جب ہم کھجور کی ایک گٹھلی کو دیکھتے ہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ گٹھلی اگر اس قسم کی زمین میں بوئی جائے، تو اتنے عرصہ میں اس میں فلاں فلاں تغیرات ہوں گے اور اتنی مدت کے بعد یہ پھل دے گی اور اس کا پھل میٹھا ہوگا یا کڑوا؟

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو!

اسی طرح نطفہ بھی گٹھلی کی طرح اپنے اندر وہ تمام امور لئے ہوتا ہے، جن کا

ظہور ان کے نشوونما میں اخیر تک ہوتا رہتا ہے۔ یعنی یہ نطفہ یہ تغیرات اختیار کریگا اور فلاں وقت باہر آئے گا، پھر اس کا نشوونما ❶ اس نہج پر ہوگا، بچپن میں اس کا رنگ، اس کی شکل اور اس کے جذبات اس قسم کے ہونگے۔ سخی ہوگا، یا کنجوس، دلیر ہوگا، یا بزدل وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا علم بہت وسیع ہے۔ اس کے علم میں تمام امور جزئیہ آجاتے ہیں۔ اگر فرشتہ اللہ تعالیٰ کے علم سے اس نطفہ کی حالت میں مدد لے، تو سب کچھ قبل از وقت معلوم کر سکتا ہے۔ مگر باوجود اس کے انسان مجبور نہیں ہوتا، کیونکہ علم معلوم کے تابع ہوتا ہے، اس کے لئے علت وسبب نہیں ہوتا۔ پس سلسلہ اسباب اپنی جگہ جیسے پہلے تھا، ویسے اب ہے۔ جیسے پہلے انسان مختار تھا، ویسے اب بھی مختار ہے۔ جو چاہے کرے، حدیث انسان کو سُست نہیں کرتی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعض لوگ جہالت کی بناء پر سُست ہو جاتے ہیں۔ اگر حقیقت حال کو دیکھیں، تو دلیر ہو جائیں۔ کیونکہ تقدیر سے قرآن نے یہ سبق دیا ہے کہ مصیبت اور موت سے انسان کو مفر نہیں۔ اس واسطے مصیبت اور موت کے اندیشہ سے اپنی کوشش ترک نہیں کرنی چاہئے۔ فرمایا:

﴿ما أصاب من مصيبة في الأرض ولا في أنفسكم إلا في كتاب من قبل أن نبرأها إن ذلك على الله يسير ○ لكيلا تأسوا على مافاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم﴾ ❷

”جو مصیبت زمین میں یا تمہاری جان میں آئے، تو ہم نے اس کو اس

---

❶ آج جنیاتی سائنس نے یہ حقیقت دریافت کر لی ہے کہ ایک انسان کا Genetic code (جنیاتی رمز) مختلف ہوتا ہے جس پر اس کی خصوصیات درج ہوتی ہیں اور اس کے مطابق اس کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے جس کے لیے DNA ٹیسٹ کروایا جاتا ہ (اگر یہ اضافہ مناسب سمجھیں تو لگالیں؟)

❷ الحدید: ۲۲-۲۳

کے ہونے سے پہلے لکھ دیا ہے اور یہ اللہ پر کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ اس لئے کہ تم سے کوئی شے فوت ہو جائے، تو غم نہ کرو اور اگر کچھ مل جائے، تو زیادہ خوش نہ ہو جاؤ۔"

اٹھارہواں باب

متضاد احادیث

اس باب میں بخاری کی ایک حدیث لکھی ہے، جس سے عورت کے مرتبہ پر استدلال کیا ہے۔ مگر افسوس کہ ترجمہ پر نظر ثانی نہیں کی۔

پہلی حدیث:

چنانچہ لکھتے ہیں:

''آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوران تقریر فرمایا کہ جو تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے نارِ جہنم سے بچا لے گا۔ ایک عورت نے کہا: دو بچوں والی؟ فرمایا: دو والی بھی جنت میں جائے گی۔ (بخاری: ۱/۲۰) [1]

بالکل درست فرمایا تھا حضور نے، سارا قرآن شاہد ہے کہ انسانی خدمت بہت بڑے اجر کی مستحق ہے۔ تو کیا بچوں کی تولید و تربیت انسانی خدمت نہیں؟ (دواسلام: ۳۰۵)

جواب:

اس حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ '' جو عورت تین بچے اگلے جہاں میں بھیج چکی

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم، رقم الحديث (١٠١)، صحيح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل من يموت له ولد فيحتسبه ، رقم الحديث (٢٦٣٣) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "ما منكن امرأة تقدم ثلاثة من ولدها إلا كان لها حجابا من النار......" برق صاحب نے اس حدیث کا ترجمہ غلط کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کو حدیث میں تعارض محسوس ہو رہا ہے، مؤلف رحمہ اللہ نے اس کی تفصیل آگے بیان کردی ہے۔

ہو، یعنی مر گئے، تو وہ بچے اس کیلئے جہنم سے حجاب بن جائیں گے۔" چنانچہ یہی روایت (۱/۱۶۷) میں ہے۔جس کے لفظ یہ ہیں:

((أيما أمرأة مات لها ثلاثة من الولد كانوا لها حجابا من النار)) ❶

"جس عورت کے تین بچے مر جائیں، تو وہ اس کیلئے آگ سے حجاب ہو جاتے ہیں۔"

مگر مصنف نے تولید کے معنی سمجھ لئے ہیں اور اس سے عورت اور ماں کی فضیلت تولید کے اعتبار سے سمجھی ہے!

دوسری حدیث:

پھر اس کے بعد یہ حدیث ذکر کی ہے:

((الجنة تحت أقدام أمهاتكم)) ❷

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب فضل من مات له ولد فاحتسب ، رقم الحديث(۱۱۹۲)، اس سے ما قبل حدیث کے الفاظ یہ ہیں.....يتوفى له ثلاث لم يبلغوا الحنث......" جو صراحتا دلالت کرتے ہیں کہ عورت کی یہ فضیلت اس کے نابالغ بچوں کی وفات کی وجہ سے ہے، نہ کہ ان بچوں کی پیدائش کی وجہ سے!

❷ ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ دیکھیں:الكامل لابن عدي ۳۴۷/۶ (۱۸۲۹)، المقاصد الحسنة:۲۸۷، كشف الخفاء:۶۱/۲ (۷۸-۱)، السلسلة الضعيفة:۵۹/۲ (۵۹۳) لیکن انہی معنوں میں رسول اکرم ﷺ سے یہ حدیث ثابت ہے، دیکھیں: سنن النسائي: كتاب الجهاد، باب الرخصة في التخلف لمن له والدة ، رقم الحديث (۳۱۰۴)، سنن ابن ماجه : كتاب الجهاد، باب الرجل يغزو وله أبوان ، رقم الحديث (۲۷۸۱)، مسند أحمد:۴۲۹/۳، المستدرك:۱۱۴/۲، سنن البيهقي: ۲۶/۹، شعب الإيمان:۱۷۸/۶، المعجم الكبير:۲۸۹/۲، الجامع للخطيب: ۲۳۱/۲، الأحاد والمثاني(۵۸/۳)

”جنت تمہاری ماؤں کے پاؤں تلے ہے۔“

اس کے بعد ایک اور حدیث لکھی ہے، جو ان کے خیال میں پہلی حدیث کے متعارض ہے، وہ حدیث یہ ہے:

((أريت النار فإذا أكثر أهلها النساء)) ❶

”آنحضرت فرماتے ہیں کہ میں نے جہنم کو دیکھا، تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی۔“

یعنی ایک طرف تو دو بچوں والی ماؤں کو جنتی بنایا جا رہا ہے، بلکہ ساری جنت ماں کے قدموں میں پھینکی جا رہی ہے اور دوسری طرف اس کے جہنمی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ (دو اسلام: ۳۰۸)

جواب:

ماں کی خدمت میں بچے کو جنت ملتی ہے۔ اگر ماں کے عمل اچھے نہ ہوں، تو اس صورت میں ماں جنت میں نہیں جا سکتی۔ اور اگر کسی مسلمان عورت کے تین یا دو بچے مر جائیں اور وہ صبر کرے، تو جنتی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو عورت بدزبان اور خاوند کی نافرمان ہو، وہ بھی جنت میں چلی جائے!

جس صورت میں یہ ذکر کیا ہے کہ میں نے آگ میں عورتوں کو زیادہ دیکھا ہے، اس میں اس کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ اسکی وجہ خاوند کی ناشکری اور بدزبانی ہے۔ جو عورت صابرہ ہو گی، لامحالہ وہ بدزبان نہیں ہو سکتی، نہ خاوند کی نافرمان ہو سکتی ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمیشہ جہنم میں اکثر عورتیں ہی ہونگی۔ بلکہ یہ آپ ﷺ نے اپنا کشف بتایا کہ مجھے ایسا نظر آیا اور اس کی وجہ بھی بتائی، یعنی یہ

❶ صحيح البخاري: كتاب الإيمان، باب كفران العشير و كفر دون كفر، رقم الحديث (۲۹)، صحيح مسلم: كتاب العيدين، رقم الحديث (۸۸٤)

بات ان کیلئے جہنم کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر دوسرے اسباب اس کے خلاف جمع ہو جائیں، تو جنت میں جا سکتی ہیں، بلکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں سے عورتیں دوگنی جنت میں ہوں گی۔

آگے ایک حدیث ذکر کی ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ

''اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ انکار کر دے اور شوہر ناراض ہو کر رات گذارے، تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔'' [1]

اس حدیث کے بعد فضول باتیں لکھی ہیں، لب ولہجہ، طرز کلام، بالکل سوقیانہ ہو گیا ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے:

﴿فالصالحات قنتت......﴾ [2]

''نیک بیبیاں وہ ہیں، جو خاوند کی فرمانبردار ہوں۔''

﴿الرجال قوامون على النساء﴾ [3]

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔''

حاکم یا امیر کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

تیسری حدیث:

اس کے بعد دو متعارض حدیثیں لکھی ہیں:

---

[1] صحیح البخاري: کتاب بدء الخلق، باب إذا قال أحدکم آمین...... ،رقم الحدیث (٣٠٦٥)، صحیح مسلم : کتاب النکاح، باب تحریم امتناعها من فراش زوجها،رقم الحدیث(١٤٣٦)

[2] النساء:٣٤

[3] مصدر سابق

درخت کاٹنا:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یزید بن ابو سفیان کو ایک فوج کا سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا، تو ساتھ مندرجہ ذیل ہدایات بھی دیں: کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کوئی پھل والا درخت نہ کاٹنا[1] لیکن بخاری میں مذکور ہے کہ حضور نے بنی نضیر کے کچھ درخت جلا دیئے اور کچھ کاٹ کر رکھ دیئے۔(بخاري: ۳۱/۲)[2] اگر حضور نے ایسا کیا ہوتا، تو حضرت صدیق آپ کی سنت کو ضرور زندہ رکھتے۔ (دو اسلام: ۳۱۱)

جواب:

ضرورت کے وقت درختوں میں دشمن پناہ لیں، تو ایسی حالت میں درختوں کا کاٹنا جائز ہے، ویسے منع ہے۔ یہ حکم قرآن مجید میں ہے:

﴿ما قطعتم من لينة أو تركتموها قائمة على أصولها فبإذن الله وليخزي الفاسقين﴾[3]

"اگر (مصلحت سمجھ کر) تم کوئی درخت کاٹو یا اس کو اسی طرح جڑوں پر کھڑا رہنے دو (اگر مناسب ہو) تو اس میں اللہ کی اجازت ہے اور فاسقوں کی رسوائی ہے۔"

اعتراض کرتے وقت قرآن بھی نہیں دیکھتے، یا جانتے ہی نہیں!

---

[1] الموطا: ۲/۴۴۷(۹۶۵)، سنن البيهقي: ۹/۸۹۔۹۰

[2] صحيح البخاري: كتاب المزارعة، باب قطع الشجر والنخل، رقم الحديث (۲۲۰۱)، صحيح مسلم: كتاب الجهاد، باب جواز قطع أشجار الكفار و تحريقها، رقم الحديث(۱۷۴۶)۔

[3] الحشر: ۴

چوتھی حدیث: آگ سے عذاب دینا:

''ایک حدیث میں آگ کے عذاب کی ممانعت ہے اور اس کی وجہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ ''آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے'' (بخاري) ❶

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب ایک جماعت مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کی اونٹنیوں کو چرا کر لے گئے اور چرواہے کو قتل کر گئے، تو آپ نے انہیں مندرجہ ذیل سزائیں دیں:

1. پہلے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔
2. پھر لوہے کی سلائیں گرم کر کے ان کی آنکھوں میں پھیریں۔
3. اس کے بعد گرم ریت پر پھینک دیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر پانی مانگتے رہے، لیکن کسی نے نہ دیا اور ہلاک ہو گئے۔ ❷ یہ بے رحمی رحمۃ للعالمین کی شان سے بعید ہے۔ ہاں باغیوں کے لئے چار سزائیں ہیں، قتل کر دیئے جائیں، یا سولی دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ دیا جائے یا جلا وطن کر دیئے جائیں، لیکن ان چار سزاؤں میں سے صرف ایک کی اجازت ہے۔ اللہ کا ارشاد واضح ہے کہ یا یہ سزا دو اور یا وہ۔ خود حضور ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ ''آگ سے عذاب صرف اللہ کا کام ہے۔'' (دو اسلام: ۳۱۳)

الجواب:

جس وقت یہ لوگ پکڑ کر لائے گئے، یہ آیت نہیں اتری تھی۔ پھر آیت میں

❶ صحيح البخاري : كتاب الجهاد والسير، باب التواديع، رقم الحديث(٢٧٩٥)

❷ صحيح البخاري : كتاب الوضوء، باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، رقم الحديث (٢٣١)،صحيح مسلم: كتاب القسامة، باب حكم المحاربين والمرتدين، رقم الحديث(١٦٧١)

''أو'' کا لفظ ہے، ❶ جس کا معنی ''اختیار'' کا ہے اور یہ لفظ کبھی ایسی جگہ بھی بولا جاتا ہے، جہاں دونوں کام جائز ہوتے ہیں اور ایک پر اکتفا بھی جائز ہوتا ہے:

﴿هل ينظرون إلا أن تأتيهم الملئكة أو يأتي ربك أو يأتي بعض آيات ربك﴾ ❷

''یہ لوگ یا تو فرشتوں کی آمد کے منتظر ہیں یا تیرے رب کے آنے کے اور یا تیرے رب کے بعض نشانات کے انتظار میں ہیں۔''

اب ظاہر ہے کہ فرشتے، رب اور رب تعالیٰ بھی آ سکتے ہیں!

﴿لا تطع منهم آثما أو كفورا﴾ ❸

''نہ کہا مان گناہگار یا ناشکرے کا۔''

یعنی نہ اس کا اور نہ اس کا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا حکم نہ مانو اور دوسرے کا مان لو!

باقی رہا آگ کا عذاب، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے چرواہے کو اسی طرح مارا تھا ❹ لہٰذا بموجب نص قرآن:

---

❶ مندرجہ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے:﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تقطع أَيْدِيهِمْ وَ أَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفوا من الأرض ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (المائدة:٣٣)

❷ الأنعام:١٥٩

❸ الإنسان:٢٤

❹ صحيح مسلم: كتاب القسامة، باب حكم المحاربين والمرتدين، رقم الحديث (٤٣٦٠)، و لفظه: "إنما سمل النبي ﷺ أعين أولئك لأنهم سملوا أعين الرعاء" مزید برآں برق صاحب کی پیش کردہ پہلی حدیث میں آگ سے جلانے کی ممانعت ہے اور مذکورہ بالا حدیث میں تو صرف بطور قصاص آنکھوں میں گرم سلائی پھیرنے کا ذکر ہے، مزید برآں سعید بن میتب ←

﴿كتب عليكم القصاص في القتلىٰ﴾ ❶

مقتول کا بدلہ لینے میں تم پر مساوات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

آگ کا عذاب ابتداءً منع ہے۔ یہ نہیں کہ صورت قصاص میں بھی منع ہو۔ ❷

آج کل جنگ میں آتشیں اسلحہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق تو آتشیں اسلحہ سے بالکل لڑائی نہیں کرنی چاہیے، خواہ دشمن ابتداء بھی کرے!

پانچویں حدیث: کیا گھوڑا منحوس ہے؟

اس ضمن میں دو حدیثوں میں تعارض اس طرح بیان کیا ہے:

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت کا گھوڑا تھا، جس کا نام ''لحیف'' تھا۔ ❸

➜ کی ''مرسل'' روایت میں ہے کہ ان کو پیاس کی حالت میں پانی بھی اسی لیے فراہم نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ یہ بھی ان کے اسی فعل شنیع کا بدلہ تھا اور انھوں نے بھی چرواہوں کو پیاسا مارا تھا۔ دیکھیں: سنن النسائي (٤٠٣٦)

❶ البقرة: ١٧٨

❷ قرآن مجید کی آیات بینات اسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بدلے کی صورت میں مساوات بری چیز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُم...... ﴾ (البقرة: ١٩٤) نیز فرمایا: ﴿ اَلْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ...... ﴾ (المائدة: ٤٥) مزید برآں اللہ تعالیٰ نے یہ تاکیدی حکم بھی دیا کہ سزا کی تنفیذ میں تمہارے دلوں میں کسی قسم کی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہو، فرمایا: ﴿ وَ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...... ﴾ (النور: ٢) یعنی زانی مرد اور عورت پر سزا نافذ کرتے وقت تم کو ان دونوں پر کسی قسم کا رحم نہیں آنا چاہیے، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ لہٰذا بقیہ انسانوں کے ساتھ رحم و عدل کا تقاضا یہی ہے کہ مجرم کو سزا کے وقت کسی قسم کی ڈھیل نہ دی جائے، کیونکہ اس طرح بقیہ افراد کو معاشرے میں ظلم و ستم ڈھانے کی شہ ملتی ہے۔

❸ صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب اسم الفرس والحمار، رقم الحديث (٢٧٠٠)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا منحوس نہیں ہوتا، اگر منحوس ہوتا، تو یہ نام نہ رکھتے۔

دوسری حدیث میں ہے: تین چیزیں منحوس ہیں: گھوڑا، عورت، مکان۔ ❷

جواب:

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تمام گھوڑے منحوس ہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ نحوست ان چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ نہ سب عورتیں اور نہ سب مکان۔ ہاں ان میں سے بعض منحوس ہوتے ہیں۔ پھر منحوس ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی وجہ سے انسان کے حالات (غنیٰ، فقر یا صحت و بیماری) میں کچھ تبدیلی ہوتی ہے۔ گھوڑا اگر ایسا ہو کہ سوار نہ ہونے دے، عورت نیک چلن نہ ہو، مکان کی آب و ہوا خراب یا کسی ارواح کی وجہ سے خطرناک ہو، تو یہ اس کی نحوست ہے۔ ❸

چھٹی حدیث: نماز میں بھولنے کی وجہ

"ابو ہریرۃ، حضور سے روایت کرتے ہیں کہ جب نماز کیلئے اذان دی جاتی ہے، تو شیطان بھاگ نکلتا ہے اور اذان کے بعد واپس آ جاتا ہے۔ جب نمازی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے، تو وہ پھر بھاگ جاتا ہے اور پھر نماز شروع ہونے کے بعد واپس آ کر نمازی پر مسلط ہو جاتا ہے، اسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نمازی بھول جاتا ہے اور اسے یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں؟ (بخاري) ❸

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب ما يذكر من شؤم الفرس، رقم الحديث (٢٧٠٣)

❷ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري: ٦٠/٦

❸ صحيح البخاري: كتاب الأذان، باب فضل التأذين، رقم الحديث(٥٨٣) صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب فضل الأذان و هرب الشيطان عند سماعه، رقم الحديث(٥٨٣)

شیطان کا اذان کی عربی عبارت سے گھبرانا، لیکن نماز کی لمبی چوڑی دعاؤں کی پرواہ نہ کرنا اور نمازی پر سوار ہونا، کیسی منطق ہے۔ اگر نماز میں بھول صرف شیطانی تسلط کی وجہ سے ہوتی ہے، تو آنحضرت کیوں بھول جاتے تھے؟'' (دو اسلام: ۳۱۵)

جواب:

اس عبارت میں مصنف نے دو اعتراض کئے ہیں:

① اذان سے کیوں بھاگتا ہے اور نماز کی دعاؤں سے کیوں نہیں بھاگتا؟

② آنحضرت ﷺ کیوں بھولے؟

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ شیطان بھاگتا اس لئے نہیں کہ وہ اذان سے مرعوب ہو جاتا ہے، بلکہ وہ توحید کے اعلان کو سننا گوارا نہیں کرتا۔ دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ اذان سے مرعوب ہو جاتا ہو۔ اس صورت میں مصنف کا یہ اعتراض پھر سامنے آتا ہے کہ وہ نماز کی دعاؤں سے کیوں نہیں بھاگتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق تو شیطانی سرشت اور کلمات کی تاثیر کے ساتھ ہے، اور شیطانی وسوسہ سے نسیان کا ہو جانا، قرآن میں بھی مذکور ہے:

﴿وما أنسانيه إلا الشيطان أن أذكره﴾ ❶

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وإمّا ينسينك الشيطان﴾ ❷

''اگر تجھے شیطان بھلا دے۔''

---

❶ الكهف: ٦٣

❷ الأنعام: ٦٨

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ شیطانی وسوسہ سے بھی نسیان ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں کہیں نسیان ہو، شیطان ہی کی جانب سے ہوگا۔

ساتویں حدیث:

اس کے بعد اسی قسم کی اور حدیث سناتے ہیں:

"آنحضرت کے سامنے کسی نے کہا کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سویا رہا، آپ نے فرمایا کہ شیطان اس کے کانوں میں موت گیا تھا، اس لئے سویا رہا۔" [1]

اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ "ایک دفعہ آنحضرت بھی سو گئے تھے" [2]

(دو اسلام)

جواب:

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ وہ شخص فرض نماز پڑھے بغیر سو گیا تھا۔ جیسے فتح الباری میں ہے [3] سفیان کی روایت میں ہے کہ یہ شخص فرضی نماز سے سو گیا تھا۔ [4]

---

1. صحیح البخاري: أبواب التهجد، باب إذا نام و لم یصل بال الشیطان في أذنه، رقم الحدیث (١٠٩٣)، صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرین، باب ما روي فیمن نام اللیل أجمع حتی أصبح، رقم الحدیث(٧٧٤)، برق صاحب نے اس حدیث کے ترجمہ میں گڑ بڑ کی ہے، جس کی وضاحت مؤلف رحمہ اللہ نے کر دی ہے۔ جزاہ اللہ أحسن الجزاء
2. صحیح البخاري: کتاب مواقیت الصلاة، باب الأذان بعد ذهاب الوقت، رقم الحدیث(٥٧٠)
3. فتح الباري: ٢٨/٣
4. صحیح ابن حبان: ٣٠٢/٦(٢٥٦٢)، المعجم الأوسط: ١٥١/٨، یہ الفاظ سفیان ثوری کی مرفوع حدیث کے نہیں، بلکہ حدیث کے آخر میں سفیان ثوری کا اپنا قول ہے۔ امام ابن حبان نے اس حدیث کو تہجد پر محمول کیا ہے۔ مزید برآں امام بخاری کا اسے "أبواب التهجد" میں ذکر کرنا اور

یعنی عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ بخاری میں یہ لفظ ہیں:

" مازال نائما حتى أصبح"

"صبح تک سویا رہا۔"

آنحضرت ﷺ نے تو عشاء کی نماز پڑھی تھی۔ صبح کی نماز سے غفلت ہوگئی تھی۔ اس جگہ عشاء کی نماز مراد ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی حالت اور اس شخص کی حالت میں فرق ہے کہ وہ شخص ایسے وقت میں سویا جس وقت سونا ممنوع تھا۔ عشاء کی نماز عمداً چھوڑ دی۔ آنحضرت ﷺ اس وقت سوئے، جس وقت سونے کی اجازت ہے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بطور نگہبان مقرر کیا، مگر سب پر نیند ایسی غالب آئی کہ دن چڑھے اٹھے۔ یہ سونا اختیاری معاملہ نہ تھا۔ مصنف نے حدیث کا ترجمہ ایسا کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص بھی دن چڑھے اٹھا تھا۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ "وہ صبح تک سویا رہا۔"

آٹھویں حدیث: تعظیم قبلہ

"حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے بیٹھے، تو وہ قبلہ کی طرف منہ نہ کرے اور نہ پیٹھ۔" (بخاري) ❶

صحیح مسلم میں امام نووی کی تبویب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں: "و يراد به صلاة الليل أو المكتوبة" (فتح الباري: ٢٨/٣)، امام نسائی نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے: "باب الترغيب في قيام الليل" رقم الحديث (١٦٠٨)، اسی طرح امام ابن ماجہ نے "باب كراهة ترك قيام الليل و إن كان تطوعا لافرضا" رقم الحديث (١١٣٠) اور امام ابن أبي شيبة نے "من كان يأمر بقيام الليل" (٦٦١٢) باب قائم کیا ہے، لہٰذا محدثین کرام کی تبویب سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس نماز سے مراد رات کی نفلی نماز ہے۔ واللہ أعلم۔

❶ صحيح البخاري: كتاب الوضوء، باب لا تستقبل القبلة بغائط أو بول إلا عند البناء جدار أو نحوه، رقم الحديث (١٤٤)، صحيح مسلم: كتاب الطهارة، باب الاستطابة، رقم الحديث (٢٦٤)

اور یہ بھی ملاحظہ ہو: عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس والے مکان کی چھت پر چڑھا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور علیہ السلام قبلہ کی طرف پیٹھ کرکے قضائے حاجت فرما رہے ہیں۔ ❶ کس کو صحیح سمجھیں؟ (دواسلام)

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث کے لفظ یہ ہیں: ''جب تم میں سے کوئی شخص ''غائط'' (جنگل ❷) کو جائے، تو وہ قبلہ کی طرف نہ منہ کرے نہ پیٹھ۔'' اس حدیث کا تعلق میدان کے ساتھ ہے اور دوسری حدیث کا تعلق عمارت کے ساتھ ہے۔ ❸

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الوضوء، باب التبرز في البيوت، رقم الحديث (١٤٧)

❷ دیکھیں: النهاية لابن الأثير: ٣/٧٤٤، القاموس المحيط: ٦٢٧

❸ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ پیشاب کی حالت میں اس صورت میں استقبال قبلہ سے منع کیا گیا ہے، جب درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور انسان کھلے میدان میں پیشاب کر رہا ہو، لیکن جب آدمی اور قبلہ کے درمیان کوئی رکاوٹ ہو، تو اس صورت میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (سنن أبي داود، حديث: ١١)

اسی طرح امام ابن خزیمہ دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''باب ذكر الخبر المفسر للخبرين اللذين ذكر تهما في البابين المتقدمين والدليل على أن النبي صلى الله عليه وسلم إنما نهى عن استقبال القبلة واستدبارها عن الغائط والبول في الصحارى والمواضع اللواتي لا سترة فيها و أن الرخصة في ذلك في الكنف والمواضع التى فيها بين المتغوط والبائل و بين القبلة حائط أو سترة'' (صحيح ابن خزيمة: ١/٣٥)

اسی طرح امام ابن حبان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ذكر الخبر الدال على أن الزجر عن استقبال القبلة و استدبارها بالغائط والبول إنما زجر عن ذلك في الصحارى دون الكنف والمواضع المستورة'' (صحيح ابن حبان: ٤/٢٧٩) نیز امام بخاری کی تبویب سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں: ''باب لا تستقبل القبلة بغائط أو بول إلا عند البناء جدار أو نحوه'' (صحيح البخاري: ١/٦٦)

دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث قولی ہے اور دوسری فعلی، قول و فعل میں اگر تعارض ہو، تو اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ فعل آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہو اور باقی قول پر عمل کریں۔ ❶

تیسرا جواب یہ ہے کہ سب احادیث کو جمع کر کے مطلب نکالا جائے۔ پس پہلی حدیث عام ہے اور دوسری اس کی مخصص ہے۔ پس عمارت کی صورت اس پہلی حدیث سے مستثنیٰ ہوگی۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث میں نہی "تنزیہہ" کے لیے ہے۔ پس فعل اس لئے ہے کہ اس نہی کا مرتبہ معلوم ہو جائے۔

نویں حدیث: کیا احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے؟

"صعب کہتے ہیں کہ میں نے حضور کے پاس ایک گورخر بھیجا، آپ نے لوٹا دیا اور فرمایا کہ میں نے احرام باندھا ہوا ہے، ورنہ ضرور لے لیتا۔" ❷

اب دیکھیے یہ حدیث:

"سال حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ابوقتادہ بھی تھا، جس کے بغیر

---

❶ رسول اکرم ﷺ کا ہر قول و فعل امت محمدیہ کے لیے اُسوہ اور قدوہ ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ٢١) لہٰذا نبی اکرم ﷺ کا کوئی بھی عمل اس وقت تک مخصوص نہیں، جب تک اس کی کوئی دلیل یا قرینہ نہ ہو، وگرنہ وہ عمل امت کے لیے بھی مشروع ہے، کیونکہ خصائص رسول ﷺ کسی دلیل کی بنیاد پر تسلیم کیے جاتے ہیں، جب تک کوئی صریح دلیل نہ ہو، اس وقت تک کسی عمل کو آپ ﷺ کا خاصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ واللّٰہ أعلم بالصواب

❷ صحیح البخاري: كتاب الهبة و فضلها، باب قبول هدية الصيد، رقم الحديث (٢٤٣٤)، صحيح مسلم: كتاب الحج، باب تحريم الصيد للمحرم، رقم الحديث (١١٩٣)

باقی سب نے احرام باندھا ہوا تھا۔ اثناء سفر میں ایک گورخر نظر آ گیا۔ پھر ابوقتادہ سوار ہو کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور آخر اسے برچھے سے مار لیا۔ ذبح کر کے پکایا اور صحابہ کو پیش کیا۔ صحابہ نے حضور ﷺ سے پوچھا: کیا ہم کھالیں؟ فرمایا: کھالو! یہ حلال ہے۔" ❶

جواب:

اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ حلال اگر اپنے لئے شکار کرے، تو محرم کھا سکتا ہے، اگر محرم کیلئے یا محرم کو زندہ شکار پکڑ کر دے، تو ہدیہ قبول نہ کرے، حدیث کے لفظ اس طرح ہیں:

"صيد البر لكم حلال ما لم تصيدوه أو يصد لكم" ❷

"جنگلی شکار تمہارے لئے حلال ہے، بشرطیکہ تم خود شکار نہ کرو، یا تمہارے لئے نہ کیا جائے۔"

---

❶ صحيح البخاري: كتاب جزاء الصيد، باب إذا صاد الحلال فأهدى للمحرم الصيد أكله، رقم الحديث (١٧٢٥)، صحيح مسلم: كتاب الحج، باب تحريم الصيد للمحرم، رقم الحديث (١١٩٧)

❷ سنن أبي داود: كتاب المناسك، باب لحم الصيد للمحرم، رقم الحديث: (١٨٥١) سنن الترمذي: أبواب الحج باب ما جاء في أكل الصيد للمحرم رقم الحديث: (٨٤٦) سنن النسائي: كتاب مناسك الحج باب إذا أشار المحرم إلى الصيد فقتله الحلال، رقم الحديث (٢٨٢٧)، مسند أحمد: ٣/٣٦٢، ابن خزيمة: ٤/١٨٠، ابن حبان: ٩/٢٨٣، سنن الدارقطني: ٢/٢٩٠، المستدرك: ١/٦٢١، سنن البيهقي: ٥/١٩٠، شرح معاني الآثار: ٢/١٧١، المنتقى لابن الجارود: ١١٥، یہ حدیث "ضعیف" ہے۔ اس کی سند میں مطلب بن عبد الله بن حنطب اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔ مطلب کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: التلخيص الحبير: ٢/٢٧٦۔

پس پہلی صورت میں اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے آگے چونکہ زندہ گورخر پیش کیا، اس واسطے آپ ﷺ نے سمجھا یہ میرے لئے لایا ہے۔ اسی لئے بعد میں بھی جب اس نے اس کا ایک عضو پیش کیا، تو قبول نہ کیا۔ (فتح الباري) [1]

اور دوسری صورت میں اس نے خود شکار کیا، پھر خود ہی ذبح بھی کیا، پھر پکا کر آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، تو آپ ﷺ نے اس سے لیکر کھا لیا۔

دسویں حدیث: کیا احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے؟

''حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ احرام میں (ایسے کپڑے مت پہنو، جس پر زعفران یا کوئی اور خوشبو لگائی گئی ہو۔'' (مسلم) [2]

''ایک آدمی خوشبودار جبہ پہنے آپ کی خدمت میں آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: جبہ دھو ڈالو، خوشبو کا اثر مٹا دو اور پھر عمرہ کرو۔'' (مسلم) [3]

قولِ جمہور یہی ہے کہ خوشبو حرام ہے، لیکن ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ احرام باندھتے اور توڑتے وقت میں حضور پر خوشبو چھڑکا کرتی

---

[1] فتح الباري: ٤/٣٢

[2] صحيح البخاري: كتاب الحج، باب ما لا يلبس المحرم من الثياب، رقم الحديث (١٤٦٨)، صحيح مسلم: كتاب الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة، رقم الحديث (١١٧٧)

[3] صحيح البخاري: كتاب الحج، باب غسل الخلوق ثلاث مرات من الثياب، رقم الحديث: (١٤٦٣)، صحيح مسلم: كتاب الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة و مالا يباح و بيان تحريم الطيب عليه، رقم الحديث (١١٨٠)، اس حدیث میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آدمی کو تین کاموں کا حکم دیا: (۱) اپنے آپ سے خوشبو کو تین مرتبہ دھو ڈالو۔ (۲) اپنے جسم سے جبہ کو اتار پھینکو۔ (۳) عمرہ کے اندر اسی طرح کرو، جیسا تم حج میں کرتے ہو۔ لہٰذا برق صاحب کا کہنا ''پھر عمرہ کرو'' درست نہیں اور نہ ہی حدیث میں کوئی ایسا لفظ ہے، جس کا یہ معنی ہو!

تھی۔" (مسلم) ❶

"اس خوشبو میں مشک (کستوری) ڈال دیا کرتی تھی اور احرام کی حالت میں اس تیل کی چمک حضور کے بالوں میں دور سے آتی تھی۔" (مسلم) ❷

جواب:

احرام باندھنے کے وقت خوشبو لگانی جمہور کے نزدیک جائز ہے اور بدن میں لگانے کے بعد اس کا اثر احرام کے بعد باقی رہے، تو کوئی حرج نہیں:

"بل الصواب ما قاله الجمهور إن الطيب مستحب للإحرام"

(نووی شرح مسلم: ۱/۳۷۸)

"جمہور کا مذہب یہی ہے کہ خوشبو احرام کیلئے جائز ہے اور یہی ٹھیک ہے۔" پہلی حدیث میں زعفران لگانے سے روکا گیا ہے۔ زعفران ویسے بھی مردوں کیلئے بطور خوشبو استعمال کرنا منع ہے اور جس کپڑے کو لگا ہو، اس کو محرم نہیں پہن سکتا۔ اور بدن پر اگر احرام کے وقت خوشبو لگائے اور احرام کے بعد باقی رہے، تو کوئی حرج نہیں۔ کپڑے اور بدن کا فرق ہے۔ زعفران اور غیر زعفران کا بھی فرق ہے۔ پس دونوں حدیثیں ٹھیک ہیں۔ احرام کے وقت خوشبو لگانا جائز ہے اور جس کپڑے کو زعفران لگا ہوا ہو، اس کا پہننا محرم کو منع ہے۔ اور احرام باندھ کر خوشبو لگانا مطلقاً ممنوع ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الحج، باب الطيب عند الإحرام و ما يلبس إذا أراد أن يحرم و يترجل و يدهن ، رقم الحديث(١٤٦٥)، صحيح مسلم كتاب الحج، باب الطيب للمحرم عند الإحرام، رقم الحديث(١١٨٩)

❷ صحيح مسلم: كتاب الحج، باب الطيب للمحرم عند الإحرام ، رقم الحديث (١١٩٠، ١١٩١)

گیارہویں حدیث: کیا رسول اللہ نے اللہ کو دیکھا تھا؟

''ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور سے پوچھا کہ کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ فرمایا: ہاں میں نے دیکھا تھا، وہ ایک نور ہے۔'' (مسلم)

لیکن یہی ابوذر رضی اللہ عنہ اگلی حدیث میں کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا تھا؟ فرمایا:

"هو نور أنیٰ أراه" ❶

''وہ نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟''

جواب:

پہلی حدیث کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ اصل لفظ یہ ہیں:

"قال أبوذر: قد سألته فقال رأیت نوراً" ❷

''ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے رب کو دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے نور دیکھا ہے'' ''یعنی اللہ کو نہیں دیکھا، بلکہ نور کو دیکھا ہے۔ جیسا اس کے بعد کی روایت میں ہے:

"حجابه النور" ❸

''اللہ کا حجاب نور ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

---

❶ صحیح مسلم : کتاب الإیمان ، باب في قوله علیه السلام " نور أنی أراه" و في قوله رأیت نوراً" رقم الحدیث(۲۹۱)

❷ مصدر سابق، رقم الحدیث(۲۹۲)

❸ صحیح مسلم: کتاب الإیمان ، باب في قوله علیه السلام " إن الله لا ینام" و في قوله حجابه النور" رقم الحدیث(۲۹۳)

"رأيت نورا معناه رأيت النور فحسب ولم أر غيره"[1]

"رأیت نوراً" کا معنیٰ یہ ہے کہ میں نے صرف "نور" دیکھا ہے اور کچھ نہیں دیکھا۔"

بارہویں حدیث: شہد والا قصہ

مشہور واقعہ ہے کہ حضور نے اپنی ایک زوجہ کے ہاں جا کر شہد کھایا۔ چند دیگر ازواج نے سازش کر کے کہا کہ آپ کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ جس پر حضور نے قسم کھائی کہ میں آئندہ شہد نہیں کھاؤں گا اور معاً یہ آیت نازل ہوئی: "اے نبی! ایک حلال چیز کو حرام کرنے کا اختیار آپ کو کس نے دیا؟ کیا آپ بیویوں کو خوش کرنے کیلئے یہ کر رہے ہیں؟"[2] (القرآن)

اس حدیث کو تجرید البخاري کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضور نے حضرت زینب کے ہاں شہد کھایا اور حضرت عائشہ اور حفصہ نے سازش کی۔[3] لیکن ایک اور حدیث تجرید البخاری : ۸۹۳ میں بتایا گیا ہے کہ شہد حفصہ کے ہاں کھایا گیا اور سازش حضرت عائشہ، حضرت سودہ اور حضرت صفیہ نے کی تھی۔"[4]

---

1. شرح النووي على مسلم: ۱۲/۳
2. دیکھیں: التحریم: ۱
3. صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾، رقم الحديث: (٤٩٦٦)، صحيح مسلم: كتاب الطلاق، باب وجوب الكفارة على من حرم امرأته ولم ينو الطلاق، رقم الحديث(١٤٧٤)
4. صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ ......﴾ رقم الحديث: ٤٩٦٧، صحيح مسلم: كتاب الطلاق، باب وجوب الكفارة على من حرم امرأته ولم ينو الطلاق، رقم الحديث(١٤٧٤)

جواب:

محدثین نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو صرف معرفت کیلئے لائے ہیں یا اصل واقعہ کی تحقیقات کیلئے۔ اور ممکن ہے کہ شہد کا واقعہ دو دفعہ گذرا ہو۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے مائی حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں شہد کھایا ہو۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے گھر میں اس قسم کا شہد کھانا بند کر دیا ہو۔ پھر اتفاقاً جب تازہ شہد مائی زینب رضی اللہ عنہا کے گھر آیا، تو آپ ﷺ وہاں کھانے لگے، تو مائی حفصہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے مطلقاً شہد حرام کرا دیا اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، جو ہر دو واقعہ پر چسپاں ہو سکتی ہے۔ مگر تحقیق یہی ہے کہ مائی حفصہ رضی اللہ عنہا اور مائی عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس فعل کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ شان نزول کے واقعات تفاسیر میں متعدد ذکر ہوئے ہیں۔ مگر ایک واقعہ شان نزول بنا اور باقی پر آیت منطبق ہوئی۔ صحابہ انطباق کو بھی نزول سے تعبیر کر دیتے تھے۔ [1] اور قرآن مجید میں واقعات کے تعدد کی طرف اشارہ موجود ہے۔ شروع سورت میں "أزواج" بصیغہ "جمع" ذکر کیا ہے۔ یعنی دو سے اوپر ازواج مطہرات اس واقعات میں شریک تھیں اور آگے چل کر "تثنیه" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ [2] جس کے معنے "دو" کے ہیں۔ چونکہ آخری واقعہ میں دو ہی تھیں، اور اسی واقعہ کے متصل قرآن کی آیات اتریں۔ اس واسطے ان کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے۔

تیرھویں حدیث:

آگے ایک اور واقعہ ذکر کرتے ہیں:

---

1. الإتقان: ۱/ ۹٤، مناهل العرفان: ۱/ ۸۳
2. دیکھیں: التحریم: ٤

شقِ صدر

"صفحات گذشتہ میں ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ بچپن میں چیر کر دل کا وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا، جس پر شیطان کا تسلط ہوا کرتا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل چھت پھاڑ کر گھر میں اتر آیا تھا اور اس نے آپ کا سینہ چیرا تھا۔" (مسلم: ۱/۳۲٤) ❶

"چھت پھاڑنے کی بھی خوب کہی۔ ایک نوری مخلوق جس کا نہ کوئی جسم تھا، نہ وزن، اس کو چھت پھاڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر بالفرض وزن و جسم تھا، تو کیا گھر میں داخل ہونے کیلئے دروازہ نہ تھا؟ سب کچھ تھا۔ لیکن جب تک ہمارے علماء داستان میں ڈرامائی رنگ نہ بھرلیں، انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ اسی واقعہ کو " مالك بن صعصعة"خواب کا واقعہ بتاتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔" (دواسلام :۳۲۱)

جواب:

پہلے تو اعتراض کیا، بعد میں خواب کا واقعہ بتا کر سب واقعہ کو صحیح بنا لیا۔ کیونکہ اعتراض تو اس صورت میں پڑتا ہے، جب واقعہ بیداری کا ہو۔ اگر خواب کا واقعہ ہو، تو چھت پھاڑنا اور سینہ چاک ہونا، سب کچھ روزمرہ کے واقعات کی طرح خواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اور اگر اس طرح کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ اس خاص گھر سے نکالنا مقصود تھا، اس لئے چھت پھاڑی۔ اب اگرچہ دروازہ سے نکالے جا سکتے تھے، مگر آسمان

❶ صحيح البخاري: كتاب الصلاة، باب كيف فرضت الصلوات في الإسراء ، رقم الحديث(٣٤٢) صحيح مسلم، كتاب الإيمان ، باب الإسراء برسول الله صلى الله عليه وسلم ، رقم الحديث(١٦٣)

سے سیدھا آنے کا اشارہ تھا کہ اب کسی خاص کام کیلئے آئے ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس واقعہ کا پہلا حصہ خواب کا ہو۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ اس رات جیسا کہ بعض روایات میں ہے، مسجد میں تھے۔ ❷ مگر آپ ﷺ کو خواب میں ایسا معلوم ہوا کہ میں اُم ہانی کے گھر میں ہوں۔ جبرائیل علیہ السلام چھت پھاڑ کر مجھے لائے۔ پھر مسجد میں لٹا کر سینہ چاک کیا۔

چودھویں حدیث: خیر النساء کون ہے؟

"ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ مردوں میں بڑے بڑے کامل انسان ہو کر گذرے ہیں۔ لیکن عورتوں میں آسیۃ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے بغیر کوئی عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی۔ اور یاد رکھو کہ جس طرح ثرید کھانوں کا سردار ہے، اسی طرح عائشہ تمام عورتوں کی سردار ہے۔" ❷

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ "خیر النساء" ہیں۔ لیکن ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ:

"امت عیسیٰ کی بہترین عورت مریم تھی۔ اور میری امت کی بہترین عورت خدیجۃ الکبریٰ ہیں۔" (بخاري) ❸

---

❶ صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة، رقم الحديث(٣٠٣٥)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ، رقم الحديث(١٦٤)، مسند أحمد: ٤/٢٠٨، ابن حبان: ١/٢٣٦، المعجم الكبير: ١٩/٢٧٠، الأحاد والمثاني: ٤/١١٤

❷ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امرأة فرعون......﴾ رقم الحديث(٣٢٣٠)، صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضل خديجة أم المؤمنين رضى الله عنها ،رقم الحديث(٢٤٣١)

❸ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب، رقم الحديث(٣٢٤٩)، صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضل خديجة أم المومنين رضى الله عنها، رقم الحديث (٢٤٣٠)

یعنی خدیجۃ الکبریٰ "خیر النساء" ہیں۔ اور ایک حدیث میں حضرت فاطمہ کو جنتی عورتوں کا سردار قرار دیا گیا ہے۔(بخاري) ❶
اب ہم کیا سمجھیں کہ "خیر النساء" کون ہے؟ (دواسلام)

جواب:

وجوہ فضیلت مختلف ہیں۔ مائی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے مالی اعانت سب سے زیادہ کی۔ اس لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب ازواج مطہرات سے بہتر ہیں۔ اور مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا علمی خدمات میں سب "امہات المؤمنین" سے بہتر ہیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جوہر فطرت کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے متعلق "خیر النساء" کا لفظ آیا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق آیا ہے کہ جیسے ثرید کی فضیلت باقی کھانوں پر ہے، اسی طرح عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت باقی عورتوں پر ہے۔ ثرید کی فضیلت جزئی ہے، کلی نہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت بھی جزئی ہے، اور وہ ہے علمی خدمت۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق آیا ہے کہ "سيدة نساء أهل الجنة" (وہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں) اور یہ فضیلت مطلقہ ہے، جو کسی اور عورت کو حاصل نہیں۔ فافهم!

---

❶ صحيح البخاري: كتاب المناقب، باب علامات النبوة، رقم الحديث(٣٤٢٦)، صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمه رضي الله عنها ، رقم الحديث (٢٤٢٦)، صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمة رضي الله عنها، رقم الحديث(٢٤٥٠)، ولفظه :" سيدة أهل الجنة أو نساء المؤمنين"

انیسواں باب

چند دلچسپ احادیث

سجدہ آفتاب:

"ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غروب آفتاب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ غروب کے بعد آفتاب کہاں چلا جاتا ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورج بعد از غروب خدائی تخت (عرش) کے نیچے سجدے میں گر جاتا ہے۔ رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسے مشرق سے دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مل جاتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی اور حکم ہو گا کہ لوٹ جاؤ، جس طرف سے آئے ہو۔ چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دیگا۔ اور ﴿والشمس تجري لمستقرلها﴾ [1] کی تفسیر یہی ہے۔" (بخاري)

اگر ہم رات کے دس بجے ریڈیو پاکستان سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدے میں پڑا ہے، تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ جائیں!"

---

[1] یٰس:۳۸

• **جواب:**

جواب دینے سے قبل ضروری ہے کہ اس حدیث کے الفاظ نقل کیے جائیں کہ جب ایک لفظ کا یا کلام کا حقیقی معنی نہ ہو سکے، تو مجازی معنی پر اس کو حمل کرنا ضروری ہوتا ہے:

"قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم لأبي ذر حین غربت الشمس أتدري أین تذھب؟ قلت: اللہ ورسولہ أعلم! قال فإنھا تذھب حتی تسجد تحت العرش فتستأذن ویؤذن لھا ویوشك أن تسجد فلا یقبل منھا وتستأذن فلا یؤذن لھا یقال لھا ارجع من حیث جئت فتطلع من مغربھا فذلك قولہ تعالیٰ: ﴿والشمس تجري لمستقرلھا ذلك تقدیر العزیز العلیم﴾" ❶

"آنحضرت ﷺ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ جب سورج غروب ہوتا ہے، تو کہاں جاتا ہے؟ ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! فرمایا: وہ جاتا ہے، یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ پھر اذن چاہتا ہے، تو اس کو اذن مل جاتا ہے۔ قریب ہے کہ سجدہ کرے اور اسکا سجدہ قبول نہ ہو اور اذن چاہے، تو اس کو اذن نہ ملے۔ کہا جائے: واپس ہو جا (جہاں سے آیا ہے، اسی طرف چلا جا) پھر مغرب سے نکلے گا۔ قرآن کی اس آیت "سورج اپنی قرار گاہ کی طرف جا رہا ہے، یہ غالب جاننے والے کا اندازہ ہے" کا یہی مطلب ہے۔"

---

❶ صحیح البخاري: کتاب بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر، رقم الحدیث (۳۰۲۷)، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب بیان الزمن الذي لا یقبل فیه الإیمان، رقم الحدیث(۱۵۹)

اس حدیث میں (۱) سورج کا جانا (۲) عرش کے نیچے سجدہ کرنا (۳) اذن مانگنا پھر اذن ملنا (۴) سجدہ کا قبول نہ ہونا (۵) اذن مانگنا اور اذن نہ ملنا (٦) واپسی کا حکم (۷) آیت کا مطلب مذکور ہیں۔

سورج کا جانا:

❶ سورج کے جانے کا مطلب تو صاف ہے کہ آگے کی طرف چل رہا ہے، یعنی جس طرح وہ طلوع سے غروب اور غروب سے طلوع تک چلتا ہے، اب بھی اسی طرح چل رہا ہے۔

عرش کے نیچے سجدہ کرنا:

❷ عرش کے نیچے جانے کا یہ مطلب ہے کہ اب وہ ہمارے آسمان پر نہیں، کیونکہ عرف میں آسمان "مافوق الأفق" کا نام ہے۔ جو حصہ دائرہ افق سے اوپر نظر آتا ہے، اس کو آسمان کہتے ہیں۔ جب اس دائرہ سے نیچے ہو گیا، تو جہاں رات ہوگئی، وہاں کے آسمان سے گویا نیچے اتر گیا۔ مگر عرش کا دائرہ چونکہ آسمان کے دائرے سے وسیع ہے، اس لئے وہ آسمان کے دائرہ سے اتر جانے کے بعد بھی عرش کے نیچے ہی رہے گا۔ اگرچہ پہلے بھی جب وہ آسمان کے نیچے دکھائی دیتا تھا، عرش کے بھی نیچے تھا۔ مگر عرف میں قریب کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اگر مکان کے اندر ہو، تو کہتے ہیں کہ چھت کے نیچے ہے۔ جب باہر نکل جائے، تو آسمان کے نیچے چلا گیا۔ حالانکہ پہلے بھی وہ آسمان کے نیچے تھا، مگر درمیان میں چونکہ واسطہ چھت کا تھا، اس لئے چھت کے نیچے کہا گیا۔ اسی طرح سورج پہلے آسمان کے نیچے تھا، اب عرش کے نیچے کہا جائے گا۔ پس جہاں سورج موجود ہے، وہاں آسمان کے نیچے ہے اور جہاں غروب ہو چکا ہو،

وہاں سورج آسمان کے نیچے نہیں صرف عرش کے نیچے ہوگا۔

اذن مانگنا:

❷ اذن مانگنا، جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿یسئاله من في السموٰت والأرض﴾ ❶

''آسمان اور زمین میں ہر کوئی اسی سے مانگ رہا ہے۔''

یا جس طرح فرمایا:

﴿ قالتا أتینا طائعین﴾ ❷

''ہم آسمان اور زمین مطیع ہو کر آئے۔''

پس اذن مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے وہ چل رہا ہے۔ سجدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تابع فرمان ہو کر اس کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔

جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ ألم تر أن اللّٰه یسجد له من في السموت ومن في الأرض والشمس والقمر والنجوم......﴾ ❸

''کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے اور سورج، چاند اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہے ہیں؟''

نیز فرمایا:

﴿ والنجم والشجر یسجدان﴾ ❹

---

❶ الرحمن:٢٩

❷ فصلت:١١

❸ الحج:١٨

❹ الرحمن:٦

”ستارے اور درخت بھی (اسی کو) سجدہ کرتے ہیں۔“

سجدہ قبول نہ ہونا:

④ سجدہ قبول نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کو اس طرح چلنے کی اجازت نہ ہوگی، جس طرح وہ چل رہا ہے۔

اذن نہ ملنا:

⑤ اذن نہ ملنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اب اسے اپنا سفر پہلے کی طرف طے کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اب اسے الٹا چلنا پڑے گا، یعنی اسے واپس کر دیا جائے گا اور مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔

حدیث کا مطلب:

پوری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سورج اب بھی پہلے کی طرح چل رہا ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ جب یہ افق غرب سے بعد از غروب طلوع کریگا (اور یہ قیامت کے قریب ہوگا۔)

ایک اور توجیہ اس کی یہ ہے کہ اس جگہ سورج سے مراد سورج کی روحانیت ہے یا وہ ملائکہ ہیں، جو سورج پر مقرر ہیں۔ اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر وقت اللہ کے حکم سے سورج چل رہا ہے۔

ایک اور توجیہ یہ ہے کہ آسمان عرفاً ”مافوق الأفق“ کو کہتے ہیں۔ جب سورج کسی افق والوں کے افق سے نیچے ہو جائے، تو وہاں کے لوگوں کے نزدیک آسمان سے اتر جاتا ہے۔ اسی طرح عرش کا بھی یہی حال ہے، کیونکہ عرش آسمانوں کو محیط ہے۔ پس جب کسی افق سے سورج نیچے ہو جاتا ہے، تو اس افق والوں سے جس طرح دور ہوتا جاتا ہے، اسی طرح عرش سے بھی اس کی دوری متصور ہوگی اور یہ دوری آدھی رات تک بڑھتی چلی جاتی ہے اور عین آدھی رات میں سورج اپنی انتہائی دوری پر ہوتا

ہے۔ اور ہر افق والوں کے عین نیچے اور درمیان ہوتا ہے۔ اسی مقام سے آگے بڑھے، تو مشرق کی طرف طلوع کرتا ہے اور پیچھے ہٹے، تو مغرب سے طلوع کریگا۔ قیامت کے قریب جب سورج اور زمین کے تماسک میں خلل واقع ہوگا، اس وقت عرب کی نصف رات سے پیچھے ہٹ کر مغرب کی طرف طلوع کریگا، اور یہی ہے مطلب حدیث کا!

حدیث کی دوسری توجیہ:

ایک اور توجیہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز جو عالم میں پائی جاتی ہے، اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک اس کی ظاہری شکل وصورت، دوم اس کا فعل، ظاہری شکل وصورت مادے کی طرف منسوب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ قیومیت کا ظہور ہے۔ اور اس کا فعل اس کی قوت کی طرف منسوب ہے، جو اللہ تعالیٰ کی صفت حیات کا ظہور ہے۔ حقیقت میں قوت ایک روحانی شئے ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہر چیز میں روح موجود ہے، تو نہایت موزوں ہوگا۔ اہل کشف کے نزدیک ہر چیز اپنا ایک وجود ثانی رکھتی ہے۔ یا اہل کشف کو ہر چیز کا ایک لطیف وجود نظر آتا ہے۔ وہ شہادی وجود کی طرح ہوتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے جو سورج کے متعلق ذکر فرمایا تھا، وہ اس کے وجود مثالی کی نقل وحرکت کے متعلق ذکر کیا تھا، یہ عام وعظ نہ تھا۔ صرف ایک زاہد آدمی کے ساتھ کلام تھی۔

آگے چل کر ایک دوسرا اعتراض کرتے ہیں:

شیطان کا طول وعرض:

"کہتے ہیں کہ پیشانی طولِ جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے۔ انسان کا قد اوسطاً ۶۴ انچ ہوتا ہے اور اس کی پیشانی چار انچ۔ یہی نسبت باقی حیوانات میں

بھی پائی جاتی ہے۔
ماہرین ارض و سما نے سالہا سال کی تحقیق و تلاش کے بعد اعلان کیا ہے کہ زمین کا محیط ۲۵ ہزار میل ہے۔ یعنی اگر ۲۵ ہزار میل لمبا دھاگہ تیار کر کے زمین کے اردگرد لپیٹ دیں، تو وہ بالکل پورا ہو جائے گا۔ سورج زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے۔ اور اس کا محیط بتیس ارب پچاس کروڑ میل ہے۔
ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لئے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ (بخاری: ۱۳٤/۲)
سورج کی موٹائی بتیس ارب میل ہے، اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ پیشانی طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے، تو شیطان کے جسم کی لمبائی پانچ کھرب بیس ارب میل ہونی چاہیے۔ اور چوڑائی بھی اسی نسبت سے، اتنا بڑا شیطان کہاں کھڑا ہوتا ہوگا؟ زمین سے سورج پینتیس لاکھ میل دور ہے اور شیطان کی لمبائی سوا پانچ کھرب میل۔ اگر شیطان کو زمین پر کھڑا کیا جائے، تو سورج اس کے ٹخنوں سے بھی نیچے رہ جاتا ہے۔ اسے شیطان کے سینگوں تک پہنچانے کیلئے کیا انتظام کیا جاتا ہے اور اتنا بڑا شیطان زمین میں سماتا کیسے ہے؟ اور زمین کے کسی نہ کسی حصے پر ہر وقت سورج طلوع ہوتا رہتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج ہر وقت شیطان کے سینگوں میں پھنسا رہتا ہے! (دو اسلام: ۳۲۵)

جواب:

اس سوال کی دو شقیں ہیں:

① شیطان کی پیشانی جب تک سورج کی موٹائی (ساڑھے بتیس ارب میل) کے برابر نہ ہو، تو اس وقت تک ہم نہیں کہہ سکتے کہ سورج شیطان کے سر کے دونوں حصوں کے مابین ہے۔

② چونکہ سورج ہر وقت طلوع کر رہا ہے، اس سے لازم آتا ہے کہ شیطان ہر وقت سورج کے ساتھ رہے۔

قبل اس کے کہ ہم جواب دیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے لفظ اور اس کا ترجمہ نقل کر دیا جائے، بخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"إذا طلع حاجب الشمس فدعوا الصلوٰة حتی تبرز وإذا غاب حاجب الشمس فدعوا الصلوٰة حتیٰ تغیب ولا تحینوا بصلاتکم طلوع الشمس ولا غروبها فإنها تطلع بین قرني شیطان" [1]

"جب سورج کا کنارا نکلے، تو جب تک پورا طلوع نہ ہو جائے، نماز نہ پڑھو اور جب سورج کا کنارا ڈوب جائے، تو جب تک پورا غروب نہ ہو جائے، نماز نہ پڑھو، نماز پڑھنے کیلئے سورج کے طلوع و غروب کو وقت نہ بناؤ۔ کیونکہ جب سورج نکلتا ہے، اس وقت شیطان کے دو کناروں کے مابین طلوع ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے"

"قرنا الشیطان جانبا رأسه" (فتح الباري :۳/۲۰۸) [2]

---

[1] صحیح البخاري: کتاب بدء الخلق، باب صفة إبلیس وجنوده، رقم الحدیث (۳۰۹۹)، صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرین، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فیها، رقم الحدیث(۸۲۹)

[2] فتح الباري: ۳۵۲/۶، ط: دار المعرفة، بیروت

”شیطان کے دو قرن سے مراد اس کے سر کے دونوں جانب ہیں۔“

”يقال إنه ينتصب في محاذاة مطلع الشمس حتىٰ إذا طلعت كانت بين جانبي رأسه لتقع السجدة له إذا سجد عبدة الشمس لها و كذا عند غروبها وعلىٰ هذا فقوله: ”تطلع بين قرني الشيطان“ أي بالنسبة إلىٰ من يشاهد الشمس عند طلوعها فلو شاهد الشيطان لرآه منتصبا عندها“ (فتح الباري: ٢/٢٨) ❶

”اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شیطان سورج کے جائے طلوع پر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، جب سورج نکلتا ہے، تو اس کے سر کے دونوں کناروں کے مابین نکلتا ہے، تاکہ سورج پرستوں کا سجدہ اس کے آگے ہو۔ یہی صورت غروب کے وقت ہوتی ہے۔ اس صورت میں سورج کا شیطان کے سر کے دونوں کناروں کے مابین نکلنے کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر کوئی دیکھنے والا اس منظر کو دیکھ لے، تو اس کو سورج شیطان کے سر کے دو کناروں کے مابین نکلتا ہوا معلوم ہوگا۔“

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص جو غیر اللہ کی پرستش کرتا ہے، حقیقت میں وہ شیطان کی پرستش کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إن يدعون إلا شيطانا مريدا﴾ ❷

شرک کی حقیقت:

مشرک خواہ کسی کو پکارتا ہو، حقیقت میں شیطان کو پکارتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی اگر

---

❶ فتح الباري: ٦/٣٤٠

❷ النساء: ١١٧

''لات'' کو پکارتا ہے، تو اس کے متعلق اس کا خیال یہ ہے کہ وہ میری حاجت روائی کی قدرت رکھتا ہے۔ اس قسم کا ''لات'' نفس الامر میں تو موجود نہیں، کیونکہ اس قسم کے اختیارات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ہی مخصوص رکھے ہیں۔ پس وہ ''لات'' جو اس کے دماغ میں مشکل کشائی کے وصف کے ساتھ متصف ہو گیا ہے، وہ شیطان کا پیدا کردہ ہے، پس جو شخص ''لات'' کو پکارتا ہے، دراصل شیطان کو پکارتا ہے۔ اور ''لات'' کا وہ تصور جو اس کے ذہن میں پیوست ہو چکا ہے، کبھی کبھی اس کو خواب اور کشف میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ قوت متخیلہ کا ایک کرشمہ ہے۔ پس وہ صورت جو کبھی کبھی اس کو مختلف مناظر میں جلوہ گر نظر آتی ہے، دراصل اس کی روح شیطان ہے، اس لئے وہ صورت ایک قسم کا شیطان کا ہیکل اور اس کا لطیف دماغی مجسمہ ہے۔

اور یہ بات شرک کی ہر صورت میں پائی جاتی ہے۔ مشرک خواہ سورج پرست ہو یا چاند کا پرستار، بت کا پجاری ہو یا کسی دیوی دیوتا کا، اس قسم کے تخیلات میں گرفتار اور اسی کے خمار میں مست و سرشار ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ میری باطن کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں نے حقیقت کو پالیا ہے۔ دراصل وہ شیطان کے وسوسے کا شکار اور خرابی دماغ میں گرفتار ہے۔ اسی طرح سورج پرست جب سورج کو کسی غلط فہمی کی بناء پر اپنا مشکل کشا سمجھ لیتا ہے اور اس کی روحانیت کے متعلق اس کا خیال ایک دماغی تصویر بنا لیتا ہے، تو خواب و کشف میں اس کو وہ تصویر نظر آنی شروع ہوتی ہے۔ سورج پرستوں کے ہاں اس قسم کے واقعات جن کی بناء اسی تخیل پر ہے، مشہور و معروف ہیں۔ پس جب کوئی سورج پرست سورج کی عبادت کرتا ہے، اور اس کو اپنا مشکل کشا خیال کرتا ہے، تو جھٹ وہ دماغی تصویر دماغی حرکت میں آجاتی ہے اور سورج کے ساتھ اس کو پیوست نظر آتی ہے۔ مگر جب اس کی عبادت کا وقت گذر جاتا ہے، تو وہ تصویر بھی اس کے وہم کے مطابق اس کے سامنے سے ہٹ کر اس کے خیال میں چلی جاتی ہے، اسی

تصویر کو آنحضرت ﷺ نے شیطان کہا ہے، جو ہر عابد کو اپنے معبود کے ساتھ خواب و کشف میں نظر آتی ہے۔ اور یہ کلام اس کے مشاہدہ اور اعتقاد کی بناء پر ہے۔ جیسے فتح الباري کی عبارت میں تصریح ہے۔ یہاں کسی شئے کا چھوٹا یا بڑا دکھائی دینا، اس کے خارجی وجود کی بناء پر نہیں، تاکہ اس کے لئے حساب کا قاعدہ جاری کیا جائے، بلکہ حسی وجود کی بناء پر ہے۔ حساً چونکہ سورج صرف ایک بالشت موٹا نظر آتا ہے، پس ایسی صورت جس کے سر کا قطر ایک بالشت ہو، اگر سورج کے ساتھ نظر آجائے، تو وہ کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے، جو حدیث میں مذکور ہے۔

ایک اور توجیہ:

شیطان ایک نہیں، بلکہ بہت سے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

﴿أنآ أرسلنا الشياطين على الكافرين﴾ ❶

''ہم شیاطین کو کافروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔''

پس ہر افق کا شیطان الگ الگ ہے۔ یہ شیطان اس وقت عابد کے سامنے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ''ذوالقرنین'' مغرب میں پہنچے، تو سورج کو دیکھا کہ ایک دلدل کے چشمے میں غروب ہو رہا ہے:

﴿وجدها تغرب في عين حمئة﴾ ❷

اس کا مطلب صاف ہے کہ مغرب کی انتہائی آبادی میں اس وقت دلدل تھی۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ سورج غروب ہوتے وقت مغربی جانب کی اشیاء میں غروب ہوتا نظر آتا ہے۔ پس سمندر کے سوار کو سورج سمندر میں غروب ہوتا نظر آئیگا۔ اسی طرح

---

❶ مریم:۸۳

❷ الکہف:۸۶

"ذوالقرنین" کو کیچڑ اور چشمے میں غروب ہوتا معلوم ہوا۔ اب اگر آپ کے مطابق یہ کہا جائے کہ سورج کی موٹائی ساڑھے بتیس ارب میل ہے، تو یہ چشمہ جس میں یہ غروب ہوتا انہیں معلوم ہوا، کتنا بڑا ہوگا؟ ظاہر ہے یہ سورج کی موٹائی سے بڑا ہوگا۔ اب بتائیے کہ یہ چشمہ کہاں ہے جو زمین سے بھی بڑا ہے اور سورج سے بھی بڑا ہے، لیکن زمین پر موجود ہے۔ کہیے یہ گتھی آپ کیونکر سلجھائیں گے؟ کہہ دیجئے کہ زمین (جس پر یہ چشمہ ہے، جس میں سورج بھی سما جاتا ہے) سورج سے بہت بڑی ہے۔ لیکن اس پر تو مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنسنے لگی گی۔ تو پھر جناب من بات وہی ہے، جو ہم نے کہہ دی ہے۔ اسے تسلیم کر لیجئے۔

ویسے بھی عام بول چال میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ سورج صحن میں ہے، سورج ابھی دیوار کے پیچھے ہے، سورج سر پر ہے، سورج درختوں کی اوٹ میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان محاوروں کا مطلب بچے بھی جانتے ہیں، مگر جب اعتراض کرنا ہی غرض ہو، تو انسان کی عقل بچے سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سورج یا چاند کو کسی پانی کے گڑھے میں دیکھ کر اس کو نکالنے، ماپنے اور کبھی حیرت میں پڑھ کر چہ میگوئیاں کرنی شروع کر دیتا ہے۔

۲۔ دوسرے اعتراض کا جواب بھی اب سمجھ میں آ گیا ہوگا، کیونکہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ شاید وہ شیطان سورج کے ساتھ پیوست ہوتا ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ شیطان ہر عابد کی دماغی تصویر ہے، یا ہر علاقہ کا الگ شیطان ہے۔

حدیث کا علم الجغرافیہ:

"موسم کس طرح بدلتے ہیں؟ ہم اور آپ تو اتنا ہی جانتے ہیں اور حقیقت

بھی یہی ہے کہ موسم گرما میں ہم سورج کے قریب ہو جاتے ہیں اور سرما میں دور۔ اس لئے گرمی اور سردی محسوس کرتے ہیں۔ گرمی میں زمین کے خاکی ذرات گرم ہو جاتے ہیں، اور چونکہ یہ ذرات پہاڑوں پہ کم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہاں مقابلتاً ٹھنڈک ہوتی ہے۔ لیکن حدیث کہتی ہے:

''ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جہنم نے خدا کے پاس شکایت کی کہ میرا دم گھٹ چلا ہے، اس لئے مجھے سانس لینے کی اجازت دی جائے، اللہ نے کہا کہ تم سال میں صرف دو سانس لے سکتے ہو۔ چنانچہ اس کی ایک سانس سے موسم گرما اور ایک سانس سے موسم سرما پیدا ہو گیا۔'' (بخاري) [1]

لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ہر سال گرمیوں میں صرف دو ہی علاقے اس سانس کی لپیٹ میں کیوں آتے ہیں، جو خط استوا کے قریب ہیں۔ اور سارا یورپ، سائبریا، گرین لینڈ اور کینیڈا وغیرہ کیوں بچ جاتے ہیں؟ الخ (دو اسلام: ۳۲۶)

جواب:

اس اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ جب سردی اور گرمی کا تعلق سورج کے قریب اور دور ہونے سے ہے، تو حدیث کا مطلب کیا ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرمی کا تعلق سورج کے ساتھ ہے اور ایک حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے:

---

[1] صحيح البخاري: كتاب مواقيت الصلاة، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر، رقم الحديث(٥١٢)، صحيح مسلم: كتاب المساجد، باب إستحباب الإبراد بالظهر في شدة الحر، رقم الحديث (٢١٥،٢١٧)

”ما أيقظنا إلا حر الشمس“ (بخاري) ❶

”ہم کو سورج کی گرمی نے جگایا“

مگر اس حدیث میں ایک اور بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں ہیں، ان کا ظہور مادے کی بناء پر ہے اور ان کا فعل ان کی قوت کی بناء پر ہے۔ ہر چیز مادہ اور قوت فنا یا انتشار کا شکار ہو رہے ہیں اور محدود زندگی کے لئے ان کو ہر لمحہ روحانی امداد پہنچ رہی ہے۔ اگر ان کو روحانی امداد نہ ملے، تو ہر شئے تھوڑے عرصہ میں فنا ہو جائے یا منتشر ہو جائے۔ سورج گرمی چھوڑ دے اور برف سردی۔ پس وہ منبع جس سے سورج کو گرمی اور ہوا اور پانی کو سردی میں مدد ملتی ہے، وہ جہنم ہے۔ حدیث میں سورج سے گرمی پہنچنے سے انکار نہیں، بلکہ اس میں گرمی کا منبع بتایا گیا ہے۔

بعض محققین نے ایک لطیف جواب دیا ہے اور وہ یہ کہ عالم شہادت جس کی شکل وصورت اور کیفیت کو ہم حواس اور عقل سے محسوس کرتے ہیں اور عالم مثال جس کو ہم اپنے خیال سے جان سکتے ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں کیلئے ایک ایسا منبع ہے، جس سے اچھی کیفیات کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرا ایسا منبع ہے، جس سے مخالف اور مضر کیفیات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ مضر کیفیت خول جہنم میں جائے یا دنیا میں آئے، اس کا منبع ایک ہے۔ جب ایک منبع سے دو نہریں نکلتی ہوں، اگر ان میں سے ایک کا پانی بند کر دیا جائے، تو دوسری میں پانی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں میں پانی چھوڑا جائے، تو پہلی میں بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس عالم کے پیدا ہونے سے قبل عالم مثال تھا اور اس وقت منبع سے صرف جہنم ہی کی کیفیات مضرہ کا اخراج

---

❶ صحيح البخاري: كتاب التيمم، باب الصعيد وضوء المسلم يكفيه من الماء، رقم الحديث(٣٣٧)، صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، رقم الحديث(٦٨٢)

ہوتا تھا۔ یہی شکایت کا وقت تھا (اور یہ شکایت بعض علماء کے نزدیک زبان حال سے تھی اور بعض کے نزدیک زبان قال سے) اس کے بعد یہ عالم پیدا ہوا، تو اس عالم میں بھی کیفیات مضرہ کے اسباب پیدا کر دیئے۔ کیفیات مضرہ کے ظہور کیلئے جیسے فاعل کے بغیر چارہ نہیں، ویسے ہی محل کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے۔ پس وہ کیفیات مضرہ جو اس عالم کے وجود سے پہلے صرف جہنم کی طرف رجوع کرتی تھیں، اس عالم کے پیدا ہونے کے بعد اس میں کمی ہو گئی۔

اور بعض علماء اس حدیث کو صرف تمثیل قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ گرمی تکلیف دہ چیز ہے۔ ان کے نزدیک نہ کلام ہے، نہ انتقال، بلکہ صرف ایک تمثیل ہے۔ جیسے مثل مشہور ہے کہ سب قومیں اللہ کے پاس گئیں اور سب کو ایک ایک کسب دیا۔ ایک قوم باقی رہ گئی اور کسب ختم ہو گئے، تو اللہ نے فرمایا کہ تمہارے لئے کوئی کسب نہیں، جو کسب دیکھو کر لو۔ اس تمثیل کا یہ مطلب ہے کہ یہ قوم سب کسب کرتی ہے۔ اسی طرح اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ گرمی تکلیف دہ چیز ہے، ایسی تکلیف دہ جیسے جہنم سے آئی ہوئی ہے۔

اس کے آگے ایک اور حدیث پہ جرح کرنی چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں:

حدیث کا علم الطب:

"ماہرین طب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ مکھی ایک نہایت خطرناک جانور ہے، جو مہلک امراض کے جراثیم ایک جسم سے دوسرے جسم تک منتقل کرتی رہتی ہے۔

لیکن حدیث کہتی ہے کہ:

"إذا وقع الذباب في شراب أحدكم فليغمسه ثم لينزعه فإن

في إحدى جناحيه داء و الأخرى شفاء" ❶

"اگر مکھی پانی میں گر جائے، تو اسے ڈبو کر نکال دو، اس لئے کہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے پر میں شفا ہے۔" (دو اسلام: ۳۴۷)

جواب:

اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ مکھی بیماری کے جراثیم اٹھا کر لے جاتی ہے اور گندگی اس کی غذا ہے اور اس کے جسم میں موجود ہوتی ہے۔ پس حدیث کا یہ کہنا کہ "اگر پانی میں گر جائے، تو اس کو ڈبو کر نکالو، کیونکہ اس کے دوسرے پر میں شفا ہے۔" ٹھیک نہیں!

مگر اس امر پر غور نہیں کیا کہ اس کے جسم میں ایک ایسا تریاق موجود ہے، جو اس گندگی کو فنا کر دیتا ہے، جو اس کے جسم کے اندر موجود ہوتی ہے اور اس کے جراثیم کے مہلک اثرات کا اس میں علاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکھی ان تمام زہریلی چیزوں کو کھا جاتی ہے، جو ہمارے لئے مہلک ہیں، مگر ان کے کھانے سے مرتی نہیں، بلکہ چست و چالاک ہوتی ہے۔ بعض بچے جن کو دق الأطفال کی بیماری ہو جاتی ہے، ان کا علاج مکھیوں کے کھلانے سے کیا جاتا ہے۔ اور ایک قسم کی مکھی ذبح خانے میں موجود ہوتی ہے، اس سے مرگی کا علاج کیا جاتا ہے۔ مکھی کے افعال سے جن علماء نے بحث کی ہے، ان کا اقرار ہے کہ مکھی کے جسم میں جراثیم کش تریاق موجود ہے۔

مکھی کی عادت ہے کہ جب گرتی ہے، تو ایک پہلو پر گرتی ہے۔ اپنے آپ کو بچانے کیلئے پر جھاڑتی ہے، اس طرح جو مادہ پروں کے ساتھ ہوتا ہے، جھڑ جاتا ہے۔

---

❶ صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب في شراب أحدكم......، رقم الحديث (٣١٤٢)

اب اس میں تریاقیت کا اثر باقی ہے، جو ڈبونے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس حدیث سے تو آنحضرت ﷺ کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ الٹا اعتراض کر رہے ہیں!

آگے پھر ایک حدیث پر اعتراض ہے:

حدیث کا علم التولید:

''رحم مادر میں بچہ کیسے بنتا ہے؟ نر و مادہ کی علامات اس میں کس منزل پر کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ماں یا باپ دونوں کے خدوخال کیسے حاصل کر لیتا ہے؟ یہ فطرت کے وہ رموز ہیں، جنہیں کوئی ماہر فطرت آج تک نہیں سمجھ سکا، لیکن ہمارے علماء ان مسائل کو صدیوں پہلے حل کر چکے ہیں۔

''مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے اور عورت کا زرد، انزال کے بعد یہ ہر دو قسم کے نطفے مل جاتے ہیں، اگر یہ مائل بہ سفیدی ہو، تو بچہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ بچی۔'' [1] (مسلم)

ماہرین تولید اس امر پر متفق ہیں کہ عورت کا نطفہ مقدار میں بیحد کم یعنی بمشکل ایک آدھ قطرہ ہوتا ہے اور مرد کا کافی زیادہ۔ اگر دونوں نطفے مل جائیں، تو عورت کا نطفہ نظر تک نہ آئے۔ اس صورت میں چاہئے تو یہ تھا کہ مجامعت میں ہمیشہ لڑکا پیدا ہو، چہ جائیکہ وہ نطفہ مرد کا رنگ بدلتا پھرے۔

خدوخال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ''مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال پہلے ہو، تو بچہ باپ پر جاتا ہے، ورنہ ماں پر۔'' (بخاري) [2]

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الحيض، باب وجوب الغسل على المرأة بخروج المني منها، رقم الحديث(٣١١)، برق صاحب کے ذکر کردہ ترجمہ کے بارے میں وضاحت آگے آرہی ہے۔

[2] صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ﴿ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ.....﴾ رقم الحديث(٣١٥١)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو، جو فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ اور ابلیس کی زد سے بالکل باہر ہو، تو لیجئے نسخہ حاضر ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص مجامعت کرنے لگے، تو یہ دعا پڑھ لے:

"بسم اللّٰه اللهم جنبنا الشيطان و جنب الشيطان ما رزقتنا" (بخاري) [1]

"اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو شیطان سے بچا۔"

تو اس کی اولاد کو شیطان کبھی گمراہ نہ کر سکے گا۔

کتنی امرت دھارا قسم کی دعا ہے کہ نہ قرآن کی ضرورت باقی رہی اور نہ رسول کی۔ (دو اسلام)

جواب:

یہاں یہ اعتراض ہے کہ:

حدیث میں باپ یا ماں کے ساتھ بچے کی مشابہت کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح لڑکا یا لڑکی ہونے کا سبب ذکر کیا گیا ہے۔ ابھی تک اس کا پتہ نہیں چلا، بلکہ واقعہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ نطفہ کا صرف ایک ذرہ استعمال ہوتا ہے، باقی بالکل بہہ جاتا ہے اور عورت کا نطفہ بالکل قلیل ہوتا ہے۔ رنگت کے لحاظ سے اس کے غالب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر دعا پڑھنے سے بچہ شیطان کے اثر سے بچ جائے، تو پھر قرآن، رسول کی کہاں ضرورت رہی؟

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الوضوء، باب التسمية على كل حال و عند الوقاع، رقم الحديث (١٤١)، صحيح مسلم: كتاب النكاح، باب ما يستحب أن يقوله عند الجماع، رقم الحديث (١٤٣٤)

یہ ہے اعتراض! اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی لڑکا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی، اور کبھی بچہ ماں کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی باپ کے۔ ماہرین کو ابھی تک اس کا سبب معلوم نہیں۔ مگر بعض ماہرین کہتے ہیں کہ مذکر و مؤنث کا تعلق عورت کے نطفہ سے ہوتا ہے۔ بعض مہینوں میں لڑکے پیدا ہوتے ہیں اور بعض میں لڑکیاں۔ مگر ان کا یہ قاعدہ تخمینی ہے، کلی نہیں۔ ماہرین کو بہرکیف کوئی ٹھوس چیز معلوم نہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس کے متعلق بتایا ہے۔ حدیث میں یہ لفظ نہیں کہ یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو، تو بچہ ہوتا ہے۔ بلکہ حدیث کے یہ لفظ ہیں کہ اگر مرد کا نطفہ غالب ہو، تو لڑکا، ورنہ لڑکی۔ غلبے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زیادہ ہو، بلکہ معنوی غلبہ مراد ہے۔ یعنی مرد کے نطفہ میں لڑکا بننے کا اثر ہوتا ہے اور عورت کے نطفہ میں لڑکی بننے کا۔ اب جس کا اثر غالب ہو گا، وہی صورت ہو گی۔ غلبہ سے مراد یہ نہیں کہ اگر مرد کا نطفہ زیادہ ہو گا، تو لڑکا، ورنہ لڑکی۔ اگر غلبہ میں کثرت کا بھی لحاظ رکھا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ مرد کا نطفہ جتنا انعقادِ حمل میں خرچ ہوتا ہے، اس کے اندازے میں تفاوت ہوتا ہے۔ لڑکا بننے کیلئے کچھ زیادہ خرچ ہوتا ہے اور لڑکی بننے کیلئے کچھ کم۔

مشابہت والی حدیث میں "سبق" کا لفظ ہے، جس کے معنی بڑھنے کے ہیں۔ اگر مرد کا نطفہ بڑھ جائے، تو باپ سے مشابہت ہو گی ورنہ ماں سے۔ بڑھنے کے معنی پہلے انزال ہونے کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے اور معنوی بڑھنا بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

دعاء کے اثر کا یہ مطلب نہیں کہ بچہ ایسا نیک ہو گا کہ اس کو قرآن اور رسول کی ضرورت نہیں ہو گی۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس کے شامل حال ہو گا اور قرآن و سنت سے مستفید ہونے کی اس میں قابلیت ہو گی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بچے کو شیطان جسمانی ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ شیطان مرد کے ساتھ اس کے فعل میں شریک ہو کر بچے

میں ضرر کا باعث نہ بنے گا۔ نیز ان امور کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے۔ کیونکہ دعا کے اثر کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے۔ جب مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں، تو ان کی ماں نے یہ کہا:

﴿إني أعيذها بك و ذريتها من الشيطان الرجيم﴾ ❶

''میں اس کو اور اس کی ذریت کو مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔''

جب ولادت کے بعد دعا کی جا سکتی ہے، تو انعقادِ حمل سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

﴿ادعوني أستجب لكم﴾ ❷

''مجھ سے مانگو، میں دوں گا۔''

آگے ایک اور حدیث پر اعتراض کرتے ہیں:

حدیث کا علم الاصوات:

''مرغ کیوں بانگ دیتا ہے؟ گدھا کیوں رینکتا ہے؟

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ تم مرغ کی صدا سنو، تو اللہ سے فضل کی دعا مانگو، اس لئے کہ اس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آیا کرتا ہے۔ اور جب گدھے کی آواز سنو، تو شیطان سے پناہ مانگو۔ اس لئے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر رینکتا ہے۔'' (بخاري) ❸

---

❶ آل عمران:٣٦

❷ غافر:٦٠

❸ صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال، رقم الحديث(٣١٢٧)، صحيح مسلم: كتاب الذكر والدعا والتوبة ، باب استحباب الدعاء عند صياح الديك ،رقم الحديث(٢٧٢٩)

جواب:

مرغ جب بڑا ہوتا ہے، تو بانگ دیتا ہے، یعنی نشوونما کی تکمیل پر پہنچ کر اس میں یہ فعل ہوتا ہے اور رات کو اس کی آواز سے متنبہ ہو کر آدمی نماز کیلئے تیار ہوتا ہے اور اس کی آواز سریلی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کو فرشتوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور گدھے کی آواز کو قرآن نے بھی قبیح قرار دیا ہے، بلکہ سب آوازوں سے اس کو برا کہا ہے:

﴿إن أنكر الأصوات لصوت الحمير﴾ [1]

''سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔''

اس لئے اس کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔

بعض محققین نے یہ ذکر کیا ہے کہ ہر نوع کے لئے عالم مثال میں ایک صورت ہے۔ اسی صورت کی طرف اس کے نوعی احکام منسوب ہیں۔ بہترین انواع کی تصاویر بہتر ہیں اور منکر ترین انواع کی تصاویر بری۔ بہترین مثالی صورت کو فرشتے اور بری صورت کو شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرغ کی آواز اور گدھے کی آواز اپنی اپنی مثالی صورت کے تابع ہیں۔ ہر حیوان چونکہ اپنی تصویر یا اپنی جنس کو دیکھ کر یا خیال کر کے آواز کرتا ہے، اس لئے اس کو فرشتے اور شیطان کے دیکھنے سے تعبیر کیا۔

اور عین ممکن ہے کہ جب مرغ میں بانگ کہنے کی تحریک ادنیٰ درجہ پر ہو، تو فرشتہ دیکھنے سے وہ تحریک اس درجہ پر پہنچ جائے کہ بانگ دیدے۔ اسی طرح گدھے میں آواز کی خواہش کو تیز کرنے میں شیطان کو بھی دخل ہو، جیسے انسانی تحریکات میں بھی

[1] لقمان:۱۹

بعض وقت شیطان کو اور بعض وقت فرشتے کو دخل ہوتا ہے۔ حالانکہ اصل تحریک انسان کے دماغ سے ہی اٹھتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿إذ يوحي ربك إلى الملئكة أني معكم فثبتوا الذين امنوا﴾ [1]

''تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، پس مومنوں کو ثابت قدم بناؤ۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿الشيطان يعدكم الفقر ويأمركم بالفحشاء﴾ [2]

''شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔''

آگے ایک مسئلہ لکھتے ہیں:

حدیث کا علم الآداب:

''عن أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان إذا سلم سلم ثلاثا وإذا تكلم بكلمة أعادها ثلاثا'' [3]

''انس کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی یہ عادت تھی کہ وہ تین مرتبہ سلام کہتے اور ہر بات کو تین بار دہراتے۔'' (بخاري)

جواب:

اس جگہ سلام سے مراد وہ سلام ہے، جو کسی مکان کے دروازے پر جا کر کہا جاتا

---

1. الأنفال:١٢
2. البقرة:٢٦٨
3. صحيح البخاري: كتاب العلم، باب من أعاد الحديث ثلاثا ليفهم عنه، الحديث(٩٤)

ہے ،یعنی کسی شخص کو مکان سے باہر بلانا ہو، تو سلام کہو، اگر جواب نہ ملے، تو پھر تین بار تک کہو۔ اس پر بھی جواب نہ آئے، تو واپس چلے جاؤ، جیسا کہ دوسری احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ ❶

اور تکرار اس کلمہ کا کرتے، جس کی تاکید مقصود ہوتی یا خطرہ ہوتا کہ ذہن سے کہیں اتر نہ جائے۔ اس سے مقصد شریعت کی حفاظت تھی۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر کلام تین تین بار کرتے۔ کیونکہ اس حدیث کے پیچھے یہ لفظ ہیں۔ "حتی تفهم عنه" ❷ تاکہ کلمہ ذہن نشین ہو جائے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کلام تین بار نہیں کہتے تھے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا

اس سے آگے حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک حدیث کی نقل کرتے ہیں:

"حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔" ❸

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کھاد کا ڈھیر تھا، وہاں پاس دیوار تھی اور حذیفہ کو اپنے

---

❶ دیکھیں: صحيح مسلم، كتاب الأداب، باب الاستئذان ، رقم الحديث(٢١٥٣)، سنن الترمذي: كتاب الإستئذان، باب ما جاء في الاستئذان ثلاثة، رقم الحديث (٢٦٩٠)، مسند أحمد :٣٩٣/٤، نیز دیکھیں: فتح الباري: ٢٥٠/١

❷ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب من أعاد الحديث ثلاثا ليفهم عنه، رقم الحديث(٩٥)

❸ صحيح البخاري: كتاب الوضوء، باب البول عند صاحبه والتستر بالحائط، رقم الحديث (٢٢٣)، صحيح مسلم: كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين، رقم الحديث (٢٧٣)

پاس پشت کی جانب پھرا کر کھڑا کر دیا کہ کوئی نہ دیکھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے گھٹنے میں درد تھا، جیسا کہ "سنن بیھقی" میں ہے۔ [1] آپ ﷺ وہاں بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ عذر کے وقت ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

آگے ایک اور حدیث لکھتے ہیں:

حدیث کا علم الزلزال:

((قال النبي صلی اللہ علیه وسلم اهتزّ عرش الرحمن لموت سعد بن معاذ)) [2]

"آنحضرت فرماتے ہیں کہ سعد بن معاذ کی موت پر خدائی تخت کانپنے لگ گیا تھا۔" سعد کی موت پر عرش کیسے ہل گیا؟

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے آسمان اور زمین روتے ہیں، اسی طرح عرش بھی ہل گیا۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

﴿فما بکت علیهم السماء والأرض﴾ [3]

"فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے پر آسمان و زمین نہ روئے۔"

---

[1] سنن البیهقي: ۱/۱۰۱، المستدرك ۱/۲۹۰، اس کی سند میں "یحیی بن عبد اللہ بن ماهان الکرابیسي" اور "حماد بن غسان" ضعیف ہیں۔ (لسان المیزان: ٦/٢٦٥، ٢/٣٥١) اسی بناء پر امام بیہقی اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے "ضعیف" قرار دیا ہے۔

[2] صحیح البخاري: کتاب فضائل الصحابة، باب مناقب سعد بن معاذ رضی اللہ عنه، رقم الحدیث (٣٥٩٢)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل سعد بن معاذ رضی اللہ عنه، رقم الحدیث (٢٤٦٦)

[3] الدخان: ٢٩

یہ تو ایک محاورہ ہے کہ فلاں کی موت پر دنیا ہل گئی، یعنی اس کی موت مسلمانوں کیلئے ایک بڑا صدمہ تھا، یا یہ مطلب ہے کہ عالم بالا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ فرشتوں نے استقبال کیا، قرآن مجید میں ہے:

﴿تکاد السمٰوٰت یتفطرن من فوقهن﴾ [1]

"آسمان قریب ہیں کہ اوپر سے پھٹ پڑیں۔"

اگر عرش کے ہلنے کو حقیقت پر محمول کیا جائے، تو اس میں کیا استحالہ ہے؟

"زلزال" کا تعلق زمین سے ہے نہ کہ عرش سے!

حدیث کا علم الألسنة:

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن سات زبانوں میں اتارا گیا ہے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ وہ باقی زبانیں کہاں گئیں؟ پھر ایک مضمون کو ایک ہی فقرے میں ادا کیا جائے، تو اسے یاد کرنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ حدیث کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے جبریل نے کہا کہ قرآن صرف ایک زبان میں پڑھا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چیز میری امت کی طاقت سے باہر ہے۔" [2]

جواب:

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن سات حروف پر اترا ہے۔ اس کا مطلب

---

[1] الشوریٰ: ٥

[2] صحیح البخاري: کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة، رقم الحدیث (٣٠٤٧)، صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرین، باب بیان أن القرآن علی سبعة أحرف، رقم الحدیث (٨١٩)، صحیح ابن حبان: ١٣/٣، (٧٣٨)

ہے کہ قرآن تو قریش کی زبان پر اترا ہے۔ مگر دوسرے قبائل بھی قرآن کے حروف کو اپنی لغت میں پڑھ سکتے ہیں۔ زیادہ مشہور لغات اس وقت سات تھیں۔ یہ شروع میں آسانی کیلئے تھا۔ جیسا کہ پنجابی زبان ایک ہے، مگر ملتان، شاہ پور اور لاہور کی زبانوں میں فرق ہے۔ مگر یہ فرق کلی نہیں، تھوڑا تھوڑا ہے۔ قرآن تو ایک ہی زبان میں نازل ہوا، مگر زبانوں میں پڑھنے کی رخصت جبریل علیہ السلام لے کر آئے۔

اگر مضمون کو ایک فقرہ میں ادا کیا جائے، تو وہی فقرہ دوسرے شہر کی زبان پر نہ چڑھتا اور اگر اس کو اپنے شہر کی زبان میں پڑھنے کی اجازت دی جائے، تو اس کو ایک گونہ آسانی ہوتی ہے۔

حدیث کا علم النباتات:

”جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں ایک درخت تھا، جس کے پاس کھڑے ہو کر حضور ﷺ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ پھر جس روز منبر تیار ہو گیا اور آپ منبر پر چڑھ کر وعظ کہنے لگے، تو اس درخت نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے نوحوں کی صدا اس اونٹنی کی طرح تھی، جس کا بچہ مر جائے۔ ہم یہ صدا سن رہے تھے۔ حضور منبر سے اترے، اس درخت پر ہاتھ پھیرا اور وہ چپ ہو گیا۔“[1]

اگر آپ کہیں کہ یہ معجزہ تھا، تو پھر رسول نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کیا تھا؟

﴿هل كنت إلا بشرا رسولا﴾[2]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المناقب باب علامات النبوة ، رقم الحديث(٣٣٩٢)، و لفظه "...... كصوت العشار" یعنی ان کے رونے کی آواز ایسی تھی، جیسے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی روتی ہے۔

[2] بني إسرائيل: ٩٣

''میں ایک انسان ہوں، جس کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا تھا، نہ کہ معجزہ دکھانا، اور مسلمانوں کے سامنے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے؟

جواب:

① اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ درخت کا رونا عادت نہیں۔ اگر درخت رویا تھا، تو مکہ کے درخت کیوں نہیں روئے؟

② مسلمانوں کو معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟۔

③ کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کیا؟

شبہ اول کا جواب یہ ہے کہ رونا خرق عادت تھا، جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿فألقیٰ عصاه فإذا هي ثعبان مبين﴾ [1]

''موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ڈالی، تو ظاہری طور پر اژدھا بن گیا۔''

علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق پر ممکن ہے سب درخت روئے ہوں، مگر لوگوں کو یہ رونا سنائی نہ دیتا ہو۔ جب اللہ نے چاہا تو سنا دیا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے، تو کوئی چیز روئے اور جب چاہے نہ روئے۔

﴿فما بكت عليهم السماء والأرض﴾ [2]

''ان پر آسمان و زمین نہ روئے'' یعنی دوسروں پر روتے ہیں۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ رونا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لئے دکھایا کہ ان کو طمانیت حاصل ہو، جیسا کہ نزول مائدہ کی وجہ بیان کی ہے:

---

[1] الأعراف: ۱۰۷

[2] الدخان: ۲۹

﴿نريد أن نأكل منها وتطمئن قلوبنا ونعلم أن قد صدقتنا ونكون عليها من الشاهدين﴾ ❶

"دستر خوان کے اترنے کی درخواست اس لئے کرتے ہیں کہ ہم اس سے کھائیں، ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم کو یقین ہو جائے کہ تو نے ہم سے سچ فرمایا اور ہم گواہ بن جائیں۔"

تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ معجزہ (قرآن مجید) کفار کو دکھایا گیا تھا۔ وہ محض ضد کی بناء پر خاص خاص معجزے طلب کرتے تھے۔ جس کے جواب میں یہ کہا گیا:

﴿سبحان ربي هل كنت إلا بشراً رسولا﴾ ❷

"میرا رب (اس عیب سے کہ معجزہ نہ دکھا سکے) پاک ہے (مگر) میں تو صرف بشر رسول ہوں (یعنی مجھے طاقت نہیں کہ کوئی مطالبہ بذات خود پورا کروں۔)"

حدیث کا علم الحقائق:

"ام شریک راوی ہے کہ حضور نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا، اس لئے کہ یہ آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینکا گیا تھا۔ (بخاری) ❸

---

❶ المائدة:١١٣

❷ بني إسرائيل:٩٣

❸ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ رقم الحديث(٣١٨٠)، صحيح مسلم: كتاب السلام، باب استحباب قتل الوزغ، رقم الحديث(٣١٣١)

بھلا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا؟ اور اس آگ کو جس میں ساٹھ ستر من خشک ایندھن جل رہا تھا، ایک ننھا سا کیڑا کیا بھڑکا سکتا تھا اور اس کے تنفس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ آگ کے شعلوں میں ذرہ بھر بھی اضافہ کر سکے؟

جواب:

1 اعتراض یہ کہ وہ کیوں پھونک مارتا تھا؟

2 اس کی پھونک سے کیا بن سکتا تھا؟

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ وہ کوئی ممیز جانور نہیں، جس نے ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ کر پھونک ماری۔ اصل میں حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ بعض جانور شیطان کا آلہ کار بن جاتے ہیں اور شیطانی الہام کے قبول کرنے کی استعداد ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ چھپکلی کا پھونک مارنا اسی بناء پر تھا۔ اور اس کو قتل کرنا، حقیقت میں شیطانی آلات کو بے کار کرنا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ شیطان جب مادے میں کوئی حرکت دینا چاہتا ہے، تو مادی تحریک کو تلاش کر کے اس کے ضمن میں اپنا کام کرتا ہے۔ اگر کسی نے دروازہ تھوڑا سا ہلایا، تو اس کو زیادہ کھول دیا۔ اسی طرح اگر کسی نے پھونک ماری، تو اس کے اثر کو بڑھا دیا، یہ پھونک اگرچہ بظاہر تھوڑی ہے، مگر شیطانی آمیزش سے اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"ایک اور حقیقت ملاحظہ ہو، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جبریل کو

دیکھا، تھا اس کے چھ سو پر تھے۔" (بخاري) ❶

صرف ابن مسعود میں کیا خوبی تھی کہ انھیں جبریل نظر آیا، کسی اور صحابی کو کیوں نہ دکھائی دیا؟ چھ سو پر آپ نے کیسے گن لیے تھے؟ اور جبرائیل کے لیے پروں کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

جواب:

اس میں تین شبہات ہیں:

1. عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ جبرائیل کسی اور کو کیوں نہ دکھائی دیے؟
2. پر کیسے گنے؟
3. پروں کی جبرائیل کو ضرورت ہی کیا تھی؟

❀ پہلا شبہ اس لیے بے اصل ہے کہ دیکھنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو راوی ہیں۔ (بخاري) ❷

❀ دوسرا شبہ اس پہلے شبہ پر متفرع ہے۔ جبرائیل کو اصل شکل میں دیکھنے کا ذکر

---

❶ صحيح البخاري: كتاب التفسير، باب قوله﴿ فأوحى إلى عبده ما أوحى﴾ رقم الحديث (٤٥٧٥)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب في ذكر سدرة المنتهى، رقم الحديث (١٧٤)، اس حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔ بعض روایات میں اس آیت ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى ۞ فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى ﴾ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے، امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت بایں الفاظ "حدثنا ابن مسعود أنه رأى جبريل له ستمائة جناح" لائے ہیں۔ جس سے برق صاحب کو غلط ہوئی ہے۔ کہ دیکھنے والے ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، حالانکہ وہ آیت کی تفسیر فرما رہے ہیں کہ دیکھنے والے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس کی تصریح دیگر روایات میں موجود ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري (٤٥٧٦) کیونکہ جبریل علیہ السلام کے قریب ہونے والے وہی ہیں، جن کی طرف وحی کی گئی تھی۔

❷ دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب التفسير، باب قوله﴿ فأوحى إلى عبده ما أوحى ﴾ رقم الحديث(٤٥٧٦)

قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ﴾ ❶

آپ ﷺ نے جبرائیل کو دو بار دیکھا۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ رَآهُ فِي الْأُفُقِ الْمُبِينِ﴾ ❷

"آپ ﷺ نے جبرائیل کو افقِ مشرقی میں دیکھا۔"

❁ تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ پَر، "أجنحة" کا ترجمہ ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿جاعل الملائكة رسلا أولي أجنحة مثنىٰ و ثلاث و ربٰع﴾ ❸

"اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو رسول بنایا، جن کے دو دو، تین تین، چار چار پَر ہیں۔"

﴿ يزيد في الخلق ما يشاء﴾ ❹

"پیدائش میں جس قدر چاہے اضافہ کرتا ہے۔"

اس کے بعد کہتے ہیں:

حدیث کا علم التاریخ:

"ابو ہریرۃ حضور ﷺ سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی (۸۰) برس کی عمر میں ہوا۔" ❺

---

❶ النجم:۱۳

❷ التكوير:۲۳

❸ الفاطر:۱

❹ الفاطر:۱

❺ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ ﴿ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ رقم الحديث(۳۱۷۸)، صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب من فضائل إبراهيم الخليل ﷺ، رقم الحديث(۲۳۷۰)

جواب:

اس پر اعتراض یہ ہے کہ

① پہلے کیوں نہ کیا؟

② ضعف پیری کے باوجود حجام کے آگے جا بیٹھے۔

③ ختنہ کا مقصد اسّی برس میں حاصل نہیں ہوسکتا۔

- شبہ اول کا جواب یہ ہے کہ پہلے حکم الٰہی نہیں ہوا، جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔
- شبہ دوم کا جواب یہ ہے کہ ختنہ آپ نے خود کیا، حجام سے نہیں کرایا۔
- اور شبہ سوم کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسّی سال کی عمر میں ازدواجی زندگی سے مستغنی نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے لڑکے حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے بعد ہی پیدا ہوئے۔ اور ان کے علاوہ اور لڑکے بھی پیدا ہوئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ:

اس کے بعد ایک اور حدیث لکھتے ہیں:

"ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں سے، جن کی تعداد ایک سو یا ننانوے تھی، مجامعت کروں گا۔ ہر بیوی سے شہسوار پیدا ہوگا، جو اللہ کی راہ میں جہاد کریگا۔ کسی نے کہا کہ "اِن شاء اللّٰہ" بھی کہیے، مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔ چنانچہ ایک کے بغیر کوئی حاملہ نہیں ہوئی۔ (بخاري) [1]

حضرت سلیمان عہد تاریخ کے انسان ہیں، عام انسانوں جیسا قد، اتنی ہی عمر اور طاقت۔ ہم یہ کیسے یقین کرلیں کہ وہ پوری ایک سو بیویوں کے ساتھ مجامعت کی

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب من طلب الولد للجهاد، رقم الحديث (٢٦٦٤)

طاقت رکھتے تھے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر ایک بیوی کے ساتھ مجامعت کیلئے کم ازکم پندرہ منٹ درکار ہوں، تو تمام کے پاس جانے کیلئے پچیس گھنٹے چاہئیں ،حالانکہ سردیوں کی لمبی سے لمبی رات چودہ گھنٹوں کی ہوتی ہے، بشرطیکہ اسے غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک شمار کیا جائے۔" (دواسلام :۳۳۹)

جواب:

اعتراض کی حقیقت یہ ہے:

1. سلیمان علیہ السلام عام انسانوں جیسے ہونے کے باوجود اتنی طاقت کے مالک کیسے ہوگئے؟
2. اگر ہر عورت کے لیے پندرہ منٹ درکار ہوں، تو ۲۴ گھنٹے چاہئیں، حالانکہ بڑی سے بڑی رات چودہ گھنٹوں کی ہوتی ہے۔ پس دس گھنٹوں کی کمی کیسے پوری ہوگی؟

پہلے اعتراض میں تو صرف استبعاد ہی استبعاد ہے۔ بعض حالات میں انسان میں طاقت زیادہ ہوسکتی ہے۔ خصوصاً پیغمبروں میں! باقی رہا دس گھنٹے کا تفاوت تو اگر پندرہ منٹ کی بجائے ۵ منٹ مقرر کر لئے جائیں، صرف آٹھ گھنٹے درکار ہیں۔

اختتامی کلمات

الحمدللہ! مصنف نے جتنے اعتراضات حدیث پر حملہ کرنے کی غرض سے تراشے تھے، ہم ان کے جوابات سے بری الذمہ ہوچکے ہیں۔ مصنف نے بعض جگہ موضوع احادیث سے کام لیا اور بعض جگہ مرفوع کو موقوف بنا کر اعتراض کیا۔ اور بعض جگہ تابعی کو جلیل القدر صحابی فرض کر لیا۔ بعض جگہ حدیث کی غلط ترجمانی کی اور بعض جگہ ضعیف حدیثوں سے استدلال کیا۔ ان کے مقابلہ میں صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا۔ بعض جگہ قرآن مجید میں اضافہ کیا اور غلط آیات لکھیں۔ بعض ایسے مسائل پر اعتراضات کئے، جو قرآن میں بھی موجود تھے۔ لب ولہجہ سوقیانہ اختیار کیا اور بے

سوچے سمجھے کچھ کا کچھ لکھ دیا۔ کبھی محدثین کی تنقید پر اعتراض اور کبھی راویوں پر بے جا حملے، کبھی اپنی عقل پر بے جا اعتماد، حقیقت سے دور، محض عبارت آرائی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سو اللہ کے فضل سے میں نے ان تمام باتوں کا بالاستیعاب جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ناظرین کیلئے ان کو فائدہ مند بنائے۔ (آمین)

خلاصۂ کلام

صفحات گزشتہ میں ہم نے جو وضاحت کی ہے، اس سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ

1. خلفائے راشدین حدیث کو قرآن کے بعد انتہائی سند قرار دیتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی احادیث نقل کر کے عمّال کو بھیجتے اور حدیث کی حفاظت میں انتہائی کوشش فرماتے رہے۔ احادیث کے جلانے یا مٹانے کی نسبت ان کی طرف غلط اور بے بنیاد ہے۔
2. آنحضرت ﷺ نے خود احادیث لکھوائیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے لکھیں اور تابعین رحمہم اللہ نے یہ سلسلہ جاری رکھا، تا آنکہ باقاعدہ حدیث کی تدوین ہونے لگی۔ آنحضرت ﷺ کی طرف مطلقاً کتابتِ حدیث کی ممانعت کو منسوب کرنا، حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جو حدیث لکھنے سے منع کیا ہے، اس سے صرف قرآن مجید کے ساتھ ساتھ لکھنا مراد ہے۔
3. حدیث کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ''اڑھائی سو برس تک اس کے لکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، بعد میں لکھی گئی''، فن حدیث اور تاریخ سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے ہے۔
4. محدثین نے حدیث کی تنقید میں جو روایت اور درایت کے اعتبار سے ممکن تھا، سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کا صحیح اور مکمل نقشہ لکھ کر

دنیا کو ممنونِ احسان کیا۔ جزا ھم اللہ

جو حدیث محدثین کے طریق پر صحیح ہوگی، اس میں مندرجہ ذیل امور نہیں ہونگے:

① تعلیم قرآن کے خلاف ہونا۔

② قرآنی تحریف کا ظاہر کرنا۔

③ رسول کریم ﷺ، ازواج مطہرات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین کرنا۔

④ حقائق کونیہ کے خلاف ہونا۔

⑤ انسانی فطرت کو جھٹلانا۔

⑥ عقل، تجربہ، اور مشاہدہ کے الٹ ہونا۔

⑦ مسلّمہ تاریخی واقعات کی تردید کرنا۔

⑧ اسلام کے اہم اصول مثلاً توحید و عبادت اور اہم مسائل مثلاً جہاد و ایثار وغیرہ کی منزلت کم کرنا۔

⑨ مسلمانوں کو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی ہر آن تلقین کرنا۔

⑩ کتاب و سنت کے خلاف کسی عمل کی فضیلت بتانا۔

⑪ وضو سے سارے گناہ معاف ہونا۔

⑫ ذکر کو دائماً اتنا راجح بتانا، جس سے جان و مال کی قربانی کی اہمیت بالکل نہ رہے۔

سو اللہ کا فضل ہے کہ مصنف نے اپنے زعم میں جن احادیث کو مندرجہ بالا امور کے تحت لانے کی کوشش کی ہے، ان سب کا جواب ہو چکا ہے۔

کج بحثی میں آ کر صحیح حدیثوں کا انکار کرنے والے نہ جانے مسلمانوں کو کس غار کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں۔ دہریہ بن جائیں یا یہودی عیسائی ہونے کو ترجیح دیں۔

فتنۂ اشتراکیت اور اسلام:

آج کل جو اشتراکیت کا فتنہ سیلاب بن کر دنیا کا رخ کیے ٹھاٹھیں مارتا آرہا ہے۔ اس سے بچاؤ کا ذریعہ صرف اسلام ہے۔ وہی اسلام جو حدیث کے ذریعہ قرآن مجید کی ترجمانی سے ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے یہ دشمنانِ اسلام پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے حدیث کا انکار کرکے یہ لوگ غلط فہمیاں پیدا کرنا اور اس بناء پر مسلمانوں کو دینِ اسلام سے برگشتہ کرنا چاہتے اور الحاد و دہریت کیلئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

آخری تنبیہ

لیکن سن لو اے منکرین حدیث! اگر تم نے اس دیوار (حدیث و سنت) کو گرانے کی کوشش کی، تو تم خود اور تمہارے دوسرے ہمنوا اس سیلاب کی نذر ہو جائیں گے اور پاکستان جو لاکھوں جانوں کی قربانی سے معرض وجود میں آیا ہے۔ یہ بھی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

تم قرآن کا نام لے کر حدیث کی تردید کرتے ہو اور حدیث کے مسائل کی تردید کرتے کرتے قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے ہو۔ کیونکہ قرآن کا بیان حدیث ہے۔ جب بیان نہ ہوگا، تو قرآن پر ہاتھ صاف کرنا، آسان ہو جاتا ہے۔ شاید تم لوگ یہ خیال کر رہے ہو کہ اسلامی نظام میں حدیث کے وجود کو بڑا دخل ہے، اس لئے اس کی اہمیت کم کرنے سے ہم نظامِ اسلام میں رکاوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات تمہارے دماغی عدمِ توازن کی پیدا کردہ ہے۔

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

فللّٰہ الحمد!

دوامِ حدیث خالص علمی انداز کی کتاب ہے، اصطلاحات عموماً وہی استعمال ہوئی ہیں، جو علمائے مدارس عربیہ میں متداول ہیں، بعض مباحث دقیق ضرور ہیں، لیکن ٹھوس اور تحقیقی ہیں، زبان کا چٹخارہ اور چاشنی شاید اس میں نہ ملے، کیونکہ اصل غرض نفسِ مسئلہ سے رکھی گئی ہے، یہ طرزِ تصنیف مروجہ طریقہ سے ہٹا ہوا ہے، مگر متلاشیانِ ہدایت و تحقیق کے لیے غالباً مفید ہوگا۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ اس کا مطالعہ اسی نظر سے کیا جائیگا. واضح رہے کہ "مقام حدیث" کا یہ جواب سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا تحقیقات نادرہ اور مباحث بدیعہ پر مشتمل ہے۔"

مولانا عطاء اللہ حنیف محدث بھوجیانی رحمہ اللہ

اس تصنیف لطیف میں حضرۃ العلام محدث گوندلویؒ نے ہمارے زمانے کے عجوبہ روزگار گروہ کی حقیقت کو بےنقاب کر کے رکھ دیا ہے، جو پوری امت کے متفق علیہ اور اجماعی موقف سے انحراف ہی نہیں بغاوت کر کے صرف یہی نہیں کہ سنت مطہرہ کو حجت نہیں سمجھتا، بلکہ خاکش بدہن اسے دین کے خلاف سازش قرار دیتا ہے اور اس کے باوصف اسے یہ اصرار بھی ہے کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتا ہے، واللہ یشهد إنهم لكذبون!

دوامِ حدیث صرف بیان حجیت حدیث ہی نہیں، بلکہ بیان عظمت حدیث اور بیان ضرورت حدیث بھی ہے۔ "دوام حدیث" حدیث کے وجوہ اعجاز کا بیان ہے، اس لیے کہ حدیث بیان ہے قرآن کا، جس کا امتیازی وصف ہے کہ وہ ایسا آفتاب ہے، جو خود ہی دلیل آفتاب ہے۔

غرضیکہ یہ سِفر جلیل علوم و معارف حدیث کا خزینہ ہے اور ایک صاحب نظر اسے دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

علامہ زماں کی اس عظیم الشان تالیف جس کی نظیر اس کے نظائر میں نہیں، مجھے یقین ہے کہ دین سے تعلق رکھنے والا جو شخص بھی حضرۃ العلام کی اس تصنیف لطیف کا مطالعہ کرے گا، میری اس دعا پر آمین ثم آمین کہے گا کہ اللہ تعالیٰ مؤلف علام کو سلف امت کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

حافظ عبدالحمید ازہر حفظہ اللہ

